جدید فقہی تحقیقات

طویل مدتی قرضے اور موجودہ کرنسی

[اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے انیسویں فقہی سمینار منعقدہ
مورخہ ۱۲-۱۵ر فروری ۲۰۱۰ء کو جامعہ مظہر سعادت ہانسوٹ میں
پیش کئے گئے علمی، فقہی اور تحقیقی مقالات و مناقشات کا مجموعہ]

ایفا پبلیکیشنز- نئی دہلی

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب : طویل مدتی قرضے اور موجودہ کرنسی
صفحات : ۴۰۳
سن طباعت : فروری ۲۰۱۱ء
قیمت : ۱۴۰/روپے

ناشر

ایفا پبلیکیشنز
۱۶۱-ایف بیسمنٹ، جوگابائی، پوسٹ باکس نمبر: ۹۷۰۸
جامعہ نگر، نئی دہلی - ۱۱۰۰۲۵
ای میل: ifapublications@gmail.com
فون: 011 - 26981327

مجلس ادارت

۱- مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی

۲- مولانا محمد برہان الدین سنبھلی

۳- مولانا بدر الحسن قاسمی

۴- مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

۵- مولانا عتیق احمد بستوی

۶- مولانا عبید اللہ اسعدی

بسم الله الرحمن الرحيم

فہرست

پیش لفظ	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی	۹
پہلا باب: تمہیدی امور		۱۱ - ۵۴
سوال نامہ		۱۳
اکیڈمی کا فیصلہ		۱۶
تلخیص مقالات	مولانا صفدر زبیر ندوی	۱۷
عرض مسئلہ	مفتی راشد حسین ندوی	۴۶
دوسرا باب: تعارفی تحریر		۵۵-۱۰۶
موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت	مولانا مبین سلیم ندوی ازہری	۵۷
تیسرا باب: تفصیلی مقالات		۱۰۷-۳۲۶
قرض، اجرت وغیرہ کو اشاریہ سے مربوط کرنا - ایک شرعی جائزہ	مفتی اقبال محمد ٹنکاروی	۱۰۹
کرنسی کو اشاریہ سے مربوط کرنا -وضاحت اور شرعی حکم	مفتی راشد حسین ندوی	۱۳۳
موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت	مولانا محی الدین بڑودوی	۱۵۵
دیون کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنے کی شرعی حیثیت	مولانا محمد شاہجہاں ندوی	۱۶۹
موجودہ کرنسی نوٹ کی شرعی حیثیت	مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی	۱۹۰
کرنسی کے مسائل	مولانا محمد حذیفہ محمود	۲۰۲

موجودہ کرنسی نوٹ کی شرعی حیثیت	مفتی محمد خالد حسین نیموی قاسمی	۲۱۳
مؤخر مطالبات کی ادائیگی بذریعہ کرنسی	مولانا خورشید احمد اعظمی	۲۲۱
موجودہ کرنسی سے متعلق دو سوالوں کے جواب	مولانا عبد القیوم پالنپوری	۲۳۰
موجودہ کرنسی اور اس کی شرعی حیثیت	مولانا رضوان الحسن مظاہری	۲۳۷
موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت	مولانا سلمان پالنپوری	۲۴۸
نوٹوں کی شرعی حیثیت	مولانا عبد التواب ناوی	۲۵۸
کرنسی کی شرعی حیثیت	مولانا نعیم اختر قاسمی	۲۶۸
نوٹوں کی حیثیت-شریعت کی نظر میں	مفتی عبد الرحیم قاسمی	۲۷۵
کرنسی نوٹوں کے ذریعہ ادھار معاملات	مولانا ڈاکٹر سید اسرار الحق سبیلی	۲۸۱
موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت	مولانا محمد نصر اللہ ندوی	۲۸۷
موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت	مولانا عطاء اللہ قاسمی	۲۹۴
موجودہ کرنسی کا شرعی حکم	مفتی محمد احتشام قاسمی	۳۰۱
موجودہ کرنسی اور اس کی شرعی حیثیت	مولانا محمد احسن عبد الحق ندوی	۳۰۶
موجودہ کرنسی کا حکم	مفتی سید باقر ارشد قاسمی	۳۱۱
موجودہ کرنسی اور شرعی نقطۂ نظر	مولوی ارشد شاداب ندوی	۳۱۷

چوتھا باب: مختصر تحریریں

۳۸-۳۲۷

موجودہ کرنسی پر دو سوال اور اس کا حکم	مولانا زبیر احمد قاسمی	۳۲۹
موجودہ کرنسی اور اس کی شرعی حیثیت	مفتی انور علی اعظمی	۳۳۱
موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت	مفتی محمد ثناء الہدی قاسمی	۳۳۵
موجودہ کرنسی اور شرعی نقطۂ نظر	مولانا محمد جعفر ملی رحمانی	۳۳۹
کرنسی کی شرعی حیثیت	ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی	۳۴۳

موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت	مولانا ابوسفیان مفتاحی	۳۴۶
موجودہ کرنسی کا مسئلہ	مولانا اشتیاق احمد اعظمی	۳۴۹
موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت اور اس پر قیمتوں کے اشاریہ کا اثر	مولانا امداد اللہ قاسمی سنوی	۳۵۳
موجودہ کرنسی سے متعلق سوالات کے جوابات	مفتی محفوظ الرحمن مفتاحی	۳۵۶
موجودہ کرنسی اور اس کی شرعی حیثیت	مولانا سلطان احمد اصلاحی	۳۵۸
مسائل کرنسی	مولانا محمد عثمان بستوی	۳۶۱
موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت	مفتی لطیف الرحمن ولایت علی	۳۶۵
موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت سے متعلق سوال کا جواب	مولانا عبداللطیف پالنپوری	۳۶۹
موجودہ کرنسی سے متعلق جوابات	مفتی شبیر علی گجراتی	۳۷۱
موجودہ کرنسی کا شرعی پہلو	مفتی اسماعیل بھڈکودروی	۳۷۲
کرنسی نوٹ	مولانا محمد صدر الحسن قاسمی	۳۷۴
موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت	مولانا نثار احمد کودھروی	۳۷۷
موجودہ کرنسی اور شرعی نقطہ نظر	مولانا ذکاء اللہ شبلی	۳۷۸
موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت	حافظ کلیم اللہ عمری مدنی	۳۷۹

پانچواں باب: اختتامی امور ۴۰۳-۳۸۱

مناقشہ	۳۸۳

پیش لفظ

معاشی نظام کے بقاواستحکام میں 'زر' یعنی کرنسی کو بڑا دخل ہے، ایک زمانہ میں کرنسی سونے اور چاندی کو بنایا جاتا تھا، جس کی خود ایک قیمت اور اہمیت تھی اور آدمی کے بس کی بات نہیں تھی کہ وہ جتنے سکے چاہے ڈھال لے، کیونکہ ان سکوں کی ڈھلائی کے لئے قیمتی دھات مطلوب ہوتی تھی اور اس کی مقدار پہلے بھی محدود تھی، اب بھی محدود ہے؛ لیکن جب کاغذی نوٹوں نے ان کی جگہ لے لی اور مختلف ممالک حدود وقیود سے آزاد ہوکر نوٹ چھاپنے لگے تو افراط زر پیدا ہوا اور ایسے نوٹ بازار میں آنے لگے جن کی پشت پر کوئی چیز نہیں تھی، اس کی وجہ سے نوٹوں کی قدر تیزی سے گھٹنے لگی، مثلاً آج اگر پانچ ہزار روپے میں گھر کا مکمل راشن آجاتا ہے تو دس مہینہ کے بعد اسی پانچ ہزار سے گھر کا آدھا راشن بھی نہیں خریدا جاسکتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ ان حالات میں روپے کو اصل ثمن مانا جائے، یعنی آج اگر کسی شخص نے دس ہزار روپے قرض لئے ہیں تو قیمت خرید میں فرق کے باوجود کیا چھ ماہ کے بعد وہ وہی دس ہزار روپے واپس کرے یا چونکہ موجودہ دس ہزار روپے سے حاصل ہونے والی چیزیں چھ ماہ کے بعد بیس ہزار روپے میں حاصل ہوسکتی ہیں، اس لئے اسے اس وقت بیس ہزار روپے ادا کرنے چاہئیں۔ اس سلسلہ میں دو پہلو ہیں جو اہل علم کے لئے قابل غور ہیں: اول یہ کہ اگر نوٹ کو اصل کرنسی مان لیا جائے اور آج کا قرض اگر دس سال کے بعد ادا ہو تب بھی اتنے ہی نوٹ واپس کئے جائیں تو اس میں قرض دہندہ کا بھاری نقصان ہے اور بظاہر یہ عدل کے خلاف ہے؛ جبکہ شریعت کے تمام احکام کی بنیاد عدل پر ہے، نیز اس کا ایک نقصان یہ ہے کہ لوگ ایک دوسرے کو قرض

دینے یا ادھار معاملہ کرنے سے گریز کرنے لگیں گے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر روپے کی قدر میں گراوٹ کی وجہ سے دی ہوئی رقم سے زیادہ وصول کی جائے تو اس سے سود کا راستہ کھل جانے کا اندیشہ ہے اور زکوۃ کی ادائیگی کے سلسلہ میں بھی بعض مسائل پیدا ہو جائیں گے۔

غور کیا جائے تو یہ دونوں ہی پہلو نہایت اہم ہیں؛ چنانچہ جب کرنسی سے متعلق مسئلہ پہلی بار اکیڈمی کے تیسرے فقہی سمینار میں پیش ہوا تو بعض امور پر اتفاق رائے ہو گیا؛ لیکن یہ بات طے نہیں پائی کہ مؤخر مطالبات میں نوٹ کی کیا حیثیت ہوگی؟ اسے بذات خود ثمن سمجھا جائے گا یا یہ وثیقۂ ثمن شمار ہوگا؟ چنانچہ انیسویں فقہی سمینار میں دوبارہ یہ مسئلہ زیر بحث آیا اور اس وقت بھی ابتداءً آرائے منقسم تھی؛ لیکن تمام پہلوؤں پر غور وفکر کے بعد کچھ نکات پر اتفاق ہو گیا؛ چنانچہ موضوع سے متعلق مقالات، تجاویز اور شرکاءِ سمینار کے مباحث کا مجموعہ اس وقت آپ کے سامنے ہے۔

اکیڈمی کے شعبۂ علمی کے رفیق مولانا صفدر زبیر ندوی نے اس کی ترتیب وتصحیح کی خدمت انجام دی ہے، جزاہ اللہ خیر الجزاء، دعا ہے کہ اللہ تعالی اس کاوش کو قبول فرمائے اور اکیڈمی کی علمی وفقہی خدمات کے سلسلہ کو جاری رکھے۔

خالد سیف اللہ رحمانی	۱۶/صفر ۱۴۳۲ھ
(جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا)	۲۱/جنوری ۲۰۱۱ء

پہلا باب

تمہیدی امور

سوالنامہ:

موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت

انسان کو اپنی بہت سی ضروریات دوسروں سے حاصل کرنی پڑتی ہے، مثلاً کسی کے پاس اجناس ہیں کپڑے نہیں ہیں، اور کسی کو کپڑے میسر ہیں؛ لیکن فرنیچر کی ضرورت ہے، ایسی صورت میں اشیاء کے حصول کا ایک طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ لوگ گیہوں کے تھیلے لے کر بازار میں جائیں اور اس کے بدلے چند گز کپڑے خرید کر لے آئیں؛ لیکن اس میں ایک دشواری تو یہ ہے کہ انسان کو اپنی معمولی ضروریات کے لئے بھی اچھا خاصا بوجھ اٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا پڑے گا، دوسرے کپڑے کے ایسے تاجر کو تلاش کرنا ہوگا، جس کو گیہوں کی ضرورت بھی ہو؛ چنانچہ قدیم زمانہ میں اشیاء کے تبادلہ کا یہی طریقہ مروج تھا؛ مگر اس کی دشواری کو دیکھتے ہوئے بتدریج مختلف مرحلوں میں سونے اور چاندی کے سکے مروج ہوئے، یہ حمل ونقل کے اعتبار سے بھی آسان تھے اور ان کے ذریعہ بازار سے کوئی بھی چیز حاصل کی جاسکتی تھی؛ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت بھی روم میں سونے کے سکے دینار کے نام سے اور ایران میں چاندی کے سکے درہم کے نام سے مروج تھے اور عرب میں یہ دونوں سکے چلا کرتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ نے ان ہی سکوں کو برقرار رکھا اور زکوۃ، دیت اور مختلف چیزوں کے لئے ان ہی کو معیار قرار دیا، اسی لئے ان کو فقہاء ’’ثمن خلقی‘‘ کہتے ہیں، سونے اور چاندی کی قیمتوں میں ایک حد تک استحکام تھا؛ اس لئے طویل عرصہ تک ان کو کرنسی کی حیثیت حاصل رہی، پھر آہستہ آہستہ ان کی جگہ کاغذی نوٹوں نے لے لی، ان نوٹوں کی قدر میں استحکام نہیں پایا جاتا اور کبھی کبھی اچھال اور زیادہ تر انحطاط پایا جاتا ہے، مثلاً: اگر آج سے دس سال پہلے دس ہزار روپے میں

دس تولہ سونا خرید کرنے کی صلاحیت تھی تو آج دس ہزار میں ایک تولہ بھی خرید نہیں کیا جاسکتا ہے، ایسی صورت میں مؤخر مطالبات کی ادائیگی کے وقت بعض اوقات روپے کی قدر میں بہت زیادہ فرق واقع ہوجاتا ہے، اگر بعینہ وہی مقدار ادا کی جائے تو صاحب حق کے ساتھ ناانصافی معلوم ہوتی ہے، اور اگر موجودہ قدر کے لحاظ سے زیادہ رقم دی جائے تو سود کا شبہ پیدا ہوتا ہے۔

اس مسئلہ کی بنیاد اس بات پر بھی ہے کہ ان کاغذی نوٹوں اور معدنی سکوں کی حیثیت بجائے خود ثمن کی ہے یا وہ وثیقۂ ثمن کا درجہ رکھتا ہے، اور اگر اس کی حیثیت وثیقۂ ثمن کی ہے تو اس کی حقیقی قدر متعین کرنے کے لئے پیمانہ کیا ہوگا؟ سونا چاندی معیاری ہوگا یا ماہرین معاشیات کی طرف سے مقرر کردہ اندازہ پر مبنی اشاریہ؟

اس پس منظر میں دوسرے فقہی سمینار منعقدہ ۸ تا ۱۱؍دسمبر ۱۹۸۹ء میں حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ نے کچھ سوالات اہل علم کی خدمت میں پیش کئے تھے: چنانچہ کرنسی سے متعلق بعض امور میں سمینار فیصلہ اور نتیجہ تک پہنچا لیکن دو سوالات وہ تھے جن کے بارے میں فیصلہ نہیں ہوسکا اور طے پایا کہ آئندہ ان پر بحث کی جائے، وہ سوالات حسب ذیل ہیں:

۱- کاغذی نوٹوں کی اپنی ذاتی کوئی قیمت نہیں ہوتی اور افراط زر کی صورت میں اس کی قوت خرید تیزی سے گر جاتی ہے، کیا اس صورت حال کی وجہ سے شرعاً یہ صحیح ہوگا کہ دیون یعنی مؤخر مطالبوں مثلاً قرض، مہر، پنشن، ادھار خریداری کی رقم اور وقت پر ادا نہ ہونے والی تنخواہوں کی ادائے گی کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کردیا جائے، اور کیا ایسے کسی اشاریہ کی ترتیب اور اس کے ذریعہ ادائیگیوں میں انضباط ممکن بھی ہے، اور کیا یہ کہنا صحیح ہے کہ عامۃ الناس کے درمیان ادائیگیوں کے لئے ایسے معیار مقرر کرنا جن کی بنیاد دقیق فنی اصولوں پر ہو، باہمی مستقل تنازعہ کا موجب ہوگا، نیز یہ کہ اس طرح سو روپے کے بدلے پانچ سو روپے کی ادائیگی باب ربا کو کھولنے کا ذریعہ بنے گی؟

۲- کیا یہ جائز ہوگا کہ نوٹوں کی شکل میں قرض دیتے وقت یا مہر کے تقرر کے وقت یا

ادھار فروختگی کے وقت طرفین واجب الادا نوٹ کی مالیت سونے یا چاندی میں طے کرلیں اور بوقت ادائیگی اسی قدر سونے یا چاندی کی قیمت کے مساوی نوٹوں کی ادائیگی عمل میں آئے؟

آپ سے درخواست ہے کہ اس سلسلہ میں اپنے تحقیقی جوابات سے سرفراز فرمائیں۔

☆☆☆

اکیڈمی کا فیصلہ:

موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت

۱- مؤخر مطالبات اور بقایا جات کو قیمتوں کے اشاریہ یا سونے چاندی کی قیمت سے مربوط کرنا درست نہیں ہے، اس لئے کہ اشاریہ دقیق فنی اصولوں اور ظن وتخمین پر مبنی ہونے کی وجہ سے ناقابل عمل بھی ہے اور سخت نزاع کا باعث ہوسکتا ہے، نیز دونوں صورتوں میں ربا کا دروازہ بھی کھل سکتا ہے۔

۲- بہتر ہے کہ مہر مؤجل سونے یا چاندی میں مقرر کیا جائے جیسا کہ اس سے پہلے بھی اکیڈمی فیصلہ کرچکی ہے، ایسی صورت میں بوقت ادائیگی مقررہ مقدار میں سونا یا چاندی ادا کرنا ہوگا، اور اگر اس وقت دونوں فریق اتنی مقدار سونا یا چاندی کی قیمت کے پیسوں کی ادائیگی پر اتفاق کرلیں تو یہ بھی جائز ہے، یہی حکم اس وقت بھی ہوگا جبکہ کسی شئ کی اجرت یا قیمت سونے یا چاندی میں طے کی جائے۔

☆☆☆

تلخیص مقالات:

موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت

مولانا صفدر زبیر ندوی ☆

اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے ۱۹ویں فقہی سمینار کے موضوعات میں سے ایک موضوع ''موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت'' رکھا گیا ہے، یہ موضوع اکیڈمی کے دوسرے فقہی سمینار منعقدہ ۸-۱۱ر دسمبر ۱۹۸۹ء میں رکھا گیا تھا، موضوع کے بعض امور میں سمینار نے فیصلے کیے، لیکن دو سوالات وہ تھے جن کے بارے میں فیصلہ نہیں ہوسکا تھا اور طے پایا کہ آئندہ سمینار میں ان دونوں سوالوں پر بحث کی جائے گی، چنانچہ اکیڈمی نے موجودہ سمینار منعقدہ ۱۲-۱۵ر فروری ۲۰۱۰ء بمقام ہانسوٹ گجرات میں ان کو موضوع بحث بنایا ہے، اس تعلق سے تقریباً ۳۵ مقالات اکیڈمی کو موصول ہوئے جن کا خلاصہ پیش کیا جارہا ہے:

قیمتوں کے اشاریہ کا مفہوم:

کئی مقالہ نگار حضرات نے اپنے مقالے میں کرنسی کی قیمتوں کے اشاریے کی تفصیلی وضاحت مفتی تقی عثمانی صاحب کی کتابوں ''اسلام اور جدید معیشت''، ''فقہی مقالات''، ''تقریر ترمذی'' اور ''تکملہ فتح الملہم'' کے حوالہ سے کی ہے، لکھتے ہیں کہ:

''موجودہ علم معاشیات کے الفاظ میں اس کی تشریح اس طرح کی جاسکتی ہے کہ آج کے دور میں کرنسی کی اندرونی قیمت کا مدار ملک میں افراط زر اور تفریط زر پر ہوتا ہے، اگر ملک میں افراط زر

☆ رفیق شعبہ علمی اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا۔

ہوجائے تو کرنسی کی قیمت کم ہوجاتی ہے اور جب تفریط زر ہوجائے تو کرنسی کی قیمت بڑھ جاتی ہے''۔

آگے اس کو سمجھاتے ہوئے فرماتے ہیں:

''تفریط زر کے وقت ہم کرنسی کے ذریعہ اشیاء صرف کی بڑی مقدار خرید سکتے ہیں، مثلاً اس وقت ہم سو روپے میں مندرجہ ذیل اشیاء خرید سکتے ہیں:

گندم ۲۰ کلو نمک ۲۰ کلو کپڑے ۱۰ میٹر

آگے فرماتے ہیں: افراط زر کے وقت وہی اشیاء مندرجہ ذیل مقدار میں خرید سکیں گے:

گندم ۱۰ کلو نمک ۱۰ کلو کپڑے ۵ میٹر

اب سوال یہ ہے کہ اگر ایک شخص نے تفریط زر کے وقت کسی سے سو روپے ادھار لئے یا ایک ہزار مہر مقرر کی، یا اسی کے مثل کوئی مؤثر مطالبہ اپنے ذمہ لیا، اور ان چیزوں کی ادائیگی وہ افراط زر کے وقت کر رہا ہے، تو ادائیگی کے وقت جتنا اس نے لیا تھا یا جتنا اس پر لازم تھا اتنی ہی رقم کا ادا کرنا اور اس میں کمی بیشی نہ کرنا اس پر لازم ہے، ورنہ سود لازم آئے گا، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اگر وہ صرف سو روپے واپس کر رہا ہے تو کیا جتنا اس پر لازم ہوا تھا اتنا اس نے ادا کیا؟ صاف ظاہر ہے کہ لزوم تفریط کے وقت ہوا، واپسی افراط کے وقت ہو رہی ہے، لہذا جتنی اشیاء سو روپے سے لیتے وقت مل سکتی تھی اب نہیں مل سکتی، تو کیا صرف سو روپے کی واپسی مقرض پر ظلم نہیں ہے؟ اور چونکہ افراط زر ہی زیادہ تر ہوا کرتا ہے اس لئے مقرض ہمیشہ گھاٹے میں رہتا ہے، تو یہ تو عجیب بات ہے کہ وہ کسی کی امداد بھی کرے اور اس کو مزید گھاٹے میں بھی مبتلا کر دیا جائے''۔

اس فکر کے تحت بعض ماہرین معاشیات نے یہ حل نکالا کہ کیوں نہ اس طرح کی ادائیگیوں کو قیمتوں کے اشاریہ (Price Index) سے مربوط کر دیا جائے، اس سے مقرض اس نقصان سے محفوظ رہے گا، برازیل، آسٹریلیا اور اسرائیل جیسے چند ممالک نے اس نظام کو پسند کیا اور اپنا بھی لیا، ہمیں اس شکل کا شرعی حکم دریافت کرنا ہے، لہذا پہلے ہم کو اس پرائس انڈکس کا مطلب سمجھنے کی ضرورت ہے، اس لئے کہ یہ ایک خالص اقتصادی اصطلاح ہے، مولانا تقی عثمانی صاحب اس

کو سمجھاتے ہوئے فرماتے ہیں:

''زیر بحث مسئلہ کا شرعی حکم جاننے کے لئے قیمتوں کا اشاریہ وضع کرنے کا طریقہ اور کرنسی کی قیمت میں اس کے استعمال کو جاننا ضروری ہے، لہذا قرضوں کا قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ تعلق کے سلسلہ میں ماہرین معاشیات جو طریقہ اختیار کرتے ہیں اس کا خلاصہ ہم آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں:

جاننا چاہئے کہ کرنسی چاہے دھات کی ہو یا کاغذی کرنسی ہو وہ بذات خود مقصود نہیں ہوتی، اس لئے کہ وہ کرنسی بذات خود نہ تو بھوک مٹا سکتی ہے اور نہ اس سے جسم کو ڈھانپا جاسکتا ہے، اور نہ اس کے ذریعہ خواہش پوری کی جاسکتی ہے اور نہ اس کے ذریعہ تکلیف دور کی جاسکتی ہے، بلکہ اس کرنسی کے ذریعہ انسان اپنی ضروریات زندگی کی اشیاء وخدمات خریدتا ہے، اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہر کرنسی کی دو قیمتیں ہوتی ہیں، ایک اس کی ظاہری قیمت (Face Value) یہ وہ قیمت ہے جو اس کرنسی پر لکھی ہوتی ہے، دوسری اس کی واقعی قیمت (Real Value) یعنی اس کرنسی کا حقیقی عملی فائدہ جو ایک انسان اپنی ضروریات میں اس کرنسی کو خرچ کر کے حاصل کرتا ہے، اس کو دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ اس کرنسی کی حقیقی قیمت اشیاء اور خدمات کا وہ مجموعہ ہے جو ایک انسان کے لئے اس کرنسی کے ذریعہ خریدنا ممکن ہو، آج کل اقتصادیین اشیاء کے اس مجموعہ کا نام ''اشیاء کی ٹوکری'' (Basket of Goods) رکھتے ہیں، لہذا کرنسی کی حقیقی قیمت وہ اشیاء کی ٹوکری ہے جس کو کرنسی کے ذریعہ خریدنا ممکن ہو''۔

پھر آگے موصوف نے تفصیل سے سمجھایا ہے کہ یہ قوت خرید یکساں نہیں رہتی، اس میں تغیر ہوتا رہتا ہے، اگر ۲۰۰۹ء میں پانچ ہزار روپے میں اشیاء کا ایک خاص مجموعہ ملا ہے تو ۲۰۱۲ء میں ہوسکتا ہے کہ مجموعہ ۱۰ ہزار میں ملے، مولانا فرماتے ہیں:

''اگر ہم فرض کریں کہ ۱۹۸۰ء میں ایک شخص کی ماہانہ تنخواہ پانچ ہزار روپے تھی، اور ۱۹۸۷ میں اس کی تنخواہ زیادہ ہوکر دس ہزار روپے ہوگئے تو اس کی ماہانہ تنخواہ کی قیمت اور حیثیت کا

حساب مندرجہ ذیل طریقہ سے کیا جائے گا:

سال	تنخواہ کی ظاہری قیمت	نرخنامہ میں زیادتی کا تناسب	حقیقی قیمت
۱۹۸۰ء	۵۰۰۰/ہزار روپے	۱ء۰	۵۰۰۰/ہزار روپے
۱۹۸۷ء	۱۰۰۰۰/ہزار روپے	۲ء۵	۴۰۰۰/ہزار روپے

مندرجہ بالا مثال میں آپ دیکھیں گے کہ اگرچہ اس شخص کی تنخواہ کی ظاہری قیمت دس ہزار روپے ہوگئی، لیکن اس کی تنخواہ کی حقیقی قیمت ۱۹۸۰ء کی قیمتوں کی سطحوں پر نظر رکھتے ہوئے چار ہزار روپے ہوگئی، اس لئے کہ کرنسی کی حقیقی قیمت کو دیکھتے ہوئے ۱۹۸۷ء کے دس ہزار روپے ۱۹۸۰ء کے چار ہزار روپے کے مساوی ہوگئے۔

اسی طرح اگر کسی نے ۱۹۸۰ء میں چار ہزار روپے قرض لئے تھے تو اگر ہم قرضوں کی ادائیگی کو قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ وابستہ کردیں تو ۱۹۸۷ء میں اسے دس ہزار واپس کرنے ہوں گے، اس لئے کہ اس کی حقیقی قیمت معتبر ماننے کا مطلب یہی ہوگا'' (مقالہ: مولانا راشد حسین ندوی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مولانا عبدالقیوم پالنپوری وغیرہ)۔

بعض حضرات نے افراط زر اور تفریط زر کے عنوان سے بھی بحث کی ہے، لکھتے ہیں:

افراط زر کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے پاس رقم زیادہ آجائے لیکن رسد میں کوئی اضافہ نہ ہو، چنانچہ دوکاندار جب دیکھتا ہے کہ رقم زیادہ آگئی ہے اور اشیاء کی طلب میں اضافہ ہوگیا ہے لیکن رسد میں اضافہ نہیں ہوا ہے تو وہ اشیاء کی قیمت میں اضافہ کردیتا ہے جس سے روپے کی قوت خرید میں کمی آجاتی ہے اور مہنگائی بڑھ جاتی ہے۔

اور تفریط زر کا مطلب یہ ہے کہ کسی ملک میں جاری شدہ کرنسی اشیاء اور خدمات کے مقابلہ میں کم ہوجائے، جس کے نتیجہ میں اشیاء اور خدمات کی قیمت کم ہوکر ارزانی پیدا ہوجائے، اس لئے کہ جب اشیاء طلب سے زیادہ ہوجاتی ہیں تو بھاؤ گر جاتا ہے اور قیمت کم ہوجاتی

ہے (کرنسی کی قوت خرید: مولانا محمد تقی عثمانی، ص ۵۰) (مقالہ: مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا نعیم اختر قاسمی، مفتی انور علی اعظمی، مولانا محمد نصر اللہ ندوی وغیرہ)۔

مولانا عطاء اللہ قاسمی کہتے ہیں کہ کرنسی نوٹوں کی قدروں اور قیمتوں کی کمی بیشی کو منضبط کرنے کے لئے ریاضی کا پیچیدہ اور بظاہر سائنٹفک طریقہ نکالا گیا جسے اشاریہ کہا جاتا ہے، اشاریہ کے تین بنیادی عناصر ترکیبی ہیں:

۱- اشیاء ضروریہ کی تعیین اور ان کی فہرست سازی۔

۲- اشیاء کی اہمیت کا تعین۔

۳- اشیاء کی قیمتوں کا تعین۔

مفتی اقبال محمد ٹنکاروی اس کو ان الفاظ میں واضح کرتے ہیں: قیمتوں کے اشاریہ (Index) میں اشیاء کی قیمتوں میں جس تناسب اور حساب سے اضافہ ہوا ہے اسی تناسب سے قرض دار قرض خواہ کو قرض واپس کرے گا، لئے ہوئے قرض کے برابر روپیہ واپس نہیں کرے گا، مثلاً اگر کسی شخص نے ۱۰۰/روپے قرض لئے ہیں اور قیمتوں کے اشاریے میں دس فیصد کے تناسب سے بڑھوتری ہوئی ہے تو واپسی کے وقت دس فیصد قرض میں اضافہ کر کے ۱۱۰/روپے واپس کرے گا۔

کرنسی نوٹوں کی حیثیت:

بعض حضرات نے کاغذی نوٹوں/کرنسی کی ثمنیت یعنی ثمن خلقی اور ثمن عرفی ہونے پر بھی بحث کی ہے، مثلاً:

افادیت کے اعتبار سے کرنسی نوٹ کی وہی حیثیت ہے جو ثمن خلقی یا ثمن حقیقی کی ہے (مقالہ: قاری ظفر الاسلام صدیقی، مولانا محفوظ الرحمٰن مفتاحی، مفتی عبد الرحیم قاسمی، مولانا محمد صدر الحسن وغیرہ)۔

مولانا محبوب فروغ قاسمی لکھتے ہیں کہ ایک خیال یہ ہے کہ بعض فروق کے ساتھ موجودہ کرنسی نوٹ نقد (یعنی ثمن خلقی) کے حکم میں ہے، یہ بات زیادہ قرین قیاس اور ہم آہنگ روح

شریعت معلوم ہوتی ہے، اس لئے کہ نقد (یعنی ثمن خلقی) جن اسباب وخواص کی وجہ کر نقد بنتا ہے وہ تمام اسباب وخاصیات کا حامل فی زماننا موجودہ سکے ہی ہیں۔

بعض حضرات کے نزدیک اس کی حیثیت ثمن عرفی یا ثمن اصطلاحی کی ہے (مقالہ: مولانا عبد القیوم پالنپوری، مفتی محمد خالد حسین نیموی، مفتی شیر علی، مولانا امداد اللہ قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا عبد اللطیف پالنپوری، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مفتی سید باقر ارشد قاسمی، مفتی ارشد شاداب ندوی، مولانا محمد شاجہاں ندوی)۔

مولانا محمد احسن عبد الحق ندوی کہتے ہیں کہ نوٹ ثمن عرفی ہے اور یہ ثمن خلقی کے قائم مقام ہے۔

مولانا رضوان الحسن مظاہری کا کہنا ہے کہ نقد اور معجّل معاملات میں کرنسی نوٹ کو ثمن عرفی تسلیم کیا جائے، اور ادھار ومؤجل معاملات میں وثیقہ وسند سمجھا جائے، اور معاملہ کرتے وقت کرنسی نوٹ کا اشاریہ سونے چاندی سے کرلیا جائے۔

دیون (مؤخر مطالبوں/بقایاجات) کی وصولی کے لئے کرنسی کو قیمتوں کے اشاریے سے مربوط کرنا:

سوال نمبر ۱: کاغذی نوٹوں کی اپنی ذاتی کوئی قیمت نہیں ہوتی اور افراط زر کی صورت میں اس کی قوت خرید تیزی سے گر جاتی ہے، کیا اس صورت حال کی وجہ سے شرعاً یہ صحیح ہوگا کہ دیون یعنی مؤخر مطالبوں مثلاً قرض، مہر، پنشن، ادھار خریداری کی رقم اور وقت پر ادا نہ ہونے والی تنخواہوں کی ادائیگی کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کردیا جائے، اور کیا ایسے کسی اشاریہ کی ترتیب اور اس کے ذریعہ ادائیگیوں میں انضباط ممکن بھی ہے، اور کیا یہ کہنا صحیح ہے کہ عامۃ الناس کے درمیان ادائیگیوں کے لئے ایسے معیار مقرر کرنا جن کی بنیاد دقیق فنی اصولوں پر ہو، باہمی مستقل تنازعہ کا موجب ہوگا، نیز یہ کہ اس طرح سو روپے کے بدلے پانچ سو روپے کی ادائیگی باب ربا کو کھولنے کا ذریعہ بنے گی؟

اس سوال کے جواب میں اکثر مقالہ نگار حضرات نے مؤخر مطالبوں کی ادائیگی کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنے کو ناجائز کہا ہے بلکہ اسے عین ربا یا ربا کے مشابہ قرار دیا ہے(مقالہ: مولانا راشد حسین ندوی، مولانا کلیم اللہ عمری، مفتی محمد خالد حسین نیموی، مفتی ثناء الہدی قاسمی، مولانا نعیم اختر قاسمی، مفتی اقبال محمد ٹنکاروی، مولانا عبد التواب اناوی، مولانا امداد اللہ قاسمی، مولانا محمد صدر الحسن، مولانا محفوظ الرحمن مفتاحی، مولانا عبد اللطیف پالنپوری، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مفتی سید باقر ارشد قاسمی، مولانا محمد احسن عبد الحق ندوی، مفتی انور علی اعظمی، مولانا محمد نصر اللہ ندوی، مفتی لطیف الرحمن، مفتی انور شاداب ندوی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا محبوب فروغ قاسمی، مولانا سلمان پالنپوری، مولانا محمد جعفر ملی، مولانا عبد القیوم پالنپوری، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا محمد حذیفہ محمود، مولانا محمد شاہجہاں ندوی وغیرہ)۔

ان حضرات کے دلائل ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:

قرآن سے:

۱-''أحل الله البيع وحرم الربا'' (سورۂ بقرہ ۲۷۵)(مقالہ: مولانا محمد خالد حسین نیموی، مولانا محمد جعفر ملی)۔

۲-''وإن تبتم فلكم رؤوس أموالكم لا تظلمون ولا تظلمون'' (سورۂ بقرہ ۲۷۹)(مقالہ: مولانا سید اسرار الحق سبیلی)۔

۳-''يايها الذين آمنوا أوفوا بالعقود'' (سورۂ مائدہ ۱)(مقالہ: مولانا سید اسرار الحق سبیلی)۔

حدیث سے:

۱-''لا تبيعوا الدينار بالدينارين، ولا الدرهم بالدرهمين'' (مسلم: کتاب المساقاۃ باب الربا، رقم: ۴۰۵۷)(مقالہ: مولانا راشد حسین ندوی)۔

۲-''عن أبي هريرة ؓ قال: قال رسول الله ﷺ: الذهب بالذهب وزنا

بوزن، مثلا بمثل والفضة بالفضة وزنا بوزن مثلا بمثل، فمن زاد أو استزاد فهو ربا" (مسلم: کتاب المساقاۃ، باب الصرف، رقم: ۲۰۶۹)(مقالہ: مولانا راشد حسین ندوی، مولانا محمد نصر اللہ ندوی)۔

۳-"عن ابن عمرؓ قلت: يا رسول الله! كنت أبيع الإبل بالبقيع فأبيع بالدنانير وآخذ الدراهم وأبيع بالدراهم وآخذ الدنانير، وآخذ هذه من هذه، وأعطى هذه من هذه، فقال رسول الله ﷺ: لا بأس أن تأخذها بسعر يومها مالم تفترقا وبينكما شئ" (ابوداؤد: کتاب البیوع، باب فی اقتضاء الذہب من الورق، رقم: ۳۳۵۴، مسند احمد، رقم: ۶۲۳۹، الحاکم، رقم: ۲۲۸۵)(مقالہ: مولانا راشد حسین ندوی، مفتی اقبال محمد ٹنکاروی، مولانا عبدالتواب اناوی، مولانا امداد اللہ قاسمی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مولانا خورشید احمد اعظمی)۔

بذل المجہود میں مذکورہ حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے صاحب کتاب لکھتے ہیں:

"فذهب أكثر أهل العلم إلى جوازه ومنع من ذلك أبوسلمة بن عبدالرحمن وأبوشبرمة وكان ابن أبي ليلى يكره ذلك إلا بسعر يومه، ولا يعتبر غيره السعر ولم يبالوا كان ذلك بأغلى أو أرخص من سعر اليوم" (بذل المجہود ۲۴۶/۵)(مقالہ: مولانا عبدالتواب اناوی)۔

۴-"عن أبي سعيد الخدري وأبي هريرة رضي الله عنهما أن رسول الله ﷺ استعمل رجلا على خيبر فجاءه بتمر جنيب فقال رسول الله ﷺ: أكل تمر خيبر هكذا؟ قال: لا والله يا رسول الله! إنا لنأخذ الصاع من هذا بالصاعين، والصاعين بالثلاثة، فقال رسول الله ﷺ: لا تفعل، بع الجميع بالدراهم ثم ابتع بالدراهم جنيباً" (بخاری: کتاب البیوع، باب اذا اراد بیع تمر بتمر خیر منہ، رقم: ۲۲۰۱، مسلم: کتاب المساقاۃ، باب بیع الطعام مثلا بمثل، رقم: ۱۵۹۳)(مقالہ: مولانا راشد حسین ندوی، مولانا نعیم اختر قاسمی، مفتی اقبال محمد ٹنکاروی، مولانا محمد نصر اللہ ندوی، مولانا محمد حذیفہ محمود)۔

۵-"عن أبی سعید الخدری قال: کنا نرزق تمر الجمع علی عهد رسول الله ﷺ وهو الخلط من التمر فکنا نبیع صاعین بصاع فبلغ ذلک رسول الله ﷺ فقال: لا صاعین تمرا بصاع ولا صاعین حنطة بصاع ولا درهما بدرهمین" (مسلم ۲/۲۷، رقم: ۴۰۶۱) (مقالہ: مفتی اقبال محمد ٹنکاروی، مفتی انور علی اعظمی، مفتی لطیف الرحمن، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا محمد حذیفہ محمود)۔

۶-"عن عبادة بن الصامت قال قال رسول الله ﷺ: الذهب بالذهب، والفضة بالفضة، والبر بالبر، والشعیر بالشعیر، والتمر بالتمر، والملح بالملح مثلا بمثل، سواء بسواء، یدا بید، فإذا اختلفت هذه الأوصاف فبیعوا کیف شئتم إذا کان یداً بید" (مسلم ۲/۲۵، رقم: ۴۰۳۹) (مقالہ: مولانا محمد نصر اللہ ندوی، مولانا محمد حذیفہ محمود)۔

فقہ سے:

۱-علامہ مرغینانی فرماتے ہیں: "ومشائخنا لم یفتوا بجواز ذلک فی العدالی والغطارفة لأنها أعز الأموال فی دیارنا فلو أبیح التفاضل فیه ینفتح باب الربوا" (ہدایہ ۳/۹۳)۔ اس کی تشریح میں علامہ ابن ہمام لکھتے ہیں: "فإن الناس یعتادون التفاضل فی الأموال النفیسة فیندرجون إلی ذلک فی النقود الخالصة، فمنع ذلک حسماً لمادة الفساد" (فتح القدیر ۷/۲۵۷) (مقالہ: مفتی خالد حسین نیموی، مولانا محمد احسن عبد الحق ندوی، مفتی عبد الرحیم قاسمی)۔

۲-"والذی یغلب علی الظن ویمیل إلیه القلب ان الدراهم المغلوبة الغش أو الخالصة إذا غلت أو رخصت لا یفسد البیع قطعا ولا یجب إلا ما وقع علیه العقد من النوع المذکور فیه، فإنها أثمان عرفا وخلقة ولا یجری فی ذلک خلاف أبی یوسف" (تنبیہ الرقود فی احکام النقود- رسائل ابن عابدین ۲/۶۳) (مقالہ: مولانا راشد حسین ندوی)۔

۳-علامہ ابن قدامہ فرماتے ہیں: "يجب رد المثل في المكيل والموزون، لا نعلم فيه خلافاً" (المغنی ۴؍۳۵۷) (مقالہ: مولانا راشد حسین ندوی)۔

مقالہ نگاران کا تقریباً اس پر اتفاق ہے کہ قیمتوں کے اشاریہ سے قرض کو اس لئے وابستہ نہیں کرسکتے کہ قرض کی ادائیگی میں تماثل ضروری ہے، یعنی جو چیز جس نوعیت کی جتنی مقدار میں قرض لی گئی ہے، اتنی ہی مقدار میں اس کا مثل ادا کرنا ضروری ہے، اور مثلی چیزوں میں کمی بیشی سود شمار ہوگا، درج ذیل عبارتیں دلیل کے طور پر پیش کی گئی ہیں:

۱-علامہ نووی لکھتے ہیں: "إذا أقرض شيئا له مثل كالحبوب والأدهان والدراهم والدنانير وجب على المقترض رد مثلها لأنه أقرب إليه" (شرح المہذب ۱۳؍۲۱۵) (مقالہ: مولانا ثناء الہدیٰ قاسمی، مفتی ارشد شاداب ندوی)۔

۲-ابن قدامہ لکھتے ہیں: "إن المستقرض يرد المال في المثليات سواء رخص سعره أو غلا أو كان بحاله ولو كان ما أقرضه موجودا بعينه فرده من غير عيب يحدث فيه لزم قبوله سواء تغير سعره أو لم يتغير" (المغنی ۴؍۳۶۵) (مقالہ: مولانا ثناء الہدیٰ قاسمی، مفتی ارشد شاداب ندوی)۔

۳-"وإن استقرض دانق فلوس أو نصف درهم فلوس ثم رخصت أو غلت لم يكن عليه إلا مثل عدد الذي أخذه.....ولا ينظر إلى غلاء الدراهم ولا إلى رخصها" (ردالمحتار ۷؍۳۹۰) (مقالہ: مولانا ثناء الہدیٰ قاسمی، مفتی ارشد شاداب ندوی، مولانا خورشید احمد اعظمی)۔

۴-علامہ مرغینانی لکھتے ہیں: "ولواستقرض فلوسا نافقة فكسدت عند أبي حنيفة يجب مثلها، لأنه إعارة وموجبه رد العين، ومعنى الثمنية فضل فيه، إذ القرض لا يختص به" (ہدایہ ۳؍۱۱۰) (مقالہ: مولانا سید اسرار الحق سبیلی، مولانا کلیم اللہ عمری، مولانا محمد شاہجہاں ندوی)۔

۵-علامہ کاسانی فرماتے ہیں:"ولو استقرض فلوسا نافقة وقبضها فكسدت فعليه رد مثل ما قبض من الفلوس عددا في قول أبي حنيفة وأبي يوسف وفي قول محمد قيمتها"، پھر آگے لکھتے ہیں:"ولو لم تكسد ولكنها رخصت أو غلت فعليه رد مثل ما قبض بلاخلاف، لما ذكرنا أن صفة الثمنية باقية" (بدائع الصنائع ۳/۲۹۶) (مقالہ: مولانا سید اسرار الحق سبیلی، مولانا محمد شاہجہاں ندوی)۔

۶-علامہ حصکفی لکھتے ہیں:"استقرض من الفلوس الرائجة والعدالي فكسدت، فعليه مثلها كاسدة، ولا يغرم قيمتها......لما مر أنه مضمون بمثله فلا عبرة بغلائه ورخصه"، علامہ شامی اس پر ان الفاظ میں اضافہ کرتے ہیں:"وكذلك لو قال: أقرضني عشرة دراهم غلة بدينار، فأعطاه عشرة دراهم، فعليه مثلها، ولا ينظر إلى غلاء الدراهم ولا إلى رخصها" (الدر المختار مع رد المحتار ۷/۲۹۴) (مقالہ: مولانا سید اسرار الحق سبیلی، مفتی ارشد شاداب ندوی، مولانا خورشید احمد اعظمی)۔

۷-"الديون تقضى بأمثالها" (الاشباہ والنظائر/۲۵۶، رد المحتار ۳/۸۴۸) (مقالہ: مولانا عبد التواب اناوی، مفتی لطیف الرحمن، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا خورشید احمد اعظمی)۔

۸-"المماثلة بين الشيئين باعتبار الصورة والمعنى" (ہدایہ مع فتح القدیر ۷/۷) (مقالہ مفتی ارشد شاداب ندوی)۔

۹-"والمثل المطلق هو المثل صورة و معنى، فأما القيمة فمثل من حيث المعنى دون الصورة" (بدائع الصنائع ۴/۴۰۱) (مقالہ: مفتی ارشد شاداب ندوی)۔

۱۰-"يجب عليه رد مثله إن كان ذوات الأمثال كالمكيل والموزون والعدد الذي لا يتفاوت" (تنبیہ الرقود فی احکام النقود/۵۶) (مقالہ: مفتی ارشد شاداب ندوی)۔

۱۱-"لأن المقصود هو الجبران وذلك في المثل أتم، لأن فيه مراعات الجنس والمالية، وفي القيمة مراعاة المالية فقط فكان إيجاب المثل

أعدل" (المبسوط ۱۱/۵۰) (مقالہ: مفتی ارشد شاداب ندوی)۔

۱۲-علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں: "ولهذا كان من أوجب المثل في كل شئ بحسب الإمكان مع مراعاة القيمة أقرب إلى العدل ممن أوجب القيمة من غير المثل" (فتاوی ابن تیمیہ ۱۱/۳۵۲) (مقالہ: مفتی ارشد شاداب ندوی)۔

۱۳-"وإن اشترى فاكهة بدانق فلس والدانق عشرون فلسا فلم يرد الفلوس حتى غلت أو رخصت فعليه عشرون فلسا لأن بالغلاء والرخص لا ينعدم صفة الثمنية وصار هو عند العقد بتسمية الدوانق مسميا ما يوجد به من الفلوس وذلک عشرون ولو صرح بذلک القدر لم يتغير العدد بعد ذلک بغلاء السعر ورخصه فهذا مثله" (المبسوط ۱۴/۲۹) (مقالہ: مفتی عبد الرحیم قاسمی)۔

۱۴-**مولانا عبد الحیؒ** فرماتے ہیں: نوٹ ہر چند خلقۃً ثمن نہیں مگر عرفاً حکم ثمن میں ہے بلکہ عین ثمن سمجھا جاتا ہے، اس وجہ سے کہ اگر نوٹ سو روپیہ کا کوئی ہلاک کردے تو اصل مالک سو روپئے کا تاوان لیتا ہے اور سو روپیہ کا نوٹ جب بیچا جاتا ہے تو مقصود اس سے قیمت ملنا اس کاغذ کا نہیں ہوتا کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ وہ کاغذ دو پیسہ کا بھی نہیں ہے بلکہ مقصود سو روپیہ کا بیچنا اور اس کی قیمت لینا ہوتا ہے اور نوٹ سو روپیہ کا اگر کوئی قرض لے تو بوقت ادا خواہ نوٹ سو روپیہ کا دے یا سو روپیہ دے دونوں امر مساوی سمجھے جاتے ہیں اور دائن کو کسی کے لینے میں مدیون سے عذر نہیں ہوتا حالانکہ اگر مدیون غیر جنس بوقت ادا دے تو دائن نہیں لیتا بخلاف پیسوں کے کہ وہ بھی اگر چہ عرفاً ثمن ہے مگر یہ کیفیت ان کی نہیں ہے، اگر ایک روپیہ کے عوض میں کوئی چیز خرید لے یا ایک روپیہ کسی سے قرض لے اور بوقت ادا پیسے یا ایک روپیہ دے دے تو دائن اور فروخت کنندہ کو اختیار رہتا ہے کہ وہ لے یا نہ لے اور حاکم کی طرف سے اس پر جبر نہیں ہوسکتا کہ خواہ مخواہ وہ پیسے لے لے، پس پیسہ اگر چہ عرفاً ثمن ہے مگر عین ثمن خلقی نہیں سمجھے گئے ہیں بخلاف نوٹ کے کہ یہ عین ثمن خلقی ہے، گو عینیت خلقیہ نہیں بلکہ عینیت عرفیہ ہو، پس تفاضل بیع فلوس میں جائز ہونے سے یہ نہیں

لازم ہے کہ نوٹ میں بھی جائز ہوجائے کیونکہ پیسہ غیر جنس ثمن ہے حقیقتاً بھی اورعرفاً بھی کو بوجہ اصطلاح اورعرف کے اس میں ثمنیت آ گئی ہو، پس ہر گاہ نوٹ عرفاً جمیع احکام میں عین ثمن خلقی سمجھا گیا، باب تفاضل میں اسی بنا پر حکم لگادیا جائے گا اور تفاضل اس میں حرام ہوگا (مقالہ: مولانا محفوظ الرحمٰن مفتاحی)۔

۱۵-مفتی محمود حسن فرماتے ہیں: اب سے ۱۴، ۱۵ برس پہلے جتنے نوٹ قرض لئے تھے اتنے ہی نوٹ واپس کرنے کا حکم ہے، آگے فرماتے ہیں: اگر سو کا نوٹ لیا تھا تو سو کا نوٹ واپس کردے بری الذمہ ہوجائے گا، اس کی گرانی سے اس پر اثر نہ ہوگا، جن کو نوٹ قرض دیا ہے ان سے نوٹ ہی واپس لینے کا حق ہے (فتاوی محمودیہ ۱۶/۶۰۴، ۴۰۷، باب القرض) (مقالہ: مولانا عبد التواب اناوی)۔

☆مولانا راشد حسین ندوی اور مولانا محمد حذیفہ محمود لکھتے ہیں کہ:

مفتی تقی عثمانی صاحب نے اس سلسلہ میں مفصل گفتگو کرتے ہوئے بعض سمیناروں کا اتفاق بھی اس بارے میں نقل کیا ہے، لکھتے ہیں:

''جب یہ مسئلہ پاکستان کی ''اسلامی نظریاتی کونسل'' کے سامنے بھی پیش ہوا تو کونسل کے تمام ارکان بشمول علماء ومعاشیین سب نے اس بات پر اتفاق کیا کہ ''قرضوں کے قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ ربط'' کے نظریہ کی شریعت اسلامیہ میں کوئی گنجائش اور وجہ جواز نہیں ہے'' (فقہی مقالات ۱/۷۴)۔

آگے لکھتے ہیں:

''اسی طرح خاص اسی موضوع پر ہونے والے سمینار میں بھی بحث کی گئی جس کو اسلامی ترقیاتی بنک جدہ، اور عالمی ادارہ برائے اسلامی اقتصادیات اسلام آباد نے مشترکہ طور پر شعبان ۱۴۰۷ھ میں منعقد کیا تھا، اس سمینار میں مختلف ممالک کے بہت سے علماء اور ماہرین معاشیات نے شرکت کی تھی، وہ قرارداد جس پر تمام شرکاء نے اتفاق رائے ظاہر کیا وہ مندرجہ ذیل ہے:

۱-کرنسی نوٹ تمام معاملات (مثلاً اس میں سود جاری ہونے اور زکوۃ واجب ہونے، بیع سلم اور مضاربت اور شرکت وغیرہ کے رأس المال بننے) میں نقدین یعنی دراہم اور دنانیر کی طرح ہیں، اور امام ابو یوسفؒ کا یہ قول کہ اگر سکوں کی قیمت زیادہ ہوجائے یا کم ہوجائے تو اس صورت میں قرض کی واپسی میں ادائیگی کے وقت نقدین کے تناسب سے سکوں کی قیمت واپس کرنا ضروری ہے، ان کا یہ قول کرنسی نوٹوں میں جاری نہیں ہوگا، اس لئے کہ یہ کرنسی نوٹ نقدین کے قائم مقام ہیں، اور ان نقدین کی قیمت بڑھنے اور کم ہونے کا معتبر نہ ہونا متفق علیہ ہے۔

۲-سمینار میں حاضر تمام علماء نے اس بات کی توثیق کی کہ سود اور قرض کی احادیث میں جو مثلیت اور برابری ضروری قرار دی گئی ہے وہ شرعی جنس اور قدر یعنی وزن، ناپ اور عدد میں برابری مراد ہے، قیمت میں برابری مراد نہیں، اور یہ بات ان احادیث کے ذریعہ پوری طرح واضح ہوجاتی ہے جو احادیث اموال ربویہ کے تبادلہ کے وقت عمدہ اور گھٹیا ہونے کے وصف کو غیر معتبر قرار دیتی ہیں اور اسی پر امت کا اجماع ہے اور اسی پر عمل جاری ہے۔

۳-ذمہ میں ثابت شدہ دیون چاہے وہ کسی بھی قسم کے ہوں، ان کو قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ منسلک کردینا جائز نہیں، بایں طور کہ عاقدین عقد بیع یا عقد قرض کے وقت اس کرنسی کو جس کے ذریعہ عقد بیع یا عقد قرض کررہے ہیں، کسی سامان کے ساتھ منسلک کرکے یہ شرط ٹھہرائیں کہ مدیون ادائیگی کے وقت اس سامان کی قیمت موجودہ کرنسی میں ادا کرے گا (فقہی مقالات ۱/ ۴۲-۴۳)۔

انٹرنیشنل اسلامک فقہ اکیڈمی جدہ کا فیصلہ بھی یہی ہے، لکھا ہے:

''کسی بھی کرنسی کے ذریعہ واجب دیون کی ادائیگی میں مثل کا اعتبار ہوگا، قیمت کا نہیں، کیونکہ دیون کی ادائیگی اپنے مثل سے ہوتی ہے، لہذا ذمہ میں واجب دیون کو خواہ وہ کسی طرح بھی واجب ہوئے ہوں قیمتوں کے اشاریہ (Price Index) سے مربوط کرنا جائز نہیں ہے'' (جدہ اکیڈمی کے فیصلے/ ۱۵۷)۔

دوبارہ اس مسئلہ پر غور کے بعد بھی یہی فیصلہ کیا گیا، چنانچہ آگے لکھا ہے:

''کسی بھی کرنسی سے لازم ہونے والے قرض کی ادائیگی میں مثل کا اعتبار ہوگا، قیمت کا نہیں، کیونکہ قرض کی ادائیگی اپنے مثل سے ہی ہوتی ہے، لہذا جائز نہیں ہوگا کہ ذمہ میں ثابت شدہ قرضوں کو چاہے جیسے ہوں نرخ کے معیار سے مربوط کیا جائے'' (جدہ اکیڈمی کے فیصلے رص ۳۴۴)۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے لکھا ہے:

''اشیاء صرف کی قیمتوں کے اشاریہ سے نوٹ کو وابستہ کرنے میں ایک تو بڑی دقت ہے، دوسرے: یہ اشاریہ محض تخمین پر مبنی ہوگا اور مختلف اشیاء کی قیمتوں کے اوسط سے اشاریہ مرتب کرنا پڑے گا، حالانکہ افراد و اشخاص کی نسبت سے ان اشیاء صرف کے تناسب اور ان کی ضرورت میں فرق واقع ہوتا رہتا ہے'' (جدید فقہی مسائل ۴ر ۴۴)۔

مولانا عتیق احمد بستوی صاحب لکھتے ہیں:

''اولاً تو اس لئے کہ اشاریہ دقیق فنی اصولوں پر مبنی ہوتا ہے، لہذا اس پر احکام شرعیہ کا دائر کرنا شریعت اسلامیہ کے مزاج کے خلاف معلوم ہوتا ہے، ثانیاً اس لئے کہ اشاریہ کی ترتیب کے لئے کوئی معیار مرتب کرنا انتہائی دشوار کام ہے، ملکوں، شہروں اور طبقوں کا اشاریہ ایک دوسرے سے مختلف ہوسکتا ہے، بلکہ ہر فرد کا اشاریہ دوسرے سے مختلف ہوسکتا ہے، اس لئے اشاریہ کو بنیاد بنانے میں احکام منضبط نہیں ہوسکیں گے'' (جدید فقہی تحقیقات، کرنسی نوٹ ۴ر ۶۹)۔

مفتی اقبال محمد ٹنکاروی ایک آخری بات یہ کہتے ہیں:

بہر حال یہ بات بھی دیکھنے میں آئی کہ ماہرین معاشیات قرضوں میں حقیقی قیمت کے اعتبار کرنے کے نظریہ کی افراط زر کی صورت میں تو تائید کرتے ہیں لیکن تفریط زر کی صورت میں کوئی بھی اس کی تائید نہیں کرتا، تفریط زر کی صورت میں اگر دس فیصد قیمت گھٹ گئی تو کون شخص گوارا کرے گا کہ اس کو اپنے قرض دار سے ایک سو روپے کے بجائے نوے روپے مل جائے، مطلب تفریط زر کی صورت میں لاحق ہونے والے نقصان کو کوئی بھی قبول کرنے کے لئے تیار نہیں، اور اس نقصان کے خوف سے کوئی بھی اپنا روپیہ بینک میں رکھنے کے لئے تیار نہیں، معلوم

ہوا کہ "Real Value" حقیقی قیمت کا یہ نظریہ کوئی ٹھوس اور مبنی بر حقیقت بنیادوں پر قائم نہیں بلکہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ افراط زر کے نقصان سے بچنے کے لئے ''حقیقی قیمت'' کو محض ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے۔

☆ اکثر مقالہ نگاروں کی رائے ہے کہ مؤخر مطالبوں کو قیمتوں کے اشاریہ سے مربوط کرنے کا معاملہ دقیق فنی اصولوں پر مبنی ہے اور عامۃ الناس کا اسے سمجھنا بہت ہی مشکل ہے، اس لئے یہ عوام کے درمیان آپسی تنازعات کا سبب ہوگا، اور ربا کا دروازہ کھلنے کا اندیشہ ہے، بعض حضرات نے دلیل کے طور پر ''نحن أمة أمية لا نكتب و لا نحسب'' (بخاری ۱/۲۵۶، ابوداؤد ۱/۳۱۷) والی روایت کو پیش کیا ہے (مقالہ: مولانا نعیم اختر قاسمی، مفتی محمد احتشام قاسمی، مفتی سید باقر ارشد قاسمی، مفتی انور علی اعظمی، مفتی لطیف الرحمٰن، مفتی ارشد شاداب ندوی، مفتی محمد خالد حسین نیموی، مفتی اقبال محمد ٹنکاروی)۔

☆ بعض مقالہ نگاروں نے وابستگی کے عدم جواز کی ایک بنیادی وجہ یہ لکھی ہے کہ اشاریہ اپنے تمام مراحل میں اٹکل وقیاس اور اندازو تخمین پر مبنی ہے، دلیل کے طور پر اس فقہی نظیر کو پیش کرتے ہیں:

''ولا يجوز بيع المزابنة وهو بيع التمر على رؤوس النخل بخرصه تمراً إنما لا يجوز هذا البيع لنهيه عليه السلام عن المزابنة والمحاقلة'' (الجوہرۃ النیرۃ ۱/۲۴۶) (مقالہ: مولانا عطاء اللہ قاسمی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا محمد حذیفہ محمود)۔

☆ مولانا سلطان احمد اصلاحی کا کہنا ہے کہ اس مسئلہ سے عہدہ برآ ہونے کے لئے سب سے بہتر طریقہ عدل کی جگہ احسان پر عمل ہے، عدل یہ ہے کہ میں ۱۰۰ روپئے کے بدلے ۱۰۰ روپئے لوٹاؤں، اور احسان یہ ہے کہ میں اس میں اپنی مرضی سے ۱۰۰/روپئے کا اضافہ کردوں، یہ جائز ہی نہیں مستحسن ہے۔

☆ اکثر مقالہ نگار حضرات نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ قرضوں کی واپسی میں جو برابری اور مثلیت شرط ہے تو وہ مقدار اور کمیت میں ہے، قیمت اور مالیت میں نہیں ہے (مقالہ: **مولانا** عبداللطیف پالنپوری، مفتی انور علی اعظمی، **مولانا** محمد نصر اللہ ندوی، **مولانا** سلمان پالنپوری، **مولانا** محمد حذیفہ محمود وغیرہ)۔

☆ مفتی محمد احتشام قاسمی اور مفتی اقبال محمد ٹنکاروی نے سوال میں مذکور اس جملہ پر کہ افراط زر کی صورت میں کاغذی نوٹ کی قوت خرید گر جاتی ہے، تعقیب کرتے ہوئے لکھا ہے کہ روپے کی قیمت خرید کم نہیں ہوتی یا بڑھتی نہیں ہے بلکہ ارزانی اور گرانی کا تعلق اشیاء سے ہوتا ہے نہ کہ ثمن اور روپے سے، اس کی دلیل میں ابوداؤد کی روایت یہ پیش کی ہے:

۱-"**عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده قال: كانت قيمة الدية على عهد رسول الله ﷺ ثمان مائة دينار أو ثمانية آلاف درهم، فكان ذلك كذلك حتى استخلف عمرؓ فقال خطيبا: ألا إن الإبل قد غلت قال: ففرضها عمرؓ على أهل الذهب ألف دينار وعلى أهل الورق اثنى عشر ألف درهم**" (ابوداؤد ۲/۵۲۶)۔

۲-"**عن معاذؓ قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول: بئس العبد المحتكر أن أرخص الله الأسعار حزن وأن أغلاه فرح**" (مشکوۃ ۲۵۱، باب الاحتکار)۔

۳-"**عن انسؓ قال: غلا السعر على عهد النبي ﷺ فقالوا: يا رسول الله! سعر لنا**" (مشکوۃ ۲۵۱، باب الاحتکار)۔

(مقالہ: **مولانا** خورشید احمد اعظمی، مفتی ارشد شاداب ندوی، **مولانا** ابوسفیان مفتاحی، **مولانا** عطاء اللہ قاسمی، مفتی سید باقر ارشد قاسمی)۔

جواز کی صورت:

ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی لکھتے ہیں کہ کرنسی نوٹ افادیت میں وہی حکم رکھتی ہے جو ثمن

خلقی (سونا چاندی) رکھتا ہے اس لئے اس کے ذریعہ تمامی معاملات درست وصحیح ہوجائیں گے۔

اور **مولانا محمد صدر الحسن** کا کہنا ہے کہ اگر اس کی ثمنیت کو باطل کرکے شیخین کے مسلک پر مبیع کا درجہ دیا جائے تو فلوس پر قیاس کرتے ہوئے کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ جائز ہوگا۔

مولانا نعیم اختر قاسمی نے ادائیگی کو قیمتوں کے اشاریے سے وابستہ کرنے کے صحیح ہونے کے لئے دوصورتوں کا ذکر کیا ہے، ایک تو یہ ہے کہ فریقین باہمی رضامندی سے کسی بھی مثلی چیز کو معیار بناکر معاملہ طے کرلیں تو اس کے جائز ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے، اور **دلیل** کے طور پر شامی کا یہ جزئیہ نقل کیا ہے:

''**وفی دعوی البزازیة من النوع الخامس عشر عن فوائد الامام أبی حفص الکبیر: استقرض منه دانق فلوس حال کونها عشر بدانق فصارت ستة بدانق أو رخص و صارعشرون بدانق یأخذ منه عدد ما أعطی ولا یزید ولا ینقص، قلت هذا مبنی علی قول الامام، وهو قول أبی یوسف أولا، وقد علمت أن المفتی به قوله ثانیا بوجوب قیمتها یوم القرض وهو دانق ای سدس درهم سواء صار الآن ستة فلوس بدانق أو عشرین بدانق**'' (ردالمحتار ۴/ ۲۴)۔ اور حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی حدیث تمر جنیب سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ چونکہ اموال ربویہ میں مساوات ضروری ہے تو برابری کی صورت میں عمدہ کھجور دینے والا خسارہ میں رہے گا، لہذا اس کو خسارہ سے بچانے کی آپ نے ایک تدبیر بتادی، تو اگر مؤخر مطالبات میں مذکورہ تدبیر اختیار کی جائے تو اسے بھی باب ربا کو کھولنے کا ذریعہ نہیں ہونا چاہئے۔

اور اس کی دوسری صورت یہ ہے کہ قرض دینے والا کسی غلہ وغیرہ کی قیمت طے کرکے اس کے حق میں بیع سلم یعنی ادھار خرید کا معاملہ کرکے طے شدہ مقدار کی قیمت دے دے اور ادائیگی کے موقع پر خواہ اصل سامان لے لے یا اسے قبضہ میں لے کر قرض لینے والے کے ہاتھ ہی بیچ ڈالے، یا اصل کی جگہ نقد یا جو چاہے بقدر مالیت لے لے، جیسا کہ یہ صورت مفتی محمد عبید اللہ

اسعدی صاحب نے بیان کی ہے (کرنسی کی شرعی حیثیت/۸۶)۔

لیکن مولانا رضوان الحسن مظاہری کا رجحان ادائیگی کو قیمتوں کے اشاریے سے وابستہ کرنے کا ہے، وہ لکھتے ہیں:

اگر غور کیا جائے کہ کسی کے ذمہ دس سال پہلے کسی کے سو نوٹ بطور قرض یا دین واجب الادا ہو جائیں تو کیا وہ شخص آج کے محض صوری اور عددی طور پر اس دین قرض کے برابر نوٹ ادا کرنے سے فارغ الذمہ قرار دیا جائے گا؟ اور کیا ان دونوں نوٹوں میں مالیت اور قیمت خرید کے اعتبار سے تفاوت فاحش کے باوجود محض عددی اور صوری مساوات کی بنیاد پر ایک کو دوسرے کا مثل تسلیم کیا جائے گا؟ فقہی تصریحات سے اس کا جواب نفی میں نکلتا ہے، صاحب ہدایہ لکھتے ہیں:

"المماثلة بين الشيئين تكون صورة و معنى" (ہدایہ ثالث باب ربوا)۔

علامہ ابن ہمام فتح القدیر میں لکھتے ہیں: "المماثلة الحقيقية المطلوبة لا تتحقق الا باعتبار الصورة والمعنى"۔

علامہ کاسانی بدائع الصنائع میں تحریر فرماتے ہیں: "والمثل المطلق هو المثل صورة ومعنى فأما القيمة فمثل من حيث دون الصورة" (۷/۱۵۰)۔

ان عبارتوں سے واضح طور پر ثابت ہو رہا ہے کہ قیمت بھی دو چیزوں کے درمیان مماثلت مطلوبہ کے تحقق میں داخل ہے، اور اگر دو چیزیں محض صورتاً مماثل ہوں اور قیمتاً متفاوت تو مماثلت مطلوبہ فوت ہو جائے گی، علامہ ابن قیمؒ اعلام الموقعین ۲/۵۴ میں جنساً صفۃً مالیۃً مقصوداً اور انتفاعاً ہر طرح کے مساوات کو مماثلت کے لئے ضروری کہتے ہیں۔

المغنی (۴/۳۵۲) میں وسیط سے امام غزالی کا قول نقل کیا ہے کہ "والصحيح أنه المثل الذي تتماثل أجزاء في القيمة والمنفعة"، ظاہر ہے کہ ان تصریحات کی موجودگی میں دونوٹوں میں قدر و قیمت اور مالیت کے مابین تفاوت فاحش کے باوجود ایک دوسرے کا مثل کہنا بہت مشکل ہوگا، جس کا صاف مطلب یہی نکلتا ہے کہ نوٹوں کے ذریعہ مطالبات مؤخرہ کی

ادائیگی میں قیمت و مالیت کا اعتبار ضرور ہونا چاہئے تاکہ ادا مثل بن کر فارغ الذمہ ہوجائے ورنہ اتلاف حق کی بنا پر عند اللہ مواخذہ کا خطرہ ہوسکتا ہے، فقہاء لکھتے ہیں:

"**یجیزون رد العین المستقرضة مادامت لم تتعیب بعیب ینقص مالیته أما إذا تعیب لا یصح ردها**"، جب عین مستقرضہ کی واپسی عیب ہونے سے پہلے جائز ہے، بعد میں نہیں، تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ عیب ایک مثلی کو مثلی رہنے نہیں دیتا اور عیب دار چیز سالم من العیب کا مثل نہیں ہوسکتی، اور اس کے ساتھ فقہاء کا یہ کلیہ پیش نظر رکھا جائے: "**کل ما أوجب نقصان الثمن فی عادة التجار فھو أعیب لأن التضرر بنقصان المالیة وذلک بانتقاص القیمة والمرجع فی معرفته عرف أھله**" (ہدایہ ۳/۲۳)۔

جب ہر وہ چیز جو تاجروں کے عرف میں اشیاء کی قیمت کے نقصان کا سبب بن جائے وہ عیب ہے جس کی بنیاد پر ہر مشتری کو مبیع واپس کرنے کا حق مل جاتا ہے اس لئے کہ مالیت کی کمی سے اس کا ضرر اور نقصان ہوتا ہے اور دفع ضرر ہر شخص کا شرعی حق ہے، اور مالیت کی کمی قیمت کے کم ہونے سے ہوا کرتی ہے تو کیا نوٹوں کی قیمت میں کمی ہونا صاحب حق کے لئے باعث ضرر نہیں ہوگا، اور اس کے دفع کا حق نہیں ملے گا، یقیناً ملے گا اور ملنا چاہئے، کیونکہ یہ کاغذی نوٹ ان سارے عیبوں کے ساتھ ماضی کے ان نوٹوں کا مثل کیسے قرار دیا جاسکتا ہے جو اپنے وقت میں ان عیبوں سے محفوظ تھا، اور پھر سب سے بڑھ کر قوی اور نص صریح تو اس سلسلے میں حضرت امام ابو یوسفؒ کا مفتی بہ قول موجود ہے، کہ اگر دراہم مغشوشہ اور فلوس نافقہ جو ثمن اصطلاحی کے درجہ کی چیز ہے اس کے ذریعہ بیع وشراء کا معاملہ کیا جائے یا قرض دیا جائے اور ابھی بیع میں ثمن کی یا معاملہ استقراض میں اس قرض کی ادائیگی نہ ہوسکی تھی کہ ان دراہم مغشوشہ اور فلوس نافقہ کا چلن بند ہوگیا یا اس کی قدر و قیمت میں کمی آگئی، تو اس مشتری اور مستقرض پر ثمن اور قرض میں لئے دراہم وفلوس کی قیمت لازمی ہوگی۔ یعنی بیع وشراء کے دن یا قرض کے مسئلہ میں قبضہ کے دن، ان دراہم وفلوس کی جو قیمت اور جتنی قدر و مالیت تھی اتنی ہی قیمتی اور مالیت کی چیز بطور ثمن مشتری پر اور بطور ادا

قرض مستقرض پر ضروری ہوگا۔

''قال الثانی ثانیا علیه قیمتها من الدراهم یوم البیع والقبض وعلیه الفتوی ای یوم البیع فی البیع و یوم القرض فی القرض فلا فرق بین الکساد والرخص والغلاء فی لزوم القیمة'' (شامی ۴/۵۳۴)۔

بہر حال ان مذکورہ بالا تمام فقہی تصریحات ونظائر کی روشنی میں، اورحالات حاضرہ میں معیشت کی تباہ کاری اورمعاشی خستہ حالی اور کرنسی نوٹوں کی گرتی قیمت کو دیکھ کر اورعرف اورعموم بلوی کوسامنے رکھ کر غور کیا جائے۔

مولانا عبد القیوم پالنپوری اورمولانا سلمان پالنپوری لکھتے ہیں کہ پنشن کوقیمتوں کے اشاریے کے ساتھ وابستہ کرنا جائز ہے، کیونکہ پنشن شرعاً دین نہیں ہے بلکہ مستاجر کی طرف سے ملازم پرتبرع واحسان ہے، مفتی محمود حسن گنگوہیؒ ایک سوال کے جواب میں تحریرفرماتے ہیں:

ملازمت سے سبکدوش پرتا زیست ملازم کورقم ماہانہ متعین کر کے بنام حق الخدمت دینا واجب نہیں بلکہ تبرع ہے، جس پر جبر نہیں کیا جاسکتا، بلکہ اس کا دل چاہے دے نہ چاہے نہ دے......اسی طرح یہ بھی اختیار رہے کہ اندازہ کر کے مجموعی رقم ایک مشت دے دے......(فتاوی محمودیہ ۱۶/۱۱۵)۔

مولانا راشد حسین ندوی اس کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

البتہ تنخواہ اور پنشن جب قرض نہ بنیں اورمتعاقدین کے درمیان یہ معاہدہ ہوجائے کہ یہ تنخواہ یا پنشن ہر سال قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ بڑھتی رہے گی تو اس کاحکم الگ ہوگا، اس لئے کہ سال ختم ہونے کے بعد گویا عقد کی تجدید ہوگی، اورنئی تنخواہ یقینی طور سے فریقین کومعلوم ہوجائے گی، لہذا شرعاً اس میں کوئی حرج نہ ہوگا (فقہی مقالات ۴/۵۷)۔

سونے چاندی کے ذریعہ طے شدہ معاملات میں مساوی نوٹوں کی ادائیگی:

سوال نمبر ۲- کیا یہ جائز ہوگا کہ نوٹوں کی شکل میں قرض دیتے وقت یا مہر کے تقرر کے

وقت یا ادھار فروختگی کے وقت طرفین واجب الادا نوٹ کی مالیت سونے یا چاندی میں طے کرلیں اور بوقت ادائیگی اسی قدر سونے یا چاندی کی قیمت کے مساوی نوٹوں کی ادائیگی عمل میں آئے؟

بعض حضرات نے سونے چاندی کی قیمت کے مساوی ادائیگی پر معاملہ کرنے کو ناجائز قرار دیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ اس میں ربا کی صورت پائی جاتی ہے (**مقالہ:** مفتی ارشد شاداب ندوی، مفتی سید باقر ارشد قاسمی، **مولانا** محمد جعفر ملی، **مولانا** خورشید احمد اعظمی، **مولانا** سلمان پالنپوری، **مولانا** اشتیاق احمد اعظمی، **مولانا** عبداللطیف پالنپوری، **مولانا** محمد صدر الحسن، مفتی انور علی اعظمی، **مولانا** عطاء اللہ قاسمی، **مولانا** عبدالتواب اناوی، **مولانا** محمد شاہجہاں ندوی، مفتی اقبال محمد ٹنکاروی)۔

حدیث سے:

"عن عبادة بن الصامت قال: قال رسول الله ﷺ: الذهب بالذهب والفضة بالفضة والبر بالبر والشعير بالشعير والتمر بالتمر والملح بالملح مثلا بمثل سواءً بسواءٍ يداً بيدٍ فإذا اختلف هذه الأصناف فبيعوا كيف شئتم إذا كان يداً بيد" (صحیح مسلم، باب الصرف وبیع الذہب بالورق نقدا) (**مقالہ:** مفتی سید باقر ارشد قاسمی وغیرہ)۔

فقہ سے:

۱-**"ولو استقرض فلوسا نافقة وقبضها ولم تكسد لكنها رخصت أو غلت فعليه رد مثله ما قبض بلاخلاف"** (بدائع الصنائع ۷/۲۴۳) (مقالہ **مولانا** عبدالتواب اناوی)۔

۲-**"رجل استقرض من آخر مبلغا من الدراهم والتصرف بها ثم غلي سعرها فهل عليه ردها مثلا؟ الجواب نعم، ولا ينظر إلى غلاء الدراهم و رخصها"** (تنقیح الفتاوی الحامدیہ ۱/۲۹۴) (**مقالہ: مولانا** عبدالتواب اناوی)۔

۳-**"يعمل بمثل ما عملوا من اعتبار تغيرات العرف وأحوال الناس**

وما هو أرفق بالناس وما ظهر عليه التعامل " (رسم المفتی رص ۹۷)(مقالہ: مفتی سید باقر ارشد قاسمی)۔

۴-"سئل عن رجل أقرض آخر مقدارا من الريال المحيدی وقت رواجه بثلاثين قرشاً ثم رد المستقرض له مثل المقدار الذی استقرضه منه بعد أن نزل إلى عشرين قرشا فامتنع المقرض من قبوله وطلب منه صرفها علی سعر ثلاثين قرشاً فهل ليس له ذلک؟ فالجواب أنه ليس له الامتناع من قبول مثل ما دفع......وفی نتيجة الفتاوی مانصه والمقبوض علی وجه القرض مضمون بمثله، وفيها نقلا عن جامع الفصولين والواجب فی القرض ردالمثل" (الفتاوی الکاملیہ ر ۹۲، مکتبہ حقانیہ پشاور) (مقالہ: مولانا عبدالتواب اناوی)۔

۵-مولانا تقی عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں: جب کوئی شخص دوسرے کو قرض دینا چاہتا ہے تو اس کو پہلے یہ فیصلہ کرنا چاہئے کہ اس قرض کے ذریعہ اس کی امداد کرنا چاہتا ہے یا اس کے منافع میں حصہ دار بننا چاہتا ہے؟ اگر وہ منافع میں حصہ دار بننا چاہتا ہے تو پھر اس کے ساتھ نقصان میں بھی حصہ دار بنے، اور وہ اس طرح کہ اس کے ساتھ شرکت یا مضاربت کا معاملہ کرے، اور اگر صرف امداد کرنا چاہتا ہے تو پھر یہ سوچ لے کہ قرض دینا ایسا ہے جیسے کوئی شخص اپنے پیسے اٹھا کر صندوق یا الماری میں تالہ لگا کر رکھ دے اور پھر اس الماری یا صندوق میں رکھے ہوئے روپیوں پر پانچ سال گذر جائیں تو اس دوران ان روپیوں کی قیمت کم ہوجائے گی، جس کی وجہ سے روپے رکھنے والے کا نقصان ہوجائے گا، تو اس نقصان کی تلافی کون کرے گا؟ ظاہر ہے کوئی نہیں کرے گا، اسی طرح آپ نے کسی کو قرض دیا تو وہ ایسا ہی ہے جیسے آپ نے صندوق یا الماری میں پیسے اٹھا کر رکھ دیئے، اس لئے یہ بات درست نہیں کہ دیون کی ادائیگی میں قوت خرید کا اعتبار کیا جائے گا (تقریر ترمذی ار ۱۵۳) (مقالہ: مولانا اشتیاق احمد اعظمی)۔

۶-مولانا محمد شاہجہاں ندوی اس کے عدم جواز کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ عقود کی صحت کے

لئے لازمی شرط معلومیت ہے، اور ایسی صورت میں عقد کے وقت دونوں فریق میں سے کسی کو یہ نہ معلوم ہوسکے گا کہ ادائیگی کے وقت مجھ کو کتنے روپے لینے ہیں یا کتنے روپے لوٹانے ہیں، اور ایسی جہالت کی وجہ سے عقد فاسد ہوجائے گا، درمختار میں ہے:

''وشرط لصحته معرفة قدر مبيع وثمن'' (الدرالمختار للحصکفی ۷؍ ۴۸)۔

اور رد المختار میں ہے:

''وخرج أيضا مالوكان الثمن مجهولا كالبيع بقيمته أو برأس ماله أو بما اشتراه أو مثل ما اشتراه فلان، فإن علم المشترى بالقدر في المجلس جاز'' (ردالمختار ۷؍ ۴۹)۔

لیکن مولانا محمد جعفر ملی اور مولانا خورشید احمد اعظمی کا کہنا ہے کہ اس کی جائز صورت یہ ہوسکتی ہے کہ مہر وغیرہ کا تقرر سونا یا چاندی سے کیا جائے اور ادائیگی کے وقت مقررہ مقدار کے مساوی کرنسی نوٹ کی شکل میں ادا کیا جائے، جیسا کہ عبد اللہ بن عمرؓ کی حدیث میں ہے:

۱-''كنت أبيع الإبل بالبقيع فأبيع بالدنانير فآخذ مكانها الورق، وأبيع بالورق فآخذ مكانها الدنانير فأتيت رسول الله ﷺ فوجدته خارجا من بيت حفصة، فسألته عن ذلك فقال: لا بأس به بالقيمة'' (سنن الترمذی ۳؍ ۳۳۵، رقم: ۱۲۴۲)(دیکھئے مقالہ: مفتی انور علی اعظمی، مولانا عبد اللطیف پالنپوری، مولانا محمد شاہجہاں ندوی، مفتی عبد الرحیم قاسمی، مفتی محمد خالد حسین نیموی، مولانا عبد التواب اناوی)۔

جبکہ مولانا محبوب فروغ قاسمی کہتے ہیں کہ:

مہر واجرت وغیرہ جن میں مبادلۃ الدیون نہیں ہوتا ان میں احسن طریقہ تو یہی ہے کہ سونے و چاندی سے مہر یا اجرت متعین کیا جائے، لیکن جن معاملات میں مبادلہ ہوتا ہے، جیسے قرض وغیرہ ان میں سونا و چاندی اس دین کی قیمت ہوں گے، یا مہر و اجرت کاغذی نوٹوں سے متعین کرنے کے بعد سونے و چاندی سے مالیت کو متعین کرنے کی صورت میں بھی سونا یا چاندی

کاغذی نوٹوں کی قیمت ہوگی تو ان صورتوں میں مندرجہ ذیل خرابیاں لازم آئیں گی۔

الف-نوٹوں کی مالیت کا تعین سونے و چاندی سے کرنا دقیق فنی اصول پر مبنی ہے جو سیدھی سادی امت کے مزاج و احوال کے مناسب نہیں، حضور ﷺ نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا:

''نحن أمة أمية لا نكتب ولا نحسب'' (بخاری ۱/۲۵۶ کتاب الصوم، باب قول النبی ﷺ لانکتب ولانحسب)۔

ہم امی لوگ ہیں حساب و کتاب سے واقف نہیں، یعنی ایسے حساب و کتاب جو دقیق ہوں، غلطیوں کا احتمال ہو اس سے واقف نہیں، لہٰذا نوٹوں کو سونے و چاندی سے مالیت متعین کرنے میں امت کو بڑی الجھن میں پھنسانا ہے۔

ب-پھر ہر دیار بلکہ ہر روز کی قیمتوں میں اتار چڑھاؤ تیزی سے ہو رہا ہے، اگر مدار اس کو بنایا جائے تو منازعت کا سبب بھی ہوگا۔

ج-مذکورہ بالا صورت میں بیع الکالئی بالکالئی لازم آئے گی اس لئے کہ سونا و چاندی بھی دین ہے، اور کاغذی نوٹ بھی دین ہے، اس کی ممانعت تو صحیح حدیثوں میں وارد ہے۔

د-نیز یہ ربا النسیئہ ہے، کہ نقدین پر مجلس میں تقابض نہیں ہوا، قبل از یں تصرف ہوگیا، جس کی حرمت میں کوئی اشتباہ نہیں، اس لئے اس طرح قیمتوں کے تعین میں فساد کی وجہ کر گنجائش معلوم نہیں ہوتی ہے۔

اس موضوع پر اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے علاوہ مختلف اکیڈمیوں اور تنظیموں نے سمینار منعقد کئے، ۱۴۰۷ھ میں ایک سمینار اسلامی ترقیاتی بینک جدہ اور عالمی ادارہ برائے اسلامی اقتصادیات اسلام آباد نے مشترک طور پر منعقد کیا تھا، اس سمینار میں علماء و مفتیان کرام کے علاوہ ماہرین اقتصادیات بھی جمع ہوئے، اور سب نے متفقہ طور پر جو قرارداد پاس کیا وہ بھی مذکورہ نظریہ کی تائید کے لئے کافی ہے:

''سمینار میں حاضر تمام علماء نے اس بات کی توثیق کی ہے کہ سود اور قرض کی احادیث

میں جو مثلیت اور برابری ضروری قرار دی گئی ہے وہ شرعی جنس اور قدر یعنی وزن، ناپ اور عدد میں برابری مراد ہے، قیمت میں برابری مراد نہیں، اور یہ بات احادیث کے ذریعہ پوری طرح واضح ہوجاتی ہے جو احادیث اموال ربویہ کے تبادلہ کے وقت عمدہ اور گھٹیا ہونے کے وصف کو غیر معتبر قرار دیتی ہیں، اور اس پر امت کا اجماع ہے اور اسی پر عمل جاری ہے۔

ذمہ میں ثابت شدہ دیون چاہے وہ کسی بھی قسم کے ہوں ان کو قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ منسلک کر دینا جائز نہیں بایں طور کہ عاقدین عقد بیع یا عقد قرض کے وقت اس کرنسی کو جس کے ذریعہ عقد بیع یا عقد قرض کر رہے ہیں کسی سامان کے ساتھ منسلک کر کے یہ شرط ٹھہرائیں کہ مدیون ادائیگی کے وقت اس سامان کی قیمت موجودہ کرنسی میں ادا کرے گا (یہ جائز نہیں ہے) (بحوالہ: فقہی مقالات مولانا محمد تقی عثمانی ۱/ ۳۷ مطبوعہ زمزم بکڈپو دیوبند)۔

۲- علامہ شامی فرماتے ہیں: "وفي البزازية معزيا إلى المنتقى غلت الفلوس أو رخصت فعند الامام الأول والثاني أولا ليس عليه غيرها وقال الثاني ثانيا عليه قيمتها من الدراهم يوم البيع والقبض وعليه الفتوى فحيث صرح بأن الفتوى عليه في كثير من المعتبرات فيجب أن يعول عليه افتاءً وقضاءً" (تنبیہ الرقود علی مسائل النقود، رسائل ابن عابدین ۲/ ۶۰) (مقالہ: مفتی محمد خالد حسین نیموی)۔

لیکن مولانا محمد حذیفہ محمود نے امام ابو یوسف کے قول سے استدلال کو محل نظر قرار دیا ہے، علامہ شامی نے لکھا ہے: "وفي المنتقى: إذا غلت الفلوس قبل القبض أو رخصت قال أبويوسف قولي وقول أبي حنيفة في ذلک سواء وليس له غيرها ثم رجع أبويوسف وقال عليه قيمتها من الدراهم يوم وقع البيع ويوم وقع القبض" (تنبیہ الرقود علی مسائل النقود رسائل ۲/ ۵۵)۔

وجہ نظر یہ ہے کہ امام ابو یوسف کا مذکورہ بالا قول ایسے فلوس کے بارے میں ہے جس کا کسی دوسرے ثمن کے ساتھ دائمی ربط اور تعلق ہو کہ وہ فلوس اس ثمن کے لئے بطور اجزاء اور

ریزگاری کے استعمال ہوتے ہوں، جیسا کہ علامہ شامی کی ایک عبارت سے واضح ہوتا ہے، لکھا ہے: "**ویدل علیه أیضا تعبیرهم بالغلاء و الرخص فانه انما یظهر إذا کانت غالبة الغش تقوم بغیرها**" (تنبیہ الرقود علی مسائل النقود ۲/ ۶۰)۔ اس عبارت میں "**تقوم بغیرها**" کے الفاظ سے واضح ہوتا ہے کہ وہ فلوس کے سکے اور غالب الغش دراہم دوسرے یعنی سونے چاندی کی کرنسی سے وابستہ تھے، اور سونے چاندی کی بنیاد پر ہی ان کی قیمت مقرر ہوتی تھی، اور یہ سکے سونے چاندی کی کرنسی کے لئے بطور ریزگاری اور چینج کے استعمال ہوتے تھے، لیکن جہاں تک موجودہ کرنسی نوٹوں کا تعلق ہے ان کا کسی دوسرے ثمن کے ساتھ ربط اور تعلق نہیں ہے اور نہ ہی وہ کرنسی کی ثمن کے لئے بطور ریزگاری اور اجزاء کے استعمال ہوتی ہے، بلکہ وہ خود مستقل اصطلاحی ثمن ہے، اس کے علاوہ فلوس کی صحیح قیمت معلوم کرنا امام ابو یوسف کے قول کے مطابق ممکن ہے اس لئے کہ فلوس ثمن کے ایک معین معیار یعنی درہم کے ساتھ مربوط ہیں، بخلاف موجودہ کرنسی نوٹوں کے کہ موجودہ معاشی اصطلاح کے لحاظ سے ان کی حقیقی قیمت ٹھیک ٹھیک معلوم کرنا ممکن نہیں، بلکہ حقیقی قیمت اندازہ اور تخمینہ کی بنیاد پر فرض کی جائے گی، اس لئے موجودہ کرنسی نوٹوں کو فلوس پر قیاس کرنا درست نہیں ہے، اور امام ابو یوسف کے قول سے استدلال بھی صحیح نہیں ہے۔

اسلامی ترقیاتی بینک جدہ اور عالمی ادارہ برائے اسلامی اقتصادیات، اسلام آباد کے تحت منعقد ہونے والے سیمینار کی قراردادوں میں ہے:

"کرنسی نوٹ تمام معاملات (مثلاً اس میں سود جاری ہونے اور زکوۃ واجب ہونے، بیع سلم اور مضاربت اور شرکت وغیرہ کے رأس المال بننے) میں نقدین یعنی دراہم ودنانیر کی طرح ہیں، اور امام ابو یوسفؒ کا یہ قول کہ اگر سکوں کی قیمت زیادہ ہوجائے یا کم ہوجائے تو اس صورت میں قرض کی واپسی میں ادائیگی کے وقت نقدین کے تناسب سے سکوں کی قیمت واپس کرنا ضروری ہے، ان کا یہ قول کرنسی نوٹوں میں جاری نہیں ہوگا، اس لئے کہ یہ کرنسی نوٹ نقدین کے قائم مقام ہیں، اور ان نقدین کی قیمت بڑھنے اور کم ہونے کا معتبر نہ ہونا متفق علیہ ہے (فقہی مقالات ۱/ ۴۷)۔

۳-مفتی نظام الدین صاحب فرماتے ہیں:

اس قرض میں لئے ہوئے نوٹوں کی قرض لینے کے زمانے میں جتنی چاندی ملتی یا جتنا سونا ملتا اتنی چاندی میں یا اتنے سونے میں جتنے نوٹ آج بوقت ادامليں اتنے ہی نوٹ دینے ہوں گے، پس نقدین میں سے جو زیادہ رائج ہوگا اس کا اعتبار ہوگا، اور نوٹ اس کے تابع ہوں گے (نظام الفتاوی ۱؍ ۲۳۲) (مقالہ: مفتی محمد خالد حسین نیموی)۔

لیکن مفتی خالد حسین نیموی یہ شرط لگاتے ہیں کہ یہ تفصیلات اس وقت ہوں گی جب قرض دیتے وقت یا معاملہ کرتے وقت رقم کی مالیت کا آئندہ اندیشہ کے پیش نظر سونے یا چاندی میں طے کرلے ورنہ نہیں، اس لئے کہ صاحب دین کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے حق کلی کا جزوی طور پر معاف کردے یا کم کردے۔

جواز کے قائلین:

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ نوٹوں کی شکل میں قرض دیتے وقت، مہر مقرر کرتے وقت یا ادھار فروختگی کا معاملہ کرتے وقت اگر اس کی مالیت سونے چاندی میں طے کرلیں اور بوقت ادائیگی سونے چاندی کے مساوی نوٹوں کی ادائیگی عمل میں آئے تو یہ درست ہے (مقالہ: مولانا نعیم اختر قاسمی، مفتی محمد احتشام قاسمی، مفتی لطیف الرحمٰن، مولانا سلمان پالنپوری، مولانا کلیم اللہ عمری، محمد احسن عبدالحق ندوی، مولانا امداد اللہ قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا ذکاء اللہ شبلی، مولانا سید اسرار الحق سبیلی، مفتی ثناء الہدی قاسمی، مولانا راشد حسین ندوی)۔

لیکن مفتی عبدالرحیم قاسمی اور مولانا محفوظ الرحمٰن مفتاحی کا کہنا ہے کہ اگر روپے مقرر کئے ہیں تو اتنی ہی تعداد کے روپے ادا کئے جائیں گے، جیسا کہ المبسوط میں ہے:

"وإن اشترى فاكهة بدانق فلس والدانق عشرون فلسا فلم يرد الفلوس حتى غلت أو رخصت فعليه عشرون فلسا لأن بالغلاء والرخص لا ينعدم صفة

الثمنية وصار هو عند العقد بتسمية المدانق مسميا ما يوجد به من الفلوس وذلک عشرون ولو صرح بذلک القدر لم يتغير العدد بعد ذلک بغلاء السعر و رخصه فهذا مثله'' (المبسوط ۱۴؍ ۲۹)۔

اورمولانا عبداللطیف پالنپوری اس میں یہ اضافہ کرتے ہیں کہ نوٹ ادا کرنے کی صورت میں اسی مجلس میں نوٹ پر قبضہ ضروری ہےتا کہ بیع الدین بالدین لازم نہ آئے، ہدایہ میں ہے:

''ولا يصح السلم حتى يقبض رأس المال قبل أن يفارقه فيه أما إذا كان من النقود فلأنه افتراق عن دين بدين و قد نهى النبي عليه السلام عن الكالئي بالكالئي'' (ہدایہ ۳؍ ۹۶باب السلم)۔

جبکہ مولانا امداد اللہ قاسمی کا کہنا ہے کہ نوٹ فلوس کے حکم میں ہیں، لہذا ان کے ذریعہ سونے یا چاندی کا تبادلہ ادائیگی کے دن کی قیمت کے اعتبار سے درست ہوگا۔

مفتی محمد احتشام قاسمی کا کہنا ہے کہ یہ صورت صحیح اور جائز تو ہے لیکن یہ صورت بھی عوام الناس کے لئے مشکلات اور تنازعات سے خالی نہیں ہے، مثلاً حقدار چاہے گا کہ میرا حق اس وقت ملے جب سونے چاندی کی قیمت گراں ہو اور مقروض چاہے گا کہ اس وقت ادا کروں جب ان کی قیمت ارزاں ہو، جو نزاع کا باعث ہے، اور اس تعلق سے درج ذیل عبارت کو مستدل بنایا ہے:

''يعمل بمثل ما عملوا من اعتبار تغيرات العرف وأحوال الناس وما هو أرفق بالناس وما ظهر عليه التعامل'' (رسم المفتی ۹۷)۔

☆☆☆

عرض مسئلہ:

موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت

مولانا راشد حسین ندوی ☆

فقہ اکیڈمی کے انیسویں فقہی سمینار کا ایک اہم موضوع "موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت" سے متعلق ہے، اس موضوع کے کئی اجزاء پر دوسرے فقہی سمینار میں بحث ہوچکی ہے، موجودہ سمینار میں صرف دو سوالات کو موضوع بحث بنایا گیا ہے جن پر دوسرے سمینار میں فیصلہ نہیں ہوسکا تھا:

۱- مؤخر مطالبات کو اشاریہ سے مربوط کرنے کا حکم۔

۲- مؤخر مطالبات کو سونے یا چاندی سے مربوط کرنے کا حکم۔

اس موضوع پر اکیڈمی کو ۲۷ مقالات موصول ہوئے ہیں، جن کے عرض مسئلہ کی ذمہ داری راقم کے سپرد کی گئی ہے:

سوال نامہ کے پہلے سوال کا حاصل یہ تھا کہ مؤخر مطالبات مثلاً قرض مہر، پنشن، ادھار خریداری کی رقم اور وقت پر ادا نہ ہونے والی تنخواہوں کی ادائیگی کو اشاریہ سے وابستہ کرنا شرعاً کیسا ہے؟ جواب میں تین طرح کی آراء ظاہر کی گئی ہیں:

پہلی رائے: اکثر مقالہ نگار حضرات نے مؤخر مطالبات کو اشاریہ سے مربوط کرنے کو شرعاً ناجائز قرار دیا ہے، ان حضرات کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

مفتی عبدالرحیم قاسمی، مفتی انور علی اعظمی، قاضی ومفتی احتشام قاسمی، مولانا محبوب فروغ قاسمی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا صدر الحسن مظفر

☆ مدرسہ ضیاء العلوم، رائے بریلی۔

پوری، مفتی سید باقر ارشد قاسمی، مولانا امداد اللہ قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا عبد التواب اناوی، مولانا نصر اللہ ندوی، مولانا محمد شاہجہاں ندوی، مفتی لطیف الرحمٰن، مولانا محفوظ الرحمٰن، مولانا عبد اللطیف پالنپوری، مولانا احسن عبد الحق ندوی، مولانا کلیم اللہ عمری۔

دوسری رائے: جبکہ مولانا ذکاء اللہ شبلی اور مولانا رضوان الحسن مظاہری نے اس کے جواز کی رائے ظاہر کی ہے۔

تیسری رائے: پہلی رائے ہی کی طرح ہے یعنی مؤخر مطالبات کو اشاریہ سے مربوط کرنا درست نہیں ہے، لیکن اس میں پنشن کو صراحت سے الگ کر دیا گیا ہے، اور اس کو اشاریہ سے مربوط کرنے کو جائز قرار دیا گیا ہے، یہ رائے مولانا سلمان پالنپوری اور مولانا عبد القیوم پالنپوری صاحب کی ہے، راقم الحروف نے بھی یہی رائے اختیار کرتے ہوئے قرض نہ بننے والی تنخواہ کا بھی یہی حکم لکھا ہے۔

مجوزین ربط کے دلائل:

اشاریہ سے وابستگی کو جائز قرار دینے والوں میں سے مولانا رضوان الحسن مظاہری نے مندرجہ ذیل دلائل سے استدلال کیا ہے:

۱- ایک ملک کی کرنسی کا دوسرے ملک کی کرنسی سے تبادلہ تفاوت کے ساتھ جائز قرار دیا گیا ہے تا کہ عدل وانصاف کے تقاضوں کو پورا کیا جا سکے، تو عدل وانصاف ہی کے تقاضہ کے پیش نظر مؤخر مطالبات میں اس کا خیال کیوں نہ رکھا جائے جبکہ قوت خرید اور مالیت میں تفاوت معلوم ومشاہد ہے۔

۲-قرآن وسنت ونصوص عدل وانصاف کا حکم دیتے ہیں، اور انہیں نوٹوں کی ادائیگی عدل وانصاف کے تقاضے پورا کرنے سے قاصر ہیں، قرآن میں ہے: ''اعدلوا هو اقرب للتقوى، لا تظلمون ولا تظلمون، ولا تبخسوا الناس أشياءهم''، حدیث میں ہے:

"لا ضرر ولا ضرار في الإسلام"۔

۳- امام ابو یوسف کا قول: "قد علمت أن المفتی به قوله جوب قیمتها یوم القرض" (شامی ۴؍۲۴)۔

۴- اگر دو چیزیں محض صورۃ متماثل ہوں اور قیمتاً متفاوت ہوں تو مماثلت مطلوبہ نوٹ ہو جائے گی، جس کو علامہ ابن القیم اور امام غزالی نے ضروری قرار دیا ہے۔

ناجائز قرار دینے والے حضرات کے دلائل:

اشاریہ سے ربط کو ناجائز قرار دینے والے حضرات نے مندرجہ ذیل دلائل سے استدلال کیا ہے:

۱- نوٹ کو نقدین کے حکم میں مان لیا گیا ہے تو اب قیمت کے تفاوت کا اعتبار نہیں ہوگا، مقدار میں برابری اور تماثل ضروری ہوگا، سو روپے قرض لئے تو سو روپے ہی کی واپسی ضروری ہوگی ورنہ ربا لازم آئے گا، جیسا کہ اموال ربویہ سے متعلق احادیث میں ہے، مثلاً:

الف- عامل خیبر سے متعلق حدیث: "أو كل تمر خيبر هكذا" (بخاری ۲۲۰۱، مسلم ۱۵۹۳)۔

ب- "الذهب بالذهب وزنا بوزن (إلی) فمن زاد أو استزاد فهو ربا" (مسلم ۴۰۶۹)۔

ج- "لا تبيعوا الدينار بالدينارين ولا الدرهم بالدرهمين" (مسلم ۴۰۵۷) (مولانا احسن عبدالحق ندوی، مولانا عبدالقیوم پالنپوری، مولانا سلمان پالنپوری، مولانا عبدالتواب اناوی، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا محفوظ الرحمن منو، مفتی لطیف الرحمن، مولانا محمد شاہجہاں ندوی، مولانا نصر اللہ ندوی، مولانا امداد اللہ قاسمی، مفتی انور علی اعظمی، راقم الحروف راشد حسین ندوی)۔

۲- مؤتمر اسلامی کی مجمع الفقہ الاسلامی، نیز رابطہ عالم اسلامی کی مجمع الفقہ الاسلامی

دونوں نے یہ قرار داد منظور کرلی ہے کہ نوٹ کی حیثیت سونے چاندی جیسی ہے "إن العملة الورقية نقد قائم بذاته له حكم النقدين من الذهب والفضة"۔

اور یہ بات متفقہ ہے کہ سونے چاندی کے سکہ سے بیع کی جائے تو باعتبار عدد اور نوع مسمی سکہ متعین ہوجاتا ہے، خواہ اس کی قیمت بڑھے یا گھٹے، اس میں امام ابو یوسف کا بھی کوئی اختلاف نہیں ہے، "فانها اثمان عرفا و خلقة ولا يجرى فى ذلك خلاف أبى يوسف" (تنبیہ الرقود رسائل ۲/ ۶۳)۔

(مولانا صدر الحسن، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، راقم الحروف راشد حسین ندوی)۔

۳- اشاریہ سے مربوط کرنے میں جہالت ہوگی، صحیح مقدار بائع مشتری مقرض متقرض شوہر بیوی، کسی کو معلوم نہ ہوگی، اس لئے کہ اشاریہ کی حقیقت تک پہنچنا ہر کس وناکس کے بس میں نہ ہوگا، اور شریعت کسی ایسی چیز کو مدار نہیں بناتی ہے جسے صرف مخصوص لوگ سمجھ سکتے ہوں "إنا أمة أمية لا نكتب ولا نحسب"، میں اسی حقیقت کی طرف رہنمائی کی گئی ہے (مفتی لطیف الرحمٰن، مولانا محمد شاہجہاں ندوی، مولانا نصر اللہ ندوی، مولانا عبد التواب اناوی، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا امداد اللہ قاسمی، مفتی سید ارشد قاسمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، قاضی مفتی احتشام قاسمی، مفتی انور علی اعظمی، مفتی عبد الرحیم قاسمی، راشد حسین ندوی)۔

۴- اس سے سود کا دروازہ کھل جائے گا (مولانا محمد شاہجہاں ندوی، مفتی لطیف الرحمٰن ولایت علی، مولانا عبد التواب اناوی، مفتی سید باقر ارشد قاسمی، مولانا صدر الحسن، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، قاضی مفتی محمد احتشام قاسمی، مفتی انور علی اعظمی، مفتی عبد الرحیم قاسمی)۔

۵- نوٹ مثلی چیزوں میں سے ہے اور مثلی اشیاء کے قرض کی واپسی میں مقدار اور کمیت

میں برابری مطلوب ہے، قیمت اور مالیت میں نہیں (**مولانا** نصر اللہ ندوی، **مولانا** عبدالتواب اناوی، **مولانا** نعیم اختر قاسمی، **مولانا** ابوسفیان مفتاحی، **مولانا** عطاء اللہ قاسمی، **مولانا** اشتیاق احمد اعظمی)۔

۶- یہ مسلک حضرت ابن عمرؓ کی حدیث سے متصادم ہے، جس میں درہم کو دینار اور دینار کو درہم سے بدلنے کے سوال پر حضور ﷺ نے فرمایا: "**لا بأس أن تأخذها بسعر یومها ما لم تفترقا وبینکما شيء**" (ابوداؤد ۳۳۵۴) اس میں یوم عقد کی قیمت کے بجائے تبادلہ کے وقت کی قیمت کا اعتبار کرنے کا حکم دیا گیا ہے، جبکہ اشاریہ کے مطابق معاملہ کرنے پر یوم عقد کی قیمت کا اعتبار لازم آئے گا، پھر مجلس بھی مختلف ہوگی (**مولانا** عبدالتواب اناوی، **مولانا** امداد اللہ قاسمی، **مولانا** خورشید احمد اعظمی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، راشد حسین ندوی)۔

۷- اگر ہم اشاریہ کے جواز کے قائل ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ گیہوں اور جو جیسی مکیلات قرض لے کر ان کو اشاریہ سے مربوط کرنے کو جائز قرار دیا جائے، جبکہ اس کا کوئی قائل نہیں ہے، علامہ ابن قدامہ فرماتے ہیں: "**یجب رد المثل في المکیل والموزون لا نعلم فیه خلافا**" (المغنی ۴/۳۵۷ بیوع باب القبض) (**مولانا** سلمان پالنپوری، **مولانا** نصر اللہ ندوی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، راشد حسین ندوی)۔

۸- ارزانی اشیاء میں ہوجاتی ہے، نوٹوں کی قوت خرید میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوتی (قاضی و مفتی محمد احتشام قاسمی، **مولانا** محبوب احمد فروغ قاسمی، **مولانا** عطاء اللہ قاسمی، **مولانا** خورشید احمد اعظمی، مفتی سید باقر ارشد قاسمی، **مولانا** امداد اللہ قاسمی، **مولانا** ابوسفیان مفتاحی)۔

۹- یہ نظام چونکہ اٹکل اور تخمینہ پر مبنی ہے، لہذا اگر اس میں ربا نہ بھی ہو تو شبہ ربا ضرور ہے (**مولانا** نعیم اختر قاسمی، **مولانا** امداد اللہ قاسمی، **مولانا** عبدالرحیم قاسمی)۔

۱۰- اصل یہ ہے کہ اشیاء کی قیمتوں کا اندازہ نقود سے کیا جائے اور اشاریہ کا قائل ہونے پر لازم آئے گا کہ نقود کا اندازہ سامانوں سے کیا جائے، یہ بلاشبہ قلب موضوع ہے (راشد حسین ندوی)۔

البتہ مفتی عبدالقیوم صاحب پالنپوری اور مولانا سلمان پالنپوری صاحب نے پنشن کے اشاریہ سے جوڑنے کو جائز قرار دیا ہے، کیونکہ پنشن مستاجر کی طرف سے ملازم پر احسان وتبرع ہے اس میں تبادلہ اور بیع کی کوئی صورت نہیں ہے، لہذا اس کو اشاریہ سے مربوط کرنا جائز ہے۔

دوسرا سوال یہ تھا کہ نوٹوں کی شکل میں قرض دیتے وقت یا مہر کے تقرر کے وقت یا ادھار فروختگی کے وقت کیا یہ جائز ہوگا کہ طرفین واجب الاداء نوٹ کی مالیت سونے یا چاندی میں طے کرلیں اور بوقت ادائیگی اسی قدر سونے یا چاندی کی قیمت کے مساوی نوٹوں کی ادائیگی عمل میں آئے۔

جواب میں اکثر حضرات نے تحریر فرمایا ہے کہ جب یہی کرنا ہے تو بہتر شکل یہ ہوگی کہ درمیان میں نوٹوں کا ذکر کئے بغیر سونے چاندی کی کوئی مقدار طے کی جائے یا ادھار دی جائے اور واپسی کے وقت وہی مقدار یا نوٹوں سے اس کی مالیت ادا کی جائے۔

پھر اصل سوال کے جواب میں تین طرح کی آراء آئی ہیں:

پہلی رائے: یہ ہے کہ یہ عمل جائز ہے، یہ رائے مندرجہ ذیل حضرات کی ہے:

مولانا رضوان الحسن مظاہری، مولانا احسن عبدالحق ندوی، مفتی لطیف الرحمٰن، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا امداد اللہ قاسمی، قاضی ومفتی محمد احتشام قاسمی، مولانا محمد ذکاء اللہ شبلی، مفتی شیر علی، حافظ شیخ کلیم اللہ عمری مدنی۔

دوسری رائے: یہ ہے کہ یہ عمل ناجائز ہے، یہ رائے مندرجہ ذیل حضرات کی ہے:

مفتی سلمان پالنپوری، مولانا محفوظ الرحمٰن مئو، مولانا محمد شاہجہاں ندوی، مولانا عبدالتواب اناوی، مولانا مفتی سید باقر ارشد قاسمی، مولانا محمد صدر الحسن، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی انور علی مئو، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مولانا عبداللطیف پالنپوری۔

تیسری رائے: ناچیز راقم الحروف نے ظاہر کی تھی وہ یہ کہ مہر یا ثمن کی تعیین سونے یا

چاندی سے کی جاسکتی ہے، قرض کی نہیں کی جاسکتی۔

مجوزین نے مندرجہ ذیل نصوص سے استدلال کیا ہے:

۱-حضرت ابن عمرؓ کی حدیث: "كنت أبيع الإبل الحديث" (مولانا امداد اللہ قاسمی)۔

۲-"استقرض منه دانق فلوس حال كونها عشر بدانق فصارت ستة بدانق اورخص وصار عشرون بدانق، يأخذ منه عدد ما أعطى ولا يزيد ولا ينقص، قلت هذا مبني على قول الامام وهو قول أبي يوسف اولاً وقد علمت أن المفتى به قوله ثانيا بوجوب قيمتها يوم القرض وهو دانق أي سدس درهم، سواء صار الآن ستة فلوس بدانق أو عشرين بدانق" (ردالمحتار ۴/ ۲۴ کتاب البیوع) (مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا رضوان الحسن مظاہری)۔

مولانا نعیم اختر قاسمی نے مزید فرمایا کہ یہ صورت باب ربا کے کھلنے کا سبب نہیں بنے گی، یہ نقصانات سے بچانے کا ایک طریقہ ہے، اسی جیسا طریقہ عامل خیبر کو تمر سے متعلق سمجھا گیا۔

جبکہ اس طریقہ کو ناجائز قرار دینے والے حضرات نے مندرجہ ذیل دلائل پیش کئے ہیں:

۱-نوٹ اموال ربویہ میں سے ہے، لہذا اس کی واپسی اسی کی جنس سے برابری کے ساتھ ہونا چاہئے، نیز نسیئہ بھی نہ ہونا چاہئے ورنہ سود کا دروازہ کھل جائے گا (مفتی سلمان پالنپوری، مولانا محمد شاہجہاں ندوی، مفتی عبد الرحیم قاسمی، مفتی انور علی اعظمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مفتی سید باقر ارشد قاسمی، مولانا عبدالتواب اناوی)۔

۲-باعث نزاع اور شرعی ضوابط نیز مزاج شریعت کے خلاف ہے (مفتی انور علی اعظمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا احتشام قاسمی اگرچہ مجوزین میں شامل ہیں لیکن یہ بات موصوف نے تسلیم بھی کی ہے)۔

۳-اس سے بیع الکالئی بالکالئی لازم آئے گی جس کی احادیث میں ممانعت وارد ہوئی

ہے (مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا عبداللطیف پالنپوری)۔

۴- دیون میں اصل مثل سے واپسی ہے "الديون تقضى بامثالها" اور مثل سے مراد مثل فی المقدار ہے نہ کہ مثل فی القیمۃ (مولانا اشتیاق احمد اعظمی)۔

۵- اس میں شبہ ربا ہے (مولانا خورشید احمد اعظمی)۔

۶- اس میں جہالت ہے اور جہالت کے ساتھ عقد ناجائز ہوتا ہے (مولانا محمد شاجہاں ندوی)۔

۷- "وإن اشترى فاكهة بدانق فلس والدانق عشرون فلسا، فلم يرد الفلوس حتى غلت أو رخصت فعليه عشرون فلسا" (مبسوط ۲۹/۱۴) (مفتی عبد الرحیم قاسمی)۔

راقم الحروف نے مہر اور ثمن کی تعیین سونے چاندی سے کرنے کو جائز قرار دیا تھا، اور قرض کی تعیین کو ناجائز قرار دیا تھا قرض کے ناجائز ہونے کے دلائل وہی ہیں جو مانعین کے دلائل کے تحت (۱) پر گزرے ہیں، مہر اور ثمن کی سونے چاندی سے تعیین کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

۱- مہر کا سونے چاندی سے خاص ربط ہے، چنانچہ مہر کی کم از کم مقدار دس درہم بتلائی گئی، ظاہر ہے اس کا پتہ لگانے کے لئے چاندی کی طرف رجوع ناگزیر ہے، دس درہم سے کم مہر مقرر کی جائے تو دس درہم مقرر ہو جائے گی، اس کا پتہ بھی چاندی کی مقدار پر غور کرنے سے چلے گا، معاشرہ میں مہر فاطمی کا عام رواج ہے اس سے واقفیت بھی چاندی کی مقدار پر غور کرنے سے ہوگی۔

پھر بھی یہ معلوم ہے کہ مہر میں حط بھی جائز ہے اور زیادتی بھی، اسی طرح عقد سے پہلے مہر کی تعیین نہ کی ہو تو بعد میں تراضی سے تعیین جائز ہے، لہذا روپے سے تعیین کر کے بعد میں سونے چاندی سے بھی تعیین تراضی سے جائز ہونا چاہئے، اس میں ربا یا شبہ ربا کی کیا بات ہے؟

جہاں تک ثمن مبیع کی تعیین سونے چاندی سے کرنے کا تعلق ہے تو یہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ مسلمان کے تصرفات کو حتی الامکان صحیح قرار دینے کی کوشش کرنا چاہئے، یہاں بھی اقتضاء اقالہ

مان کرعقد جدید قرار دینا ممکن ہے، صاحب ہدایہ فرماتے ہیں:

''والفسخ قد یثبت بطریق الاقتضاء کما إذا تبایعا بألف ثم بألف وخمس مائة'' (ہدایہ مع الفتح کتاب الصرف ۶/۲۷۲، ۲۷۳)۔

''کرنسی نوٹ'' کے موضوع پر مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی صاحب کا مقالہ بھی دستیاب ہوا ہے، آپ نے دلائل کے ساتھ نوٹ کو نقدین کے حکم میں قرار دیا ہے، لیکن ان دونوں سوالات کو نہ چھیڑنے کے سبب اوپر موصوف کی رائے نہیں آسکی۔

☆☆☆

دوسرا باب

تعارفی تحریر

موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت

مولانا مبین سلیم ندوی ☆

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد المرسلين وعلى آله وصحبه ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين، أما بعد:

کرنسی انسانی زندگی کی ناگزیر ضرورت ہے، جس پر اس کے مالی معاملات کا دارومدار ہے، اسی لئے انسانی تاریخ میں اسے غیر معمولی حیثیت حاصل رہی اور وہ متعدد محرکات کے پیش نظر اپنی لمبی تاریخ میں مختلف تبدیلیوں سے گذرتی رہی (۱) یہاں تک کہ آج النقدية Paper Money والعملة الورقية Paper Currency) کاغذی نوٹوں کی کرنسی کے نام سے موسوم ہے، ابھی اس کا سفر ختم نہیں ہوا بلکہ مسلسل جاری ہے، جیسا کہ نظام زر کے ماہرین کے درمیان الکٹرونک کرنسی یا ڈیجیٹل کرنسی (Digital Currency) یا ڈیجیٹل روپیہ (Digital Money) زیر بحث ہے (۲)۔

اس کرنسی کی اہمیت اسلامی شریعت میں بھی بہت ہے چونکہ اسی کے ذریعہ تبادلہ پر تمام مالی معاملات کی حلت وحرمت، اباحت وحظر کا انحصار ہے، یہی وجہ ہے کہ تمام فقہاء کرامؒ نے اس پر بحث کی ہے لیکن آج کرنسی نے جو شکل اختیار کرلی ہے وہ چند وجوہ سے قدیم کرنسی اور اس سے مرتبط نظام زر سے مختلف ہے، نیز یہ کہ موجودہ کرنسی کی تمامتر تبدیلی وترقی اسلامی فقہ کی نگرانی کی غیر موجودگی میں طے پائی ہے، اسی لئے اس کرنسی کی شرعی حیثیت متعین کرنا چنداں مشکل اور

☆ شعبۂ سنی دینیات علی گڈھ۔

تفصیل کا متقاضی ہے۔

چنانچہ اس بحث کا بنیادی مقصد ''الحکم علی الشیء فرع عن تصورہ'' کی روشنی میں موجودہ کاغذی کرنسی کی حقیقت ومزاج کی شناخت وانکشاف کے ساتھ فقہ اسلامی میں موجود کرنسی کی حقیقت اور اس کے شرعی حکم کا جاننا اور پھر جدید کرنسی کا فقہاء کے اقوال سے تقابل کرنا اور ان کے اختلاف کو بیان کرنا نیز موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت پر راجح رائے قائم کرنا ہے۔

اس مقصد کو موضوعی ومنہجی انداز سے انجام دینے کی وجہ سے یہ بحث مندرجہ ذیل خاکہ کی پابند ہوگی:

(۱) کرنسی کی تعریف، ایجاد اور اس کی قسمیں۔
(۲) اسلامی حکومت میں درہم ودینار کی کرنسی۔
(۳) نقدین (درہم ودینار کی کرنسیوں) میں ربا کی علت۔
(۴) فلوس نامی کرنسی اور اس کی شرعی حیثیت فقہاء کے اقوال کی روشنی میں۔
(۵) موجودہ زیر بحث کاغذی کرنسی (العملۃ الورقیۃ PaperMoney) اور فقہاء کرام۔
(۶) رائے راجح اور نتائج بحث۔
(۷) مراجع بحث

۱-کرنسی کی تعریف، ایجاد اور اس کی قسمیں:

تعریف: ''عربی میں کرنسی کی شکل کو نقد جمع نقود کہا جاتا ہے، جس کے لغوی معنی ہیں: ''خلاف النسيئة، وهو الإعطاء والقبض، تقول: نقدته الدراهم، ونقدتها له بمعنى: أعطيته، فانتقدها: أي قبضها'' (۳)، نقد ادھار کے برخلاف ہے یعنی دینا اور قبضہ کرنا۔ خطیب شربینی کہتے ہیں: ''أصل النقد لغة: الإعطاء، ثم أطلق النقد على المنقود؛ من باب إطلاق المصدر على اسم المفعول (۴): نقد کے لغت میں اصل معنی تو دینے کے ہیں، پھر نقد

کا اطلاق اس چیز پر ہونے لگا جونقد کے طور پر دی جاتی ہے، یہ مصدر کو اسم مفعول پر اطلاق کرنے کے باب سے ہے۔

اس جگہ اصطلاحی معنی لغوی معنی سے الگ نہیں بلکہ یکساں ہیں، اسی بنیاد پر ہم دیکھتے ہیں کہ فقہاء نقد کو زکاۃ، صرف، اور ربا کے ابواب میں سونے اور چاندی (ڈھلے ہوئے اور بغیر ڈھلے ہوئے) کے معنی میں استعمال کرتے ہیں، جبکہ بیع کے باب میں مشتری کے بائع کو قیمت دینے کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔

لیکن موجودہ نقود کی تعریف کچھ اس طرح سے کی گئی ہے: "**السلعة التی تلقی قبولا فی عملیات التبادل: من شراء و بیع للسلع، وفی تسدید الدین**"(۵)۔

ایجاد: ابتدائی زمانہ کے انسان نے صرف سامان کو سامان کے بدلہ میں لین دین کے طریقہ کو اپنایا (اسلوب المقایضة)، جب اس کی ضرورت سے زائد سامان ہوتا تو اس کو دیکر دوسرا سامان لے لیتا جس کی اسے ضرورت ہوتی، لیکن اس طریقہ کے اندر بڑی دشواریاں اور دقتیں ہوتیں جس کی بنیاد پر انسان نے کرنسی کا طریقہ تبادل ایجاد کیا، ان میں چند اس طرح تھیں:

۱- تمام افراد کی ضرورتوں کا ایک وقت میں ایک ساتھ نہ پایا جانا، جس کی وجہ سے سامان کی خرید فروخت میں وقت ومحنت کا ضیاع۔

۲- ایک سامان کی دوسرے سامان کے مقابلہ میں قیمت کی تعیین کی دشواری۔

۳- ذخیرہ (اسٹاک) کرنے کی دشواری۔

۴- ادھار کی شکل میں اس سے معاملہ کی دشواری۔

یہ اور ان جیسی اور دشواریوں کے پیش نظر انسان نے اس طریقہ کی جگہ دوسرے متبادل طریقہ کی تلاش جاری رکھی جس میں وہ پرانے طرز کی دشواریوں سے بچ سکے، چنانچہ اس نے سامانی کرنسی کا (چیزوں کی قیمت کو جاننے کی بنیاد کے طور پر) استعمال شروع کیا، اگر چہ ان سامانی

کرنسیوں کی انواع ان معاشروں کی معاشی حالات کے اعتبار سے مختلف رہیں اور مختلف چیزیں نقود کے طور پر مستعمل رہیں، جیسے: تمباکو، سیپ، چوپائے، چائے، کھال وغیرہ، پھر سونا اور چاندی مستعمل ہوئے (۶)۔

اس طرح مختلف قسم کی کرنسیاں وجود میں آئیں اور اس نے سامان کو سامان کے بدلہ خرید وفروخت کے طریقہ کی مکمل جگہ لے لی، اور اس کے ذریعہ معاملہ کی وجہ سے اس کے کام (Functions) متعین ہوئے، یہاں تک کہ وہ تبادلہ کا ذریعہ، قیمتوں کا معیار، مالی امانت ہونے کے ساتھ ادھار سرمایہ وذخیرہ کا وسیلہ قرار پایا، اسی لئے کرنسی پر سوسائٹی میں اعتماد ضروری ہے تاکہ تمام معاملات بحسن وخوبی انجام دیے جاسکیں۔

کرنسی کی قسمیں:

کرنسی نے اپنی تاریخ میں مختلف شکلیں اختیار کی ہیں، جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱- سامانی کرنسی (النقود السلعیۃ: Commodity Money)، یعنی کرنسی کی وہ شکل جسے ابتدائی انسانی سوسائٹیوں نے سامان کو سامان کے بدلہ میں خرید وفروخت کے طریقہ کے طور پر استعمال کیا۔

۲- دھاتی کرنسی (النقود المعدنیۃ: Metalic Money)، جس میں سب سے اہم سونے اور چاندی کی دھات سے بنی کرنسی ہے جو کرنسیوں کی شکلوں میں سب سے بہتر صفات کی حامل ہے اور تمام انسانی تاریخ میں سب سے زیادہ استقرار کی صلاحیت سے متصف رہی ہے جنگ وسلم اور انقلابات زمانہ کی وجہ سے قیمتوں میں تغیرات کے باوجود، یہی وجہ ہے کہ سونے چاندی کا مدتوں سے اہم رول رہا ہے جو تقریباً تین سو سال پہلے تک باقی تھا جس میں سونا اور چاندی ہی صرف لین دین کا ذریعہ رہے۔ اور اس پر لوگوں کا بھرپور اعتماد تھا جس نے ان

سوسائٹیوں کو افراط ومندی کے خطرات سے بچائے رکھا مگر زمانہ قدیم سے بہت سی حکومتوں نے ان قیمتی دھاتوں میں سستی دھاتوں کی ملاوٹ کر کے اس بھروسہ کو ختم کرنے کی کوشش کی جیسا کہ رومی تہذیبوں میں امراء وحکام نے کرنسیوں میں قیمتی دھاتوں کے مشتملات میں کمی کی اور ایسے سونے کے سکے ڈھالے جو وزن میں تو دوسری کرنسیوں سے کم ہوں مگر اسمی قیمت کے حامل ہوں، یہی حال قدیم یوروپی مملکتوں میں ہوا، چنانچہ آٹھویں ہنری نے چاندی کی ایسی کرنسی ڈھالی جو تھوڑے استعمال کے بعد ہی نیچے سے تانبا ثابت ہوئی۔ پھر یہ دھوکہ حکومتوں سے افراد میں منتقل ہوگیا اور دھیرے دھیرے لوگوں کے اعتماد میں کمی آنے لگی، بادشاہوں نے ایسا جان بوجھ کر کیا، خاص طور پر جنگی حالات میں یا اپنے محلوں کے بنانے کے لئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چیزوں کی قیمتیں بڑھ گئیں اس لئے کہ یہ کرنسی حقیقت میں اس کی اصلی قیمت کے مقابلے میں سونے کی کم مقدار پر مشتمل تھی۔ دوسری طرف کبھی بعض اوقات سونے کی فراہمی میں زیادتی کے سبب افراط کرنسی کی صورت میں قیمتیں مہنگی ہوگئیں جیسا کہ سولہویں صدی میں یورپ میں واقع ہوا، جب کہ اسپین کی براعظم امریکہ میں نوآبادیوں کے اندر سونے، چاندی سے بھرپور کانوں کا انکشاف ہوا۔

مندرجہ بالا وجوہات کی بنیاد پر لوگوں کا سونے چاندی کی کرنسی سے اعتماد کم ہوتا گیا یہاں تک کہ کاغذی کرنسی نے آکر ان منفی پہلوؤں کو ختم کردیا۔

۳- معاون کرنسی (النقود المساعدة: Taken Money)، یہ کرنسی کم قیمت چینج ریزگاری پر مشتمل ہوتی ہے، اور اساسی سکہ کی اکائی کے اجزاء کے طور پر جاری ہوتی ہے، اس کا رول صرف چھوٹی خرید فروخت کے تبادلہ تک محدود رہتا ہے۔ یہ کوئن سکے چاندی یا نکل یا برونز کے ہوتے ہیں، اور یہ کاغذ کے بھی ہوسکتے ہیں۔ اور اس معاون کرنسی میں دھات کی قیمت کرنسی کی اسمی قیمت سے کم رہتی ہے، تاکہ زائد دھات سے فائدہ حاصل نہ کیا جاسکتا ہو، چونکہ ان معاون کرنسیوں کے ڈھالنے سے حکومت بہت فائدہ اٹھاتی ہے۔

۴- کاغذی کرنسی: یہ کاغذی کرنسی دھاتی کرنسی سے کئی اعتبارات سے فائق ہے:
- اس کے جاری کرنے میں حکومت کو کوئی معتد بہ خرچہ برداشت نہیں کرنا پڑتا۔
- ہر اعتبار سے اس پر حکومت کا کنٹرول ہوتا ہے جب چاہے جتنے چاہے بازار کے اعتبار سے فراہم کرے اور افراط سے بچائے، نیز اسے نقدی (کرنسی) سیاست کی روشنی میں مہیا کرے۔
- اس کی سونے چاندی کی کرنسی کے مقابلہ میں زیادہ بہتر طریقہ سے ذخیرہ اندوزی ہوسکتی ہے۔

کاغذی کرنسی کی ترقی: جب سونے چاندی کی کرنسی کا رواج تھا تب مالی معاملہ کرنے والوں اور تاجروں کو اس کی حفاظت میں بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا تھا، اس لئے کہ اس کی چوری ہوسکتی تھی لہذا وہ اسے حفاظت کے طور پر سنار و جوہری کے پاس رکھتے تھے، ان پر مکمل اعتماد کی وجہ سے؛ چونکہ ان کے پاس حفاظتی وسائل ہوتے تھے جیسے کہ لوہے کی مضبوط الماری وغیرہ، اور یہ جوہری ان کو اس وقت رسید دیتے تھے جس میں مال کی قیمت، اس کی مقدار، اس کی قسم کے ساتھ اس بات کا عہد ہوتا تھا کہ وہ امانت جمع کرنے والوں کو طلب کرنے پر ان کی امانت واپس کریں گے، اور امانت رکھنے والے انہیں سود ادا کرتے تھے۔ سونے کی ضرورت کے وقت امانت رکھنے والے تاجر ان رسیدوں کو پیش کرتے اور سونے چاندی کی تختیوں کو حاصل کرتے اور پھر اسے سکے ڈھالنے کے کارخانہ میں بنوانے کے لئے دے دیتے تاکہ کرنسی کی شکل میں تیار ہوکر ان کو حاصل ہوں۔ جب یہ طریقہ رائج ہوگیا تو اس پر چلنا بھی مشکل ہوگیا چونکہ اس میں تاخیر ولاگت دونوں چیزیں موجود تھیں، اس لئے تاجروں نے ان حاصل شدہ رسیدوں کو دکھانا شروع کردیا اور ان کے ساتھ معاملہ کرنے والوں نے قبول کرنا شروع کردیا، ان تاجروں اور سناروں پر بھروسہ کرکے جو حقیقت میں ان رسید والوں کو ان کی قیمت کا سونا دینے کو تیار رہتے تھے، اس

طرح ان رسیدوں نے سونے کے سکوں کی جگہ حاصل کرلی، پھر ایک قدم اور آگے بڑھے اور ان رسیدوں کے اظہار کی بھی ضرورت نہ رہی اور ان رسیدوں کے حامل شخص کو اس کی قیمت کا سونا ادا کیا جانے لگا بغیر تظہیر کے، پھر سناروں کو یہ آسان لگا کہ ان رسیدوں کے مختلف حصے کسی معین کرنسی کی اکائیوں کی شکل میں بنالیں، اس طرح کاغذی بینک نوٹ کی پہلی شکل وجود میں آئی، اور اس طریقہ کا چلن عام ہوگیا، اور معاملہ کرنے والوں کو بھی آرام وآسانی ہوئی، چونکہ ان کے اور جوہریوں کے درمیان مکمل اعتماد بحال تھا اور انہوں نے جوہریوں کے پاس اصل سونے کی تختیاں لینے جانے کی ضرورت محسوس نہیں کی، پھر حکومتوں نے ان سوناروں کی جگہ لے لی، اور وہ ان تختیوں کی حفاظت اور امانت رکھنے والوں کو رسیدیں دینے کی ذمہ داری ادا کرتی رہیں یہاں تک کہ سترہویں صدی عیسوی کے اوائل میں بینک نوٹ کرنسی نے استقراری کیفیت حاصل کرلی۔

یعنی اس سے مراد ایک ایسا کاغذ ہے جس کی قیمت سونے کی مکمل اور حقیقی نمائندگی کرتی ہے، اس کا ہولڈر جس وقت چاہے اس کے مقابل سونا حاصل کرسکتا ہے۔ لیکن بعد میں بینکوں نے ایسے کاغذی سکوں کی پابندی نہیں کی جو حقیقت میں امانت کے برابر رکھے سونے کی مقدار کے برابر ہو۔ پھر اس کاغذی کرنسی نے قانونی طور پر ثمن کی حیثیت حاصل کرلی اور انیسویں صدی میں بعض حکومتوں نے قرض دینے والوں پر لازم قرار دیا کہ وہ اپنے قرضے واپس لیتے وقت ان کاغذی نوٹوں کو قبول کریں، اس طرح اس کرنسی کے ذریعہ معاملہ قانونی ہوگیا۔ مگر بینکوں نے اس پر بس نہ کیا بلکہ جب دیکھا کہ بہت ہی کم ڈپازیٹر (امانت رکھنے والے) اپنے کاغذی نوٹوں کے مقابلے میں سونے کا مطالبہ کرتے ہیں تو اس چیز نے ان بینکوں کو (جیسا کہ اس سے پہلے جوہریوں کو) اس بات پر اکسایا کہ وہ اپنے پاس موجود سونے کی ان تختیوں کو قرض کے طور پر دوسروں کو دیں جس کا مطالبہ ان کے مالک نہیں کرتے اور اس قرض سے متعین سود حاصل

کریں، اس طرح بینکوں نے ان جمع شدہ امانتوں کو قرض کے طور پر دینا شروع کردیا اور پھر یہ قرض کی فراہمی کا دائرہ اتنا بڑھا کہ یہی بینکوں کا اصل مشغلہ ہوگیا۔ اس کے بعد ایک خطرناک مرحلہ پیش آ گیا اور وہ یہ تھا کہ ان بینکوں نے صرف دوسروں کی جمع کردہ امانتوں سے ہی قرض دینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان امانتی کھاتوں سے بھی دینا شروع کردیا جن کے پاس حقیقت میں کوئی سونے کا کور ہی نہ تھا یا اس کا کوئی حقیقی وجود ہی نہ تھا، اور چونکہ بینک ہی ان کاغذی نوٹوں کو جاری کرتی ہیں تو سود کے ذریعہ جلدی کمانے کی لالچ نے انہیں ان کاغذی نوٹوں کو زیادہ تعداد میں جاری کرنے پر ابھارا جن کے حقیقی کوئی سونے کے کور نہ تھے، اسی لئے اٹھارہویں صدی کا اواخر اور انیسویں صدی کا اوائل مالی بحرانوں کے لئے معروف ہے، چونکہ بعض بینک ان کاغذی نوٹوں کے ہولڈرس کو اس کے مقابل سونا دینے سے عاجز رہیں جس کی وجہ سے ان بینکوں کے ساتھ معاملہ کرنے والوں کا بھروسہ کم ہوگیا اور انہوں نے بھی ان کاغذی نوٹوں کے بالمقابل سونے کا مطالبہ کردیا اور اکثر بینک یہ فراہم کرنے سے قاصر رہیں، جس کی وجہ سے حکومت کے زیرنگرانی مرکزی بینکوں کا قیام عمل میں آیا جو کاغذی نوٹوں کے معاملہ کو قابو میں رکھنے اور ان کی حقیقی سونے کی ادائیگی میں زیادہ قادر ہوتی ہیں۔ لیکن جب حکومتوں کے ہاتھ میں اس کرنسی کی باگ ڈور آئی اور وہ مرکزی بینکوں کے ذریعہ کرنسی کی مہم پر حاوی ہوگئیں تو وہ بھی بینکوں (اور اس سے پہلے سناروں) کے کاموں (رول) سے محفوظ نہ رہ سکیں، یہی وجہ ہے کہ مختلف حکومتیں خاص طور سے جنگوں، اقتصادی پریشانیوں میں یا سیاسی اسباب کی وجہ سے ان کاغذی نوٹوں کو (جن کا سونے کا کوئی کافی کور نہیں ہوتا) بڑی مقدار میں چھاپ دیتی ہیں جس سے بازار بھر جاتا ہے۔

بعض حکومتوں نے جان بوجھ کر کرنسی کی دھات کی جودت میں کمی کی جس سے اس کی اسمی قیمت اس کی حقیقی سونے چاندی کی قیمت سے بہت زیادہ ہو، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کرنسی کی حقیقی قیمت کا بدلنا اور اسے اس کے مقابلہ ادا کرنا بینکوں کے بس سے باہر ہوگیا۔ اور پھر آہستہ

آہستہ سونے کی بنیاد پر کرنسی کا قاعدہ وقانون بھی ختم ہوگیا (۷)۔

''اس طرح یہ کاغذی نوٹ ایک ایسی کرنسی سے جو سونے کے برابر قیمت رکھتی تھی ایک کاغذ میں تحویل ہوگیا جس کا کوئی حقیقی سونے کا کور ہی نہیں، اور اس نے خود ایک مستقل کرنسی کی حیثیت اختیار کرلی جسے سونے سے کوئی تعلق نہیں''(۸)۔

۲- اسلامی حکومت میں درہم ودینار کی کرنسی:

اسلام سے پہلے عرب میں دراہم ودنانیر کا استعمال:

اسلام کی آمد سے قبل عرب دراہم ودنانیر سے متعارف تھے، اورخرید وفروخت میں اس کا استعمال بھی کرتے تھے، حالانکہ یہ ان کے پاس پڑوسی ملکوں سے آتے تھے، چنانچہ ملک روم سے دنانیر اورملک فارس سے دراہم کے آنے کا عام رواج تھا۔ اس سلسلہ میں علامہ بلاذری یوں رقم طراز ہیں: "کانت دنانیر هرقل ترد علی أهل مکة فی الجاهلیة، فترد علیهم دراهم الفرس۔ وکانوا یتعاملون بها بالوزن معاملة التبر غیر المضروب، وکانت لقریش أوزان فی الجاهلیة؛ فدخل الاسلام فأقرت علی ما کانت علیه: کانت قریش تزن الفضة بوزن تسمیه دینارا۔ فکل عشرة من أوزان الدراهم سبعة أوزان من الدنانیر۔ و کان لهم وزن الشعیرة وهو واحد من الستین من وزن الدراهم۔ وکانت لهم الأوقیة: وزن أربعین درهما، والنش: وزن عشرین درهما۔ وکانت لهم النواة وهی وزن خمسة دراهم۔ فکانوا یتبایعون بالتبر علی هذه الأوزان، فلما قدم النبی ﷺ مکة أقرهم علی ذلک" (۹)۔

اسلام کے آنے کے بعد عہد رسول وعہد صحابہ میں اوازان دراہم ودنانیر سے معرفت:

مذکورہ بالا عبارت سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اورصحابہ

کے مبارک عہد میں ان دراہم ودنانیر اور ان کے اوزان سے معرفت موجود تھی۔ اس سے ان لوگوں کا گمان بے معنی رہ جاتا ہے جو اُس زمانہ میں ان کی معرفت کا انکار کرتے ہیں، اس مسئلہ میں قاضی عیاض فرماتے ہیں: "لا تصح أن تکون الأوقیة والدراھم مجھولة فی زمن رسول الله ﷺ، وھو یوجب الزکوة فی أعداد منھا، و تقع بھا البیاعات والأنکحة کما ثبت فی الأحادیث الصحیحة"۔ پھر آپ نے تاکیداً کہا: "و ھذا یبین أن قول من زعم:أن الدراھم لم تکن معلومة الی زمن عبد الملک بن مروان، وأنه جمعھا برأی العلماء، وجعل کل عشرة وزن سبعة مثاقیل، ووزن الدرھم ستة دوانیق قول باطل، وإنما معنی ما نقل من ذلک: أنه لم یکن منھا شئ من ضرب الإسلام وعلی صفة لا تختلف، بل کانت مجموعات، ضرب فارس والروم، وصغارا وکبارا، وقطع فضة غیر مضروبة، ولا منقوشة ویمنیة ومغربیة، فرأوا صرفھا إلی ضرب الإسلام ونقشه وتصییرھا وزناً واحداً لا یختلف، و أحیانا یستغنی فیھا عن الموازین، فجمعوا أصغرھا وأکبرھا، وضربوہ علی وزنھم، ولا شک أن الدراھم کانت حینئذ معلومة، وإلا فکیف کانت تعلق بھا حقوق الله تعالی فی الزکوة وغیرھا وحقوق العباد؟ وھذا کما کانت الأوقیة معلومة أربعین درھما، وقال الرافعی من الشافعیة وغیرہ: أجمع أھل العصر الأول علی التقدیر بھذا الوزن، وھو أن الدراھم ستة دوانیق، کل عشرة دراھم سبعة مثاقیل، ولم یتغیر المثقال فی الجاھلیة ولا فی الإسلام، ھذا ما ذکرہ العلماء فی ذلک، والصحیح الذی یتعین اعتمادہ: أن الدراھم المطلقه فی زمن رسول الله ﷺ کانت معلومة الوزن معروفة المقدار، وھی السابقة الی الأفھام عند الاطلاق، وبھا تتعلق الزکوة و غیرھا من الحقوق

والمقادير الشرعية، ولا يمنع من هذا أنه كان هناك دراهم أخرى أقل أو أكثر من هذا القدر؛ فاطلاق النبى ﷺ الدراهم محمول على المفهوم عند الاطلاق، وهو كل درهم ستة دوانيق، كل عشرة دراهم سبعة مثاقيل، وأجمع أهل العصر الأول فمن بعدهم إلى يومنا على هذا، ولا يجوز أن يجمعوا خلاف ما كان في زمن رسول الله ﷺ وخلفائه الراشدين"(١٠)۔

نبی کریم ﷺ کی یہ حدیث بھی اسی معرفت کی طرف واضح دلالت کرتی ہے: فعن ابن عمرؓ قال: قال رسول الله ﷺ: ''الوزن وزن أهل مكة، والمكيال مكيال أهل المدينة'' (١١)۔

(حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: '' پیمانہ مدینہ والوں کا مانا جائے گا اور باٹ مکہ والوں کا)۔

اسلامی سکہ کی ضرب سب سے پہلے کس نے کی؟

امام ماوردیؒ فرماتے ہیں: اس میں اختلاف ہے، سعید بن مسیّبؒ فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے عبدالملک بن مروان نے ضرب کرائے، اس وقت رومی دینار اور کسروی وحمیری دراہم بھی کچھ کچھ چلتے تھے۔ ابوزناد کہتے ہیں کہ عبدالملک بن مروان کے حکم سے حجاج نے ۷۴ھ میں عراق میں دراہم ضرب کرائے، مدائنی کا قول ہے کہ حجاج نے آخر ۷۵ھ میں ضرب کرائے، اس کے بعد ۷۶ھ میں نواحی میں ضرب کرنے کا حکم دیا، ایک قول یہ بھی ہے کہ حجاج نے بلا حکم خود اپنی رائے سے ضرب کرائے اور اللہ أحد، اللہ الصمد کندہ کرایا، اس کا نام مکروہ تھا، وجہ تسمیہ میں اختلاف ہے، ایک جماعت کہتی ہی کہ اس کو فقہاء نے ناپسند کیا تھا: کیونکہ آیت قرآنی جنبی اور محدث کے ہاتھ میں جاتی تھی، دوسری جماعت کہتی ہے کہ عجمیوں نے کم وزن ہونے کی وجہ سے ناپسند کیا تھا اس لئے مکروہ سے موسوم ہوا۔ حجاج کے بعد یزید بن عبدالملک کے عہد میں جب

عمر بن ہبیرہ والی ہوا تو اس نے پہلے سے زیادہ کھرا ضرب کرایا، اس کے بعد خالد بن عبد اللہ قسری والی ہوا تو اس نے اور شدت کی، اس کے بعد یوسف بن عمرو نے اور بھی شدت کرکے نہایت خالص ضراب کرائی، اس وجہ سے ہبیرہ، خالدیہ، یوسفیہ عہد بنوامیہ کے خالص ترین سکے تھے، منصور خراج میں ان کی نقود کے یہی سکے لیتا تھا۔ یحیٰ بن نعمان غفاری اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ سب سے پہلے مصعب بن زبیر نے اپنے بھائی عبد اللہ بن زبیرؓ کے حکم سے اکاسرہ کی ضرب پر دراہم ضرب کرائے، ان کے ایک طرف ''برکۃ''، دوسری طرف ''اللہ'' تحریر کرایا، ایک سال کے بعد حجاج نے اس کو بدل کر ایک جانب ''بسم اللہ'' اور دوسری جانب ''حجاج'' لکھا(۱۲)۔

سکہ کی تعریف: امام ماوردی اس کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''سکہ اصل میں لوہے کا نام ہے، جس پر درہم ضرب کیا جائے، اسی مناسبت سے درہم کو سکہ کہتے ہیں''(۱۳)۔

دینار کی مقدار:

دینار کی مقدار کے سلسلہ میں ابن حزمؒ کہتے ہیں: "بحثت غاية البحث عن كل من وثقت بتمييزه فكل اتفق على أن دينار الذهب بمكة وزنه ثنتان و ثمانون حبة و ثلاثة أعشار حبة من حب الشعير، وعشر عشر حبة (فالرطل) مائة درهم و ثمانية و عشرون وأربعة أسباع درهم، وهو تسعون مثقالا''(۱۴)۔

یہاں یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ عرف میں دینار ومثقال دونوں مرادف ہیں اور ایک ہی معنی میں ہیں جیسا کہ لغت کی کتابوں میں تصریح ہے: "الدينار هو المثقال" (۱۵)۔

ابن عبد البرؒ اس طرح اس اتفاق کو بیان کرتے ہیں: "كانت الدنانير في الجاهلية وأول الاسلام بالشام وعند عرب الحجاز كلها رومية، تضرب بلاد الروم عليها صورة الملك، واسم الذى ضربت في أيامه مكتوب بالرومية،

ووزن كل دينار منها مثقال كمثقالنا هذا، وهو وزن درهمين ودانقين ونصف وخمسة أسباع حبة''(١٦)۔

علامہ بلاذری یوں فرماتے ہیں: "وكانت دنانير هرقل ترد على أهل مكة في الجاهلية وترد عليهم دراهم الفرس البغلية، فكانوا لا يتبايعون إلا على أنها تبر، وكان المثقال عندهم معروف الوزن، وزنة اثنان وعشرون قيراطا إلا كسرا، ووزن عشرة دراهم سبعة مثاقيل، فكان الرطل اثنى عشر أوقية أربعين درهما، فأقر رسول الله ﷺ ذلك وأقره أبوبكر وعمر وعثمان وعليؓ، وذكر الواقدي قال: حدثني ربيعة عن عثمان عن وهب بن كيسان قال: رأيت الدراهم والدنانير قبل أن ينقشها عبد الملک ممسوحة، وهي وزن الدنانير التي أخذ بها عبد الملک''(١٧)۔

ابوعبیدؒ کہتے ہیں: ''كان الدينار يحمل اليهم من بلاد الروم، فلما أراد عبد الملک بن مروان أن يضرب الدنانير والدراهم سأل عن أوزان الجاهلية، فأجمعوا له على أن المثقال اثنان وعشرون قيراطا إلا حبة بالشامي، وأن عشرة من الدراهم سبعة مثاقيل فضربها كذلک'' (١٨)۔

اگر عبدالملک بن مروان کے ڈھلوائے ہوئے دینار کا موجودہ وزن سے حساب کریں تو ۴۲۵ء۴ گرام سونا ہوتا ہے(۱۹)۔

درہم کی مقدار:

عہد ما قبل اسلام میں درہم کی مقدار بہت مختلف رہی لیکن زکوۃ کی ادائیگی اور لوگوں کے تعامل میں آسانی پیدا کرنے کی غرض سے عہد اسلام میں اس کی مقدار یکساں کردی گئی اور اس

پر اجماع امت ہوگیا، امام ماوردی رقم طراز ہیں: "إن الدراهم كانت في أيام الفرس مضروبة على ثلاثة أوزان: منها درهم على وزن المثقال، عشرون قيراطا، ودرهم وزنه اثنا عشر قيراطا، ودرهم وزنه عشرة قراريط فلما احتيج في الإسلام إلى تقديره أخذ الوسط من جميع الأوزان الثلاثة، وهو اثنان وأربعون قيراطا، فكان أربعة عشر قيراطا من قراريط المثقال۔ وقيل: إن عمر بن الخطابؓ رأى الدراهم مختلفة، منها البغلي ثمانية دوانيق۔ والطبري أربعة، والمغربي ثلاثة دوانيق، واليمني دانق واحد، فقال: أغلب ما يتعامل الناس به من أعلاها وأدناها، فكان البغلي والطبري فجمعهما فكانا اثني عشر دانقا، فأخذ نصفهما، فكان ستة دوانيق، فجعله دراهم الإسلام" (۲۰)۔

امام ماورد یؒ فرماتے ہیں: "عہد فارس میں تین وزن کے درہم مضروب ہوتے تھے، ایک تو مثقال کے وزن سے بیس قیراط کا، دوسرا بارہ قیراط کا، تیسرا دس قیراط کا، عہد اسلامی میں لینے کے وقت ان تینوں کے مجموعے یعنی ۴۲ قیراط کا وسط یعنی ۱۴ قیراط لیکر اس پر درہم ضرب کرایا گیا، ایسے دس درہم کا وزن ۷ مثقال کے برابر ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے درہم میں اختلاف پایا، کوئی درہم بغلی وزن ۸ دانق، کوئی طبری وزن ۴ دانق، کوئی مغربی وزن ۳ دانق، اور کوئی یمنی وزن ایک دانق، تو حکم دیا کہ سب سے اعلی اور سب سے ادنی کو جو زیادہ مروج ہوں جمع کرو، چنانچہ ایسے درہم بغلی اور طبری تھے جن کا مجموعہ ۱۲ دانق ہوا، ۱۲ دانق کا نصف ۶ لے کر اس پر اسلامی درہم ضرب کرادیا؛ اس لئے اسلامی درہم ۶ دانق کا ہے، اگر اس پر اس کا ۳/۷ زیادہ کیا جائے تو ایک مثقال کا وزن ہوتا ہے اور مثقال میں سے ۳/۷ کم کیا جائے تو درہم کا وزن نکلتا ہے، اس طرح سے ہر دس درہم کا وزن ۷ مثقال اور ہر ۷ مثقال کا وزن دس درہم اور ہر دس مثقال کا وزن (۷×۲ =) ۱۴ درہم ہوا۔ اسلامی درہم کی چاندی خالص ہوتی

ہے کھوٹ نام کو نہیں، اہل فارس کے نظم ونسق بگڑنے کے ساتھ ان کے نقود بھی کھوٹے ہوگئے تھے مگر کھوٹ نظر انداز ہونے کی وجہ سے معاملات، لین دین میں کھرے کے مساوی چلتے تھے، اسلامی سکے بالکل کھرے ضرب کئے گئے اس کے بعد سے کھوٹے کھرے میں فرق ہونے لگا'' (۲۱)۔

امام ابوعبید کہتے ہیں: ''حدثني رجل من أهل العلم والعناية بأمر الناس ممن يعني بهذا الشأن: أن الدراهم كانت في الجاهلية ضربين: البغلية والسوداء ثمانية دوانيق، والطبرية أربعة، وكانوا يستعملونها متقاصة مائة طبرية، فكان في المائتين منها خمسة دراهم زكاة، فلما كان زمن بني أمية، قالوا: إن ضربنا البغلية ظن الناس أنها التي تعتبر فيها الزكاة فيضر الفقراء، وإن ضربنا الطبرية ضر أرباب الأموال؛ فجمعوا الدرهم البغلي والطبري وجعلوهما درهمين كل درهم ستة دوانيق ... الخ (۲۲)۔

''میں نے لوگوں کے معاملے سے باخبر اور اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے ایک بزرگ سے سنا وہ درہم کی کہانی اور اسلام میں ان کے ڈھالے جانے کا سبب بیان کرتے ہوئے کہہ رہے تھے: یہ دراہم جو روئے زمین پر ہمیشہ سے لوگوں کی نقدی کے کام آتے ہیں دو قسم پر مشتمل ہیں: ایک تو یہ (نئے) سود وافیہ (بھرپور وزن کے بڑے درہم) اور دوسرے (پرانے) طبری دراہم، جب اسلام آیا تو یہ انہی شکلوں میں مروج تھے۔ پھر عہد اموی میں خلفاء نے نئے دراہم ڈھالنے کا ارادہ کیا تو نتائج غور کر لینے کے بعد انہوں نے کہا: یہ سکے رہتی دنیا تک رائج رہیں گے؛ کیونکہ فریضہ زکوۃ کے سلسلہ میں آیا ہے: ''ہر دوسو یا ہر پانچ اوقیہ پر پانچ درہم زکوۃ واجب ہوگی''۔ اور ایک اوقیہ چالیس درہم کا ہوتا ہے۔ وہ اس بات سے ڈرے کہ تمام دراہم سود وافیہ (بھرپور وزن کے بڑے) دراہم کے برابر ڈھال دیں، لیکن بعد ازاں یہی صورت اتنی عام ہوگئی کہ اس کے سوا کوئی دوسری شکل لوگ پہچانتے بھی نہ تھے۔ وہ زکوۃ کے سلسلہ میں یہی جانتے

تھے کہ جب تک ان سود وافیہ دراہم کی تعداد دوسو یا اس سے زائد نہ ہوجائے ان پر زکوۃ واجب نہیں ہوتی لیکن اس طرح زکوۃ کی مقدار میں کمی ہوتی تھی۔ اب وہ اس بات سے ڈرنے لگے کہ ان تمام دراہم کوطبریہ کے برابر بناکر یہ قاعدہ بنالیں کہ جب ان دراہم کی تعداد دوسو ہوجائے تو ان پر زکوۃ واجب ہوجائے گی۔ کیونکہ اس طرح مال کے مالک پر زیادتی ہوتی تھی۔ تب انہوں نے یہ چاہا کہ ان دونوں صورتوں کے درمیان کوئی ایسی شکل پیدا کی جائے کہ اس میں زکوۃ بھی پوری ادا ہوجائے اورلوگوں کونقصان بھی نہ ہو۔ ساتھ ہی یہ صورت رسول اللہ ﷺ کی (مقررہ مقدار نصاب وسنت) زکوۃ کے مطابق بھی ہو۔

اس سے قبل لوگ دوحصوں میں زکوۃ ادا کرتے تھے بڑے دراہم سے علاحدہ اور چھوٹوں سے علاحدہ۔ اب جب انہوں نے نئے دراہم ڈھالنے کا عزم مصمم کرلیا تو انہوں نے بڑے درہم کوتول کردیکھا تو اس کا وزن آٹھ دانق تھا۔ پھر انہوں نے چھوٹے درہم کوتول کر دیکھا کہ اس کا وزن چاردانق ہے۔ چنانچہ انہوں نے بڑے کی زیادتی اور چھوٹے کی کمی کوبرابر کرنے کے لئے (اوسط نکال کر) ہر ایک کا وزن چھ دانق کردیا، پھر مثقال سے اس کا وزن کرلیا؛ کیونکہ مثقال ہمیشہ سے ایک ہی متعین وزن کا رہا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایسے دس درہم لئے جن میں سے ایک کا وزن چھ دانق تھا۔ پھر ان (دراہم) کومثقالوں سے تولا تو وہ پورے سات مثقال ہوئے۔ اس طرح ان دراہم میں تینوں صورتیں پیدا ہوگئیں۔ ایک تو یہ کہ وہ (دس دراہم) سات (مثقال) کے ہموزن ہوگئے۔ ثانیاً یہ کہ چھوٹے اور بڑے درہموں کے درمیان اعتدال قائم ہوگیا۔ تیسرے یہ کہ رسول اللہ ﷺ کی زکوۃ سے متعلق سنت سے اسے پورا پورا تطابق ہوگیا نہ اس میں کوئی کمی رہی نہ بیشی۔ بعد از اں دراہم کے یہ اوزان امت میں رائج ہوگئے اور امت نے اسے متفقہ طور پر قبول کرلیا۔ اوراس میں کسی کو اختلاف نہیں کہ پورے وزن کا درہم چھ دانق کا ہوتا ہے۔ اوراگر اس کے وزن میں کچھ کمی بیشی ہوتو حسب موقع کہا جائے گا کہ اس درہم کاوزن کم یا

زیادہ ہے۔اس طرح لوگ زکوۃ کی ادائی میں بحمد اللہ اسی اصل پر باقی ہیں جو سنت وہدایت نبوت پر مبنی ہے۔اس سے سرمو بھی متجاوز نہیں ہوئے۔اس میں کسی قسم کا شک وشبہ اور التباس نہیں ہے۔

یہی صورت خرید وفروخت اور دیت سے متعلقہ امور کے معاملات میں چاندی کے سکے رکھنے والوں کے ساتھ جاری رہے گی۔

یہ ہیں وہ تفصیلات جو ہمیں اس ضمن میں پہونچیں۔اس سے قبل بھی درہم کا وزن چھ دانق ہی ہوتا تھا۔جس کا ذکر بعض احادیث میں آیا ہے۔اصبغ بن نباتہ حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں: ''رسول اللہ ﷺ نے چارسو اسی درہموں پر حضرت فاطمہؓ کا نکاح مجھ سے کرایا تھا۔ہر درہم کا وزن چھ (دانق) تھا۔یہی وزن برابر چلا آرہا تھا تا آنکہ بعد میں جیسا کہ ہم نے بتایا وہ سات (مثقال) کا کردیا گیا''۔(۲۳)۔

اسلامی عہد میں درہم کے اسی اجماعی وزن کو امام ابوسلیمان الخطابی نے بھی معالم السنن ۱۲/۵ میں مفصل بیان کیا ہے،اسی طرح ابن خلدون نے بھی مقدمہ میں اسے بہت تفصیل سے ذکر کیا ہے۔آپ نے کہا: ''**فاعلم أن الإجماع منعقد منذ صدر الإسلام وعهد الصحابة والتابعين: أن الدرهم الشرعي هو الذى تزن العشرة منه سبعة مثاقيل من الذهب، والأوقية منه أربعين درهما، وهو على هذا سبعة أعشار الدينار، ووزن المثقال من الذهب اثنتان وسبعون حبة من الشعير، فالدرهم الذى هو سبعة أعشاره، خمسون حبة وخمس حبة، وهذه المقادير كلها ثابتة بالإجماع، فإن الدرهم الجاهلى كان بينهم على أنواع، أجودها الطبرى وهو أربعة دوانق والبغلى وهو ثمانية دوانق، فجعلوا الشرعى بينهما وهو ستة دوانق، فكانوا يوجبون الزكاة فى مائة درهم بغلية ومائة طبرية خمسة دراهم وسطا .... وأما وزن الدينار باثنتين وسبعين حبة من الشعير الوسط فهو الذى**

نقله المحققون، وعليه الإجماع، إلا ابن حزم فقد خالف ذلک، وزعم أن وزنه أربعة وثمانون حبة،نقل عنه القاضي عبد الحق، ورده المحققون ،عدوه وهما و غلطا ،وهو الصحيح"(۲۴)۔

الغرض حضرت عمرؓ نے درہم کی مقدار میں اتحاد قائم کرنے کے ساتھ اسے عمومی تعامل و تداول نیز عملی تنفیذی شکل فراہم کی اور پھر عبدالملک بن مروان کے عہد میں اسلامی سکے متفق علیہ وزن پر ڈھالے گئے اور پھر اسلامی عہد میں اسی کے مطابق عمل ہوتا رہا،اس سے یہ بات بھی ظاہر ہے کہ یہ اسلامی کرنسی کے سکے چاندی اور سونے ہی سے ڈھلتے تھے لہذا ان کی اسمی اور حقیقی قیمت میں کوئی فرق نہیں ہوتا تھا۔

موجودہ اوزان میں درہم و دینار کی مقدار:

تمام فقہاء ومؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ مثقال کے وزن کے مقابلے درہم کے وزن کا اوسط: ۷/۱۰ ہوتا ہے،لیکن معاصر فقہاء کے درمیان درہم ودینار کے اوزان میں اختلاف پایا جاتا ہے، چنانچہ شیخ علی مبارک، ڈاکٹر محمد ضیاء الدین الریس، ڈاکٹر یوسف القرضاوی اور ڈاکٹر صبحی صالح کے نزدیک دینار کا وزن ۲۵ء۴ گرام ہے، اس اعتبار سے ان کے نزدیک درہم کا وزن ۹۷۵ء۲ گرام ہوا(۲۵)۔

جب کہ ڈاکٹر شوقی اسماعیل کے نزدیک دینار کی مقدار ۳۴ء۴ گرام ہے، اس حساب سے درہم کا وزن ان کے یہاں ۱۰ء۳ گرام ہوا۔ یہی رائے ڈاکٹر عبدالرحمٰن فہمی کی بھی ہے۔ ڈاکٹر مصطفیٰ ذھبی کے نزدیک درہم کا وزن ۱۲ء۳ گرام ہے، اور ڈاکٹر تقی الدین النبھانی کے نزدیک دینار کا وزن ۴۴ء۴ گرام اور درہم کا وزن ۱۲ء۳، اوران کی یہ رائے صحابہ کرام کی متفق علیہ ۷/۱۰ کے اوسط کی مخالف ہے۔ ڈاکٹر محمود الخالدی کی رائے ڈاکٹر شوقی شحاتہ کی رائے کے مطابق ہے کہ دینار کا وزن ۴۵ء۴ گرام ہے اور درہم کا وزن ۱۱۵ء۳ گرام ہے(۲۶)۔

راجح رائے یہ ہے کہ دینار کا وزن ۴٫۲۵ گرام ہے، اس حساب سے سونے کا نصاب ۴٫۲۵×۲۰=۸۵ گرام سونا ہوا۔ اور چاندی کا نصاب ۲٫۹۷۵×۲۰۰=۵۹۵ گرام۔

دینارو درہم کی زکوۃ کا نصاب:

بہت سی روایات ونصوص وارد ہوئے ہیں جو سونے چاندی کے نقود (درہم و دینار) کی زکوۃ کا نصاب متعین کرتی ہیں، اور یہ حکم متفقہ طور پر طے ہے کہ چاندی کی زکوۃ کا نصاب دوسو درہم اور سونے کی زکوۃ کا نصاب بیس دینار ہے۔

امام ابوعبید سونے چاندی کے نصاب پر تفصیلی روشنی ڈالنے کے بعد لکھتے ہیں:

''مسلمانوں میں اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں کہ جب کسی کے پاس شروع سال میں اتنی مقدار مالیت ہوجائے جس پر زکوۃ واجب ہوجاتی ہے مثلاً دوسو درہم (چاندی)، بیس دینار (سونا)، پانچ اونٹ، تیس گائیں، چالیس بکریاں بھیڑیں، تو ان اصناف میں سے کسی ایک کا شروع سال سے آخر تک مالک رہنے کی صورت میں تمام لوگوں کے قول کے مطابق اس مالک پر زکوۃ واجب ہوجاتی ہے'' (۲۷)۔

زکوۃ کے نصاب میں معیار اصل سونے کا ہے یا چاندی کا؟

دوسرے الفاظ میں ''زکوۃ واجب ہونے کے لئے معیار سونے کا نصاب ہے یا چاندی کا نصاب؟:

سونے یا چاندی کے جداگانہ مقدار نصاب سے کم ہونے پر زکوۃ ادا کرنے کی صورت کے سلسلے میں امام ابوعبید فرماتے ہیں:

اگر دراہم و دینار اپنے مقررہ نصاب سے کم ہوں تو ان پر زکوۃ سے متعلق پانچ اقوال ہیں:

(پہلا قول): ہر صنف میں سے بقدر حصہ اس کی زکوۃ ادا کرے گا۔ یہ قول امام ابراہیم

اور امام مالک بن انسؒ کا ہے، ان کی دلیل یہ ہے کہ: کسی مال پر اس کی انفرادی اور ذاتی حیثیت سے زکوۃ واجب ہوتی ہے اور یہ نہیں ہوگا کہ اس پر جو حق واجب ہوتا ہے وہ اس سے منتقل ہوکر دوسرے پر واجب ہوجائے۔ بنابریں دونوں قسموں میں سے کسی ایک کو دوسرے میں ضم نہیں کیا جائے گا۔

(**دوسرا قول**): جو صنف کمتر ہو اسے زیادہ والی کے مطابق (قیمت کا اندازہ لگا کر) حساب کرے گا، اگر وہ بقدر نصاب بن جائے تو اس کی زکوۃ ادا کرے گا۔ یہ قول امام شعبیؒ، سفیان، اہل عراق اور ابن بکیر کی روایت کے مطابق امام اوزاعی کا ہے۔ امام ابوعبیدؒ نے اس کی تشریح یوں کی ہے: "مطلب یہ ہے کہ (چاندی یا سونے میں سے) جو صنف کمتر ہوگی بازار کے موجودہ بھاؤ سے اس کی قیمت متعین کرکے (زیادہ مقدار والی صنف کی قیمت میں ملا کر) حساب کیا جائے گا"؛ اس رائے کے قائلین دونوں کو ایک مال قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ درہم و دینار اشیاء کی قیمت ہیں، اشیاء کو ان دونوں قیمت نہیں کہا جاتا لیکن بایں ہمہ یہ دونوں اصناف ایک دوسرے کے عوض ادھار (نسی) فروخت کرنا جائز نہیں ہے، اس سے ثبوت ملتا ہے کہ یہ دونوں چیزیں ایک ہی نوع ہیں۔ بنابریں کمتر صنف کی قیمت اس کے بھاؤ کے مطابق لگا کر زیادہ مقدار والی صنف میں شامل کریں۔

(**تیسرا قول**): جب دینار کی قیمت درہم میں شامل کرے تو ہر دینار کو دس درہم کے مساوی قرار دے خواہ (موجودہ) بھاؤ اس سے کمتر یا بیشتر ہو۔ یہ قول محمد بن حسن کا ہے، وہ اپنے مسلک پر یہ ثبوت پیش کرتے ہیں کہ اصل نصاب میں ہر دینار دس درہم ہی کے مساوی رکھا گیا ہے، آپ نہیں دیکھتے کہ جب تک دینار کی تعداد بیس نہ ہوجائے اس پر زکوۃ واجب نہیں ہوتی۔ بالکل اسی طرح جیسے دراہم کی تعداد دو سو ہونے سے قبل ان پر زکوۃ واجب نہیں ہوتی؛ چنانچہ (ان دونوں کی مذکورہ تعداد کے بعد) یہ دونوں باہم دیگر مساوی ہوجاتے ہیں لہذا ان میں سے ہر ایک

پر چالیسواں حصہ واجب کیا گیا ہے۔

(چوتھا قول): ہر حال میں دیناروں کی قیمت لگا کر دراہم میں جوڑی جائے، خواہ دینار دراہم سے کم ہوں یا زیادہ۔ یہ بعض اہل اثر کا قول ہے اور اس سے ملتا جلتا قول امام عطاء وزہریؒ کا ہے، یہ دونوں دیناروں کو بمنزلہ مال تجارت قرار دیتے ہیں۔ ان کا مستدل یہ کہ سنت میں صرف درہموں کی زکوۃ ہی مذکور ہے اور یہی سنت رسول ﷺ سے ثابت ہے۔ مسلمانوں نے دراہم سے مشابہت کی بنا پر ہی سونے پر زکوۃ واجب کردی ہے۔ بنابریں دیناروں کو مال تجارت قرار دیتے ہوئے ان کی قیمت لگا کر اسے دراہم میں شامل کیا جاتا ہے۔

(پانچواں قول): دونوں قسم کے مالوں پر سے زکوۃ ختم کردی جائے گی، اور ان پر اس وقت تک کوئی زکوۃ نہیں لگے گی تاوقتیکہ وہ جداگانہ (اپنے نصاب کی مقدار میں یعنی) دراہم دو صد، اور دینار بیس نہ ہو جائیں۔ یہ قول امام ابن ابی لیلیٰ، شریک اور حسن بن صالح کا ہے: ان کی دلیل یہ ہے کہ خود سنت نے ان دونوں اصناف میں فرق قائم رکھا ہے اور ان دونوں کو مختلف نوع قرار دیا ہے۔ اس لئے کہ خود رسول اللہ ﷺ نے چاندی کو چاندی کے عوض ربا قرار دیا ہے الا یہ کہ وہ مساوی ہو۔ چنانچہ آپ ﷺ نے دونوں چاندیوں کو برابر قرار دیا: کیونکہ وہ دونوں ایک نوع ہیں۔ اسی طرح آپ ﷺ نے سونے کو سونے کے عوض ربا قرار دیا (الا یہ کہ وہ مساوی ہو) پھر آپ ﷺ نے سونے کو اس سے کئی گنا زیادہ چاندی کے عوض جائز قرار دیا اس لئے کہ وہ دونوں دو مختلف انواع ہیں۔ جب رسول اللہ ﷺ نے سونے اور چاندی کو دو جنس قرار دیا تو پھر ہم ان دونوں کو کیونکر اکٹھا کر کے ایک جنس بنا سکتے ہیں؟ اسی رائے کو راجح قرار دیتے ہوئے امام ابوعبید کہتے ہیں:

''یہی قول میرے نزدیک احادیث وآثار سے زیادہ قریب اور نظری طور پر زیادہ صحیح ہے۔ اس میں ایک دلیل تو یہی ہے کہ صرافی میں یہ دونوں مختلف جنسیں ہیں اور دوسری دلیل خود

زکوۃ میں بھی ہے، اور وہ اس طرح کہ اگر ایک آدمی کے پاس بغیر درہم کے صرف بیس دینار ہوں اور اس وقت ایک دینار کا بھاؤ نو درہم یا اس سے کم کے برابر ہوتو بھی اس شخص پر زکوۃ واجب ہوگی۔ اگر چہ یہ شخص دوسو دراہم کا مالک نہ ہوگا۔ اسی طرح اگر اس شخص کے پاس دس دینار ہوں اور ایک دینار کی قیمت بیس یا بیس سے زائد درہم کے مساوی ہوتو بھی اس شخص پر زکوۃ واجب نہ ہوگی حالانکہ وہ دوسو درہم یا اس سے زائد کا مالک ہوگا۔۔ ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ ان صورتوں میں درہم کی حیثیت کس طرح ابھر کر سامنے آگئی اور وہ دینار سے بالکل الگ ہوگیا؟ پھر کون سی وجہ ہے کہ دیناروں کو دراہم میں شامل کرلیا جائے؟ اور انہیں اس موقع پر جب وہ بیس سے کم ہوں مال تجارت کی حیثیت دے دی جائے، اور دوسری صورت میں جبکہ وہ پورے بیس ہوں نقدی قرار دیا جائے؟ اس بارے میں میری پوری تائید ابن ابی لیلی، شریک اور حسن کے قول کو حاصل ہے جس کی رو سے یہ دونوں دو جداگانہ مال ہیں جیسے اونٹوں کے ساتھ بھیڑ بکریاں یا گیہوں کے ساتھ کھجور۔ ان میں سے ایک کو بھی دوسری میں داخل نہیں کیا جائے گا" (۲۸)۔

۳- نقدین (درہم و دینار کی کرنسیوں) میں ربا کی علت:

ربا کی تعریف: لغت میں ربا زیادہ کو کہتے ہیں (۲۹)۔

فقہاء کا اتفاق ہے کہ "**الربا هو زيادة أحد البدلين المتجانسين من غير عوض يقابل الزيادة**" یعنی دو ہم جنس تبادلہ کی اشیاء میں بغیر کسی عوض کے زیادتی کرنا۔

ربا کے شرعی اصطلاحی معنی: احناف کے نزدیک اس کی تعریف یہ کی گئی ہے: "**فضل خال عن عوض بمعيار شرعي، مشروط لأحد المتعاقدين في المعاوضة**" (۳۰)۔ شوافع کے یہاں تعریف کے یہ الفاظ ہیں: **بأنه "البيع مع زيادة أحد العوضين عن الآخر في متحد الجنس"** (۳۱)۔

ربا کی قسمیں: ربا کی دو قسمیں ہیں: (۱) ربا النسیئۃ: ہم جنس عوضین میں سے کسی ایک میں ادھار کے مقابل زیادتی کرنا۔ (۲) ربا الفضل: اموال ربا میں ایک جنس کی دو چیزوں کے درمیان ایک ہی مجلس میں قبضہ کے ساتھ ایک کو دوسرے کے عوض زیادہ دینے پر ربا الفضل ہوتا ہے جیسے کہ ایک درہم کو دو درہم کے عوض نقداً بیچنا۔ نیز فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ ربا الفضل صرف ایک جنس میں ہی ہوتا ہے۔

حکم ربا: ربا کتاب وسنت اور اجماع سے حرام ہے قرآن کریم میں ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَأَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا﴾ (۳۲)۔ وعن جابرؓ قال: "لعن رسول الله ﷺ آكل الربا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء" (۳۳)۔ وعن عثمان بن عفانؓ أن رسول الله ﷺ قال: "لا تبيعوا الدينار بالدينارين، ولا الدرهم بالدرهمين" (۳۴)۔

اموال ربا کی منصوص اجناس: حدیث شریف کی نص صریح سے چھ جنسوں میں ربا حرام ہے: [۱] سونا [۲] چاندی [۳] کھجور [۴] گندم [۵] جو [۶] نمک۔

عن عبادة بن الصامتؓ عن النبي ﷺ أنه قال: "الذهب بالذهب مثلا بمثل، والفضة بالفضة مثلا بمثل، والتمر بالتمر مثلا بمثل، والبُر بالبر مثلا بمثل، والملح بالملح مثلا بمثل، والشعير بالشعير مثلا بمثل؛ فمن زاد أو ازداد فقد أربى، بيعوا الذهب بالفضة كيف شئتم يدا بيد، وبيعوا البر بالتمر كيف شئتم يدا بيد، وبيعوا الشعير بالتمر كيف شئتم يدا بيد" (۳۵)۔

ان چھ جنسوں میں ربا کی حرمت پر اجماع ہے (دیکھئے: القرطبی) لیکن کیا ربا صرف ان ہی چھ جنسوں میں منحصر ہے یا وہ اس کے علاوہ دوسری جنسوں میں بھی قیاس کے طریقہ سے علت مشترک کی بنیاد پر جاری ہوگا یا نہیں؟

جمہور فقہاء (خاص طور پر ائمہ اربعہ) کا اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ علت کی بنیاد پر ربا کا حکم دوسری اجناس میں بھی متعدی ہوگا، کیونکہ قیاس شرعی دلیل ہے، اس کے علاوہ ایک حدیث میں اس کی طرف صراحت بھی موجود ہے جسے مالک بن انس اور اسحاق بن ابراہیم نے چھ جنسوں کے اندر ربا کی حرمت والی روایت کے آخر میں یہ زیادہ الفاظ بیان کئے ہیں: "وکذلک کل ما یکال أو یوزن" (۳۶)۔

اس سے یہ واضح ہوگیا کہ یہ حکم دوسری اجناس میں علت مشترک کی بنیاد پر جاری ہوگا، اور صرف چھ اعیان کی تخصیص حدیث میں اس وجہ سے ہے کہ اس زمانہ میں ان ہی کے درمیان لین دین کا عام رواج تھا۔ اس سلسلہ میں ابن حزم الظاہری جمہور سے الگ رائے رکھتے ہیں اور وہ یہ کہ بیع وسلم میں ربا صرف انہی چھ اجناس میں منحصر ہے اور علت کی بنیاد پر اس کا حکم متعدی نہیں ہوگا (۳۷)۔

علت ربا: لیکن جمہور فقہاء اس اتفاق کے باوجود ان چھ اجناس میں علت حرمت میں مختلف آراء رکھتے ہیں، جن میں سے تین مشہور ومعتبر ہیں (۳۸):

پہلی رائے: علت ربا: قدر وجنس ہے (قدر سے مراد مکیلی چیزوں میں کیل اور موزونی چیزوں میں وزن) لقول النبی ﷺ: "وکذلک کل ما یکال ویوزن"۔ نقدین چونکہ موزونی ہیں اسلئے ان میں علت ربا وزن وجنس ہوا۔ یہ قول احناف، مشہور روایت کے مطابق امام احمد، امام زہری، حکم، حماد، ثوری، اوزاعی، نخعیؒ کا ہے۔ علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں: "العلة فی الذهب والفضة: الوزن مع الجنس، فلا تتحقق العلة إلا باجتماع الوصفین" (۳۹)۔ علامہ ابن قدامہ امام احمد کا مذہب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "إن المشهور عن أحمد: أن علة الربا فی الذهب والفضة موزون جنس" (۴۰)۔

اس رائے کا مطلب یہ ہے کہ ربا ہر مکیل وموزون چیز میں اسی کی جنس کے ساتھ تبادلہ

کرنے پر جاری ہوگا چاہے وہ مطعوم ہو یا نہ ہو۔ اس اعتبار سے احناف کا یہ اصول ہے کہ اگر دونوں اوصاف قدر وجنس جمع ہوں، یعنی باہم تبادلہ کی جانے والی دونوں چیزیں مکیلات یا موزونات میں سے ہوں اور ہم جنس بھی ہوں تو کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ کرنا ناجائز ہے اور ادھار معاملہ کرنا بھی ناجائز ہے۔ یہ معاملہ مثلاً بمثل اور یداً بید ہونا چاہئے۔اور اگر ایک وصف موجود ہو یعنی دونوں چیزیں ہم جنس ہو، لیکن کیلی یا وزنی نہ ہوں یا دونوں کیلی یا وزنی ہوں لیکن ہم جنس نہ ہوں تو تفاضل (کمی بیشی کے ساتھ معاملہ کرنا) جائز ہوتا ہے، اور ادھار معاملہ کرنا حرام ہوتا ہے، اور اگر دونوں اوصاف معدوم ہوں یعنی باہم تبادلہ کی جانے والی دونوں چیزیں الگ الگ جنس کی ہوں اور کیلی یا وزنی بھی نہ ہوں تو تفاضل (کمی بیشی کے ساتھ معاملہ کرنا) بھی جائز ہوتا ہے اور ایک طرف سے ادھار معاملہ کرنا بھی جائز ہوتا ہے۔

دوسری رائے: **علت ربا: مطلق ثمنیت** ہے، یہ **قول** (مشہور مذہب کے برخلاف) **مالکیہ** کا ہے اور یہی رائے امام محمد (بیع فلس بفلسین کے مسئلہ میں) امام ابن تیمیہ کی بھی ہے اور نقد میں علت ربا کے بیان میں شیخ خرشی بھی یہی لکھتے ہیں: "**هل علته الثمنية أو مطلق الثمنية؟ ... بأن غلبة الثمنية هو المشهور، ومطلق الثمنية هو خلاف المشهور**"(۴۱)۔ امام ابن تیمیہ مطلق ثمنیت کے بارے میں لکھتے ہیں: "**الأظهر أن العلة في تحريم الربا في الدنانير والدراهم هو الثمنية، لا الوزن**" نیز اس کے بعد اس علت کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں: "**والتعليل بالثمنية تعليل بوصف مناسب ... فان المقصود من الأثمان أن تكون معيارا للأموال، يتوسل بها إلى معرفة مقادير الأموال، ولا يقصد الانتفاع بعينها، فمتى بيع بعضها ببعض إلى أجل قصد بها التجارة التي تناقض مقصود الثمنية، و اشتراط الحلول والتقابض فيها تكميل لمقصودها، ... فإذا صارت الفلوس أثمانا صار فيها المعنى، فلا يباع ثمن**

بثمن إلى أجل"(۴۲)۔

تیسری رائے: علت ربا غلبۂ ثمنیت ہے: شوافع، مالکیہ (مشہور مذہب میں)، امام احمد کے نزدیک (ایک قول میں) نقدین میں علت ربا غلبۂ ثمنیت ہے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں: "أما الذهب والفضة فالعلة عند الشافعيؒ فيهما كونهما جنس الأثمان غالبا، وهذه علة قاصرة عليهما لا تتعداهما، إذ لا توجد في غيرهما"(۴۳)۔

امام غزالی کا بیان ہے: "وعلة الربا في النقدين كونهما جوهري الأثمان" (۴۴)۔

ابن رشد فرماتے ہیں: "العلة في منع التفاضل في الذهب والفضة: هو الصنف الواحد، مع كونهما رؤوسا للأثمان، وقيما للمتلفات، و هذه العلة هي التي تعرف عندهم ـ أي المالكية ـ بالقاصرة؛ لأنهما ليست موجودة عندهم في غير الذهب والفضة، ثم قال: ووافق الشافعي مالكا في علة التفاضل والنساء في الذهب والفضة، أعني أن كونهما رؤوسا للأثمان وقيما للمتلفات، هو عندهم علة منع النسيئة إذا اختلف الصنف، فإذا اتفق منع التفاضل"(۴۵)۔

ابن قدامہ لکھتے ہیں: "أن العلة في الأثمان الثمنية، روى ذلك عن أحمد جماعة"(۴۶)۔

جب کہ طعام میں مالکیہ کے نزدیک علت ربا اقتیات (اصلاح قوت) وادخار (عرف کے مطابق زیادہ مدت تک باقی رہنے کی صلاحیت) ہے۔ اور شوافع کے نزدیک نقدین کے علاوہ میں علت ربا مطعوم ہونا ہے۔

مناقشہ: مذکورہ بالا آراء میں سے پہلی رائے جس کی نمائندگی احناف کرتے ہیں، اس پر شوافع کی طرف سے یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ قدر کی علت ضعیف ہے اس لئے کہ اس سے ہر

موزون چیز کا ان دونوں (سونے چاندی) سے حکم میں الحاق لازم آتا ہے جیسے تانبا، لوہا اور روئی وغیرہ، جب کہ ان دونوں کو ان کے علاوہ کے ساتھ تبادلہ کی شکل بیع سلم میں دینا جائز ہے جس پر اجماع ہے، اگر علت وزن ہوتی تو جائز نہ ہوتا جیسا کہ گیہوں کا جو سے تبادلہ سلم میں ناجائز ہے۔ المجموع میں یہ عبارت آئی ہے: "يجوز إسلام الذهب والفضة في غيرهما من الموزونات بالإجماع، كالحديد وغيره، فلو كان الوزن علة لم يجز، كما لا يجوز إسلام الحنطة في الشعير، والدراهم في الدنانير"۔ دوسرا اشکال امام ابوحنیفہ کے مذہب سے ماخوذ ہے، اور وہ یہ کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ڈھلے ہوئے تانبے، لوہے کو ایک دوسرے کے تبادلہ میں کمی بیشی کے ساتھ بیچنا جائز ہے، اگر علت وزن ہوتی تو جائز نہ ہوتا، اس سلسلہ میں مجموع کی عبارت ہے: "بأن أبا حنيفة جوز بيع المضروب من النحاس والحديد والرصاص بعضه ببعض متفاضلا، ولو كانت العلة الوزن لم يجز" (المجموع ۹/ ۴۴۴)۔ چنانچہ احناف کے نزدیک سونا چاندی حکم میں لوہے اور روئی سے مختلف ہیں جب کہ دونوں میں علت کے دونوں اوصاف (جنس اور وزن) موجود ہیں، احناف کا جواب یہ ہے کہ دونوں ہم جنس نہیں اور متفق قدر بھی الگ ہے، ثمن کا وزن مثمن کے وزن سے جدا ہے، علامہ کاسانیؒ لکھتے ہیں: "بأن المجانسة ظاهرة الانتفاء، وأما القدر المتفق فلأن وزن الثمن يخالف وزن المثمن، ألا ترى أن الدراهم بالمثاقيل؟ والقطن والحديد يوزنان بالقبان، فلم يتفق القدر، فلم توجد العلة، فلا يتحقق الربا" (بدائع الصنائع ۷/ ۳۱۱۳)۔

جہاں تک دوسری رائے کا تعلق ہے: جس کی نمائندگی مالکیہ (خلاف مشہور قول میں)، امام محمد ("بيع فلس بفلسين" میں ان کے مسلک کی روشنی میں) اور امام ابن تیمیہ کرتے ہیں۔ اس کی تائید کرتے ہوئے ڈاکٹر جاشم لکھتے ہیں کہ یہی رائے میرے نزدیک راجح اور قابل

عمل ہے جس میں دونوں کی خوبی پائی جاتی ہے اور وہ علت بننے کی سب سے زیادہ مستحق ہو اس لئے کہ علت کا متعدی ہونا ہی شریعت کے مقاصد میں سے ہے، ان کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

''فهذا الرأی يجمع بين مزيتي الرأين السالفين، وتصلح حجتهما حجة له، فيعتبر الثمنية علة في الذهب والفضة، ولا يقصرها عليهما، بل يعدى حكمهما إلى غيرهما، إذا وجدت فيه علتهما، فلا يحصر تعدية الحكم فيما اقتصر عليه أصحاب الرأی الأول بل يعديه إلى كل ما يصلح أن يكون ثمنا، وتعدية العلة من مقاصد الشرع وحكمته، وإلا لم يعد للتعليل فائدة"(۴۷)، ''ولم يبعد الإمام مالک حين لحظ هذا المعنى فقال: "ولو أن الناس أجازوا بينهم الجلود حتى يكون لها سكة وعين لكرهتها أن تباع بالذهب والورق نظرة" (۴۸)۔

جہاں تک تیسری رائے کا تعلق ہے جس کی نمائندگی شوافع ومالکیہ (مشہور مذہب میں) کرتے ہیں اس پر بھی یہی اعتراض وارد ہوتا ہے جو پہلی رائے پر تھا چونکہ اس رائے میں علت ثمنیت قاصرہ ہے (یعنی صرف سونے وچاندی میں منحصر ہے) متعدیہ نہیں، مجموع میں ہے:

''أما الذهب والفضة فإنه يحرم فيهما الربا لعلة واحدة وهو أنهما من جنس الأثمان،فيحرم الربا فيهما، ولا يحرم في سواهما من الموزونات ... أنه لا يجوز أن يكون تحريم الربا لمعنى يتعداهما إلى غيرهما من الأموال؛ لأنه لو كان لمعنى يتعداهما إلى غيرهما لم يجز إسلامهما فيما سواهما من الأموال؛ لأن كل شيئين جمعتهما علة واحدة في الربا يجوز إسلام أحدهما في الآخر: كالذهب والفضة والحنطة والشعير، فلما جاز إسلام الذهب والفضة في الموزونات والمكيلات وغيرهما من الأموال، دل على: أن العلة فيهما لمعنى لا يتعداهما، وهو أنه جنس الأثمان" (المجموع ۹/۴۴۳)۔

چنانچہ احناف اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہیں: "بأن علتكم قاصرة كما ذكرتم فهي لا تتعدى الذهب والفضة في حين أنهما الأصل الذي استنبطتم منه العلة، وعندكم في العلة وجهان لأصحاب الشافعية:

أحدهما: أنها فاسدة، لا يجوز التعليل بها، لعدم الفائدة منها، فإن حكم الأصل قد عرفناه، وإنما مقصود العلة أن يلحق بالأصل غيره.

ثانيهما: أن العلة القاصرة صحيحة، ولكن المتعدية أولى، قالوا: فعلتكم مردودة على الوجهين؛ لأن حكم الذهب والفضة عرفناه بالنص؛ ولأن علتكم قد توجد ولا حكم، وقد يوجد الحكم ولا علة، كالفلوس بخراسان وغيرهما، فإنها أثمان ولا ربا فيها عندكم، والثاني كأواني الذهب والفضة يحرم الربا فيها، مع أنها ليست أثمانا" (بدائع الصنائع ۳۱۰۶/۷)۔

۴۔فلوس (پیسے) نامی کرنسی اور اس کی شرعی حیثیت فقہاء کے اقوال کی روشنی میں:

لغوی معنی:

فلس جمع فلوس عربی زبان میں پیسے کے معنی میں استعمال ہے، ابن منظورؒ کہتے ہیں:

''الفلس معروف والجمع في القلة أفلس، و فلوس في الكثير ،و أفلس الرجل: صار ذا فلوس بعد أن كا ن ذا دراهم، يفلس أفلاسا: صار مفلسا''(۴۹)۔

یہ لفظ یونانی زبان سے معرب ہے، جس کی اصل (أفلس يا فوليس) ہے، یہ ایتھینی سکہ ہے، کہا جاتا ہے کہ فلس چھوٹا تانبے کا نقد ہے جو چھوٹی چھوٹی اشیاء کے خریدنے کے لئے مستعمل ہوتا ہے، اور یہ مطبوع وغیر مطبوع دونوں طرح مستعمل تھا (۵۰)۔لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کا اطلاق صرف اسی تانبے کے سکہ پر ہوتا ہے بلکہ اس کا اطلاق ہر اس سکہ پر ہوگا جس

نے عرف وقانون میں کرنسی کا درجہ حاصل کرلیا ہو(۵۱)۔

اس سکہ کا استعمال کافی قدیم ہے، امام سیوطیؒ لکھتے ہیں: "التعامل بالفلوس قدیم"(۵۲)۔ اور بعض علماء کے نزدیک یہ عہد اسلامی کی ابتدا ہی سے موجود ہے، اور عرب بھی اس سے لین دین کرتے تھے (دیکھئے: المعجم الاقتصادی ۳۴۵)، لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے بھی فلوس سے معاملہ کیا ہے چونکہ اس سلسلہ میں آپ ﷺ سے کوئی روایت منقول نہیں، جب کہ راجح گمان یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ اسے جانتے تھے لیکن ان سے اس کے ذریعہ تبادلہ کرنا عام نہ تھا (دیکھئے: العملۃ واحکامھا بمجلۃ الشریعۃ، ۲۹۱)، جس کی قوی دلیل مسند احمد کی وہ روایت ہے جسے عبد اللہ بن عبادۃ بن صامتؓ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے: "عن عبد الله بن الصامتؓ أنه كان مع أبي ذرؓ فخرج عطاؤه ومعه جارية له فجعلت تقضي حوائجه قال: ففضل معها سبع قال فأمرها أن تشتري به فلوسا قال: قلت له: لو ادخرته للحاجة تنوبك أو لضيف ينزل بك قال: إن خليلي عهد إليّ أن أيما ذهب أو فضة أوكي عليه فهو جمر على صاحبه حتى يفرغه في سبيل الله عز وجل"(۵۳)۔

اس روایت کے اعتبار سے فلوس کا حکم عروض کا ہے، چونکہ فعل صحابی سے عروض کا ہونا ثابت ہوتا ہے، اور ساتھ میں ان سکوں کا اثمان ہونے کا بھی علم ہوتا ہے۔ اگر اس فعل کے صدور کو عصر رسول میں مان لیا جائے اور حضور کے علم کے بعد تقریر سمجھی جائے تو حدیث کا حکم اختیار کرلے گا، لیکن چونکہ اس میں اس کی تصریح نہیں اس لئے مذہب صحابی کی تو اسے پوری حیثیت حاصل ہے، جب کہ اس کی اسناد بھی صحیح ہے۔

مذکورہ بالا تصریحات سے یہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ فلوس نامی کرنسی کے ذریعہ تبادلہ وتعامل قدیم زمانہ سے ہی ایک حقیقت وامر واقعہ ہے جس سے انکار ناممکن ہے، یہ بھی متفق علیہ ہے کہ یہ

عرفی اصطلاحی اثمان ہیں جن کی ذاتی قیمت ان کی فعلی اسمی قیمت کے برابر نہیں ہوتی، لیکن اس کو ذریعہ تبادلہ کے طور پر استعمال کرنا اور اس کی عام مقبولیت کے ساتھ اس پر لوگوں کو اعتماد کرنا، ان سب چیزوں نے اسے اثمان اور چیزوں کی قیمت اور ذریعہ تبادلہ کی حیثیت عطا کردی جسے فقہاء [الفلوس النافقة یا الفلوس] سے تعبیر کرتے ہیں اور نقد کے اعتبار سے اسے مانتے ہیں، نہایۃ المحتاج میں ہے: ''إن الفلوس لا تدخل في النقد إلا مجازا'' (۵۴)۔

یہ فلوس حقیقت میں آج کی دھاتی اور نوٹوں کی کرنسی سے مماثلت رکھتے ہیں، دونوں ہی تبادلہ کا موثوق ذریعہ ہیں اور دونوں کی اصلی ذاتی قیمت اس کی عرفی اسمی قیمت سے مساوی نہیں ہوتی، اسی وجہ سے فقہاء کرام نے اس کے سلسلہ میں تفصیلی عملی احکام مستنبط کئے ہیں جس کے مباحث بالتفصیل بیوع، صرف، ربا وغیرہ میں ملتے ہیں۔ اس بحث کا بنیادی مقصد موجودہ کاغذی نوٹوں کی کرنسی کے سلسلہ میں حکم شرعی کا تلاش کرنا ہے جو اصل میں فلوس نامی کرنسی کے مماثل ہے، اسی اصل پر قیاس کرکے ہم موجودہ کرنسی کی صحیح حیثیت تک پہنچ سکتے ہیں، اسی لیے اس بحث میں مقیس علیہ کی حقیقت پر فقہا کرام کے اقوال کے تحت مکمل روشنی ڈالی جائے گی تاکہ صحیح حکم تک پہنچنا آسان ہو، وباللہ نستعین۔

فلوس کے سلسلے میں فقہاء کے درمیان محل خلاف کی نشاندہی:

فلوس کے سلسلے میں محل نزاع کی نشاندہی ضروری ہے تاکہ مسئلہ کا سمجھنا آسان ہو، یہ جاننا ضروری ہے کہ فلوس صرف اصطلاح وعرف کی وجہ سے ہی اثمان میں شمار کئے جاتے ہیں اور ان کی اصل حقیقت وذاتی حیثیت سے کوئی خاص معین احکام متعلق نہیں ہوتے، لیکن اختلاف اس صورت میں پیش آتا ہے جب انہیں اثمان وسکہ کرنسی قرار دے دیا جائے، اور اشیاء کی قیمت ہونے میں ذریعہ تبادلہ کے طور پر ان کا استعمال مقبول وعام ہوجائے اور وہ سونے چاندی کی جگہ اختیار کرلیں۔

اگر یہ صورت حال ہوجاتی ہے تو پھر فقہاء کرام قیاس کر کے ان پر نقدین (سونا، چاندی) کے احکام صادر کرنے پر غور کرتے ہیں، چنانچہ اصل مقیس علیہ پر اختلاف واقع ہوجاتا ہے، اور یہ سوال اٹھتا ہے کہ ان پر معلل ہونے کی وجہ سے قیاس درست ہے یا ان پر قیاس کرنا ان کے غیر معلل ہونے کی وجہ سے درست ہی نہیں؟ اگر معلل مان لیا جائے تو پھر ان کے اندر علت ربا کیا ہے جس کی فلوس میں پائے جانے پر بحث ہو؟ کیا یہ جنس ووزن ہے یا مطلق ثمنیت ہے یا خلقی اصلی ذاتی مالی غلبہ ثمنیت ہے جو متعدی نہیں؟ اگر علیت میں فلوس نقدین سے مماثل نہیں تو پھر کیا ان کا شمار سامان تجارت میں ہو؟

اس سلسلے میں فقہاء کے درمیان اختلاف واقع ہوگیا، لہذا بعض نے انہیں نقدین پر قیاس کر کے حکم صادر کیا، جب کہ فلوس کی ثمنیت وقیمت اصطلاحی ہے اور نقدین کی ثمنیت ذاتی، خلقی ہے، جس سے مقیس اور مقیس علیہ میں مخالفت پائی جاتی ہے۔ بعض دوسرے علماء نے انہیں سامان تجارت میں شمار کر کے حکم لگایا جب کہ فلوس مقصد واہمیت میں نقدین سے زیادہ قریب ہیں، اور دونوں اپنے کام میں مکمل مماثل ہیں، پھر آیا اگر انہیں سامان تجارت تسلیم کرلیں تو کیا ان پر ہر حال میں سامان تجارت کا ہی حکم لگے گا چاہے وہ رائج ہوں یا نہ ہوں، چاہے انہیں تجارت کے لئے رکھا گیا ہو یا جمع کرنے کے لئے؟ پھر اگر یہ فلوس (عروض کے حکم میں) اثمان ورأس المال کی مکمل حیثیت اختیار کرلیں تو کیا حکم ہوگا؟ الغرض انہیں نقدین کے حکم میں شمار کیا جائے یا سامان تجارت میں یا کوئی مستقل تیسرا درجہ دیا جائے، اور اس پر قواعد شریعت اور ابواب فقہ میں بیوع وربا وصرف کی روشنی میں از سر نو حکم لگایا جائے؟

اس کے جواب سے پہلے اگر ہم فلوس نامی کرنسی کی حقیقی حیثیت کو بھی پہچان لیں جس کی وجہ سے ہی فقہاء کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے ہیں کہ ان کی حیثیت ذاتی ہے یا اعتباری؟ اسی پر حکم شرعی منحصر ہے۔ فقہاء کے اقوال کی روشنی میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فلوس کی ذاتی کوئی

خاص حیثیت نہیں، اس کو صرف اعتباری حیثیت حاصل ہے۔ جو بعض اعتبارات سے نقدین کی حیثیت وحقیقت سے ملتی ہے اور بعض دوسرے اعتبارات سے سامان تجارت کی حیثیت وحقیقت سے مماثل معلوم ہوتی ہے، ان ہی اعتبارات کی وجہ سے اختلاف ہوا، جس کو مانے اور جانے بغیر مسائل منضبط نہیں ہوسکتے۔ شاید اسی کی طرف امام ابن عابدین نے اشارہ کیا ہے، آپ لکھتے ہیں: ''إن الفلوس لها حكم العروض من وجه، و حكم الثمن من وجه" (۵۵)، اور اسی کو بیان کرتے ہوئے علامہ خرشی یوں رقم طراز ہیں: "إن الفلوس محل التوهم" (الخرشی علی خلیل ۵/ ۵۵ وحاشیۃ الزرقانی علی خلیل ۵/ ۶۰)۔

فلوس کے بارے میں فقہاء کرام کے مذاہب:

مذکورہ بالا محل خلاف کی تحدید کے بعد فقہاء کے اختلاف کو سمجھنا آسان ہوجاتا ہے، اس سلسلے میں ان کی آراء فقہیہ اس طرح ہیں:

مذہب حنفی:

فقہ حنفی کے معتبر مراجع ومآخذ میں فلوس پر دو اعتبار سے حکم ملتا ہے:

☆ ایک اعتبار سے انہیں سامان تجارت میں شامل کرکے حکم لگایا گیا ہے، لہذا ان میں سونا چاندی کی طرح ربا وصرف کے احکام جاری نہ ہوں گے۔ اس سلسلے میں ان کی عبارت اس طرح ہے: ''فيجوز بيع الفلس بالفلسين بأعيانهما عند أبي حنيفة، و أبي يوسفؒ'' لأنهما بالتعيين أبطلا الثمنية، فأصبحت كالعروض، فيجوز التفاضل فيها حينئذ، وخالف محمد بن الحسن في ذلك فقال: بعدم الجواز لعدم إسقاط ثمنيتها، باعتبارها رائجة، فهي ثمن بالاصطلاح، فليس للمتعاقدين تعيينهما" (۵۶)۔

علامہ کاسانی ایک فلس کو دو فلس کے بدلہ میں بیچنے کے جواز کی علت بیان کرتے ہوئے

فرماتے ہیں: "بأنه مما يباع عددا، والعدد ليس من أوصاف علة الربا ...... ويجوز بيع المذروعات والمعدودات المتفاوتة واحدا باثنين يدا بيد كبيع ثوب بثوبين نحو ذلک بالإجماع، اس کے بعد مزید فرماتے ہیں: "يجوز بيع المعدودات المتقاربة من غير المطعومات بجنسها متفاضلا عند أبي حنيفة وأبي يوسف بعد أن يكون يداً بيد كبيع الفلس بالفلسين بأعيانهما، وعند محمد لا يجوز، لأن الفلوس أثمان، فلا يجوز بيعها بجنسها متفاضلا كالدراهم والدنانير"(۵۷)۔

سرخسیؒ فرماتے ہیں: "وإذا اشترى فلوسا بدراهم ونقد الثمن ولم تكن الفلوس عند البائع، فالبيع جائز بأن الفلوس الرائجة ثمن كالنقود"(۵۸)۔

☆ دوسرے اعتبار سے انہیں نقود کی عرفی اصطلاحی حیثیت دیکر حکم لگایا گیا ہے جس کی رو سے ان پر بھی دراہم و دنانیر کی طرح احکام ربا وصرف جاری ہوں گے، چنانچہ اس سلسلہ میں علامہ سرخسی فلس کی بیع فلسین کے بارے میں لکھتے ہیں: "أن يبيع فلسا بغير عينه بفلسين بغير أعيانهما لا يجوز لأن الفلوس الرائجة أمثال متساوية قطعا لاصطلاح الناس على سقوط قيمة الجودة فيها فيكون أحد الفلسين فضلا خاليا عن العوض مشروطا في البيع، وذلک هو الربا بعينه، وإن باع فلسا بعينه بفلسين بغير أعيانهما لم يجز أيضا، فأما إذا باع فلسا بعينه بفلسين بأعيانهما يجوز في قول أبي يوسف، وهو قول أبي حنيفةؒ، ولا يجوز في قول محمدؒ، وهذا ينبني على أن الفلوس لا تتعين بالتعيين ما دامت رائجة عند محمد وعلى قولهما تتعين بالتعيين إذا قوبلت بجنسهما"۔

امام سرخسیؒ فلوس میں صفت ثمنیت اور اصطلاحی ثمنیت کے اشکال کو دفع کرتے ہوئے

فرماتے ہیں:

"إن صفة الثمنية فی الفلوس لیست بصفة لازمة، ولا هو ثابت بأصل الخلقة، بل بعارض اصطلاح الناس والعاقد أن قصد تصحیح العقد، ولا وجه لتصحیح العقد إلا بأن تتعین الفلوس، وتخرج من أن تکون رائجة ثمنا فی حقهما فیجعل کأنهما أعرضا عن ذلک الاصطلاح"۔

اور اصطلاحی ثمنیت کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں: "والدلیل علی أن معنی الثمنیة فی الفلوس بالاصطلاح أنه یصلح ثمن الخسیس من الأشیاء دون النفیس، وأنه یروج بعض الأشیاء دون البعض، ویروج فی بعض المواضع دون البعض بخلاف الذهب والفضة" (۵۹)۔

لیکن اگر فلوس سے رائجہ کی صفت ختم ہوجائے اور کاسدہ بن جائیں تو پھر وہ سامان کی حیثیت اختیار کرلیتے ہیں: "أما إن کانت کاسدة فهی مبیعة، لا یصح العقد علیها ما لم تتعین، لأنها سلع" (۶۰)۔

لیکن ماوراء النہر کے احناف غطارفہ (وہ دراہم جن کی نسبت غطریف بن عطاء الکندی، خراسان کے حاکم کی طرف ہے جو رشید کے عہد میں تھا، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ رشید کے ماموں تھے) اور عدالی (عدل کی طرف یا اس نام کے بادشاہ کی طرف منسوب دراہم) نامی کرنسی میں تفاضل کے ساتھ بیع کے جواز کے قائل نہیں تاکہ ربا کا باب بند ہوجائے۔

ابن ہمامؒ لکھتے ہیں: "إن مشایخ ماوراء النهر من بخاری وسمرقند لم یفتوا بجواز ذلک، أی بیعها بجنسها متفاضلا فی العدالی والغطارفة، مع أن الغش فیها أکثر من الفضة، لأنها أعز الأموال فی دیارنا، فلو أبیح التفاضل فیها ینفتح باب الربا الصریح، فإن الناس حینئذ یعتادون التفاضل فی الأموال

النفيسة، فيتدرجون إلى ذلك في النقود الخاصة، فمنع ذلك حسما لمادة الفساد'' (شرح فتح القدیر ۵/ ۳۸۲، نیز دیکھئے: رد المحتار علی الدر ۴/ ۱۸۳-۱۸۴)۔

مذہب مالکی:

مالکیہ کے نزدیک بھی فلوس کا حکم دو حالتوں یا دو اعتبارات پر مبنی ہے:

☆ پہلی حالت یا اعتبار اول: یہ کرنسی کی حیثیت سے دراہم ودنانیر سے مشابہ ہیں چونکہ یہ اپنی اصل سے نکل کر نقدین کے کام کے طور پر مستعمل ہوتے ہیں اور لوگوں نے کرنسی کی شکل میں اسے ذریعہ تبادلہ کے طور پر استعمال کرنا شروع کردیا ہے، اسی لئے ربا، صرف، اور بیع کے ابواب میں ان کا حکم دراہم ودنانیر کی طرح ہوگا، لیکن اس میں حکم کراہت کا ہوگا نہ کہ حرمت کا، دلیل نہ ہونے کی وجہ سے اور چونکہ یہ ہر طرح سے دراہم ودنانیر سے مماثل نہیں ہوتے۔ چنانچہ ہم جنس سے تبادلہ کی حالت میں ادھار یا کمی زیادتی کے ساتھ خرید وفروخت مکروہ ہے۔ المدونۃ الکبری میں ہے:

قال مالک: ''لا يصلح الفلوس بالفلوس جزافا، ولا وزنا مثلا بمثل، ولا كيلا مثلا بمثل، يدا بيد، ولا الى أجل، والفلوس ها هنا في العدد بمنزلة الدراهم والدنانير في الورق، وقال مالک: أكره ذلک في الفلوس، ولا أراه حراما كتحريم الدنانير والدراهم، وسئل ابن القاسم: أرأيت أن اشتريت فلسا بفلسين أ يجوز هذا عند مالک؟ قال: لا فلسا بفلسين وسئل عن مراطلة الفلوس بالنحاس واحدا باثنين، يدا بيد؟ قال: لا خير في ذلک'' امام مالک کے اس قول کی تعلیل بیان کرتے ہوئے ابن القاسم کہتے ہیں: '' لأن الفلوس لا تباع الا عددا، فاذا باعها وزنا كان من وجه المخاطرة، فلا يجوز بيع الفلوس جزافا، فلذلک

کرہ مالک رطل الفلوس برطلین من النحاس، اسی پر تخریج کرتے ہوئے کہتے ہیں: ولو اشتری رجل رطل فلوس بدرهم لا یجز ذلک، مزید لکھتے ہیں: سألت مالکا عن الفلوس تباع بالدراهم والدنانیر نَظِرَةً، أی مؤجلة، أو یباع الفلس بالفلسین، فقال مالک: إنی أکره ذلک وما أراه مثل الذهب والورق فی الکراهیة" (المدونۃ الجلد الاول ۴/ ۹۴ والجلد الرابع ۹/ ۱۱۵)۔

بیع سلم اور فلوس: مدونہ میں ہے: فیمن أسلم فلوسا فی طعام؟ قال مالک: لا بأس به، وکذا فی إسلام الطعام فی الفلوس، ثم قال: فإن أسلم دراهم فی فلوس، قال مالک: لا یصلح ذلک، وکذلک الدنانیر إذا أسلمها فی الفلوس، وکذلک لو باع فلوسا بدراهم إلی أجل، وبدنانیر إلی أجل، ذلک لا یصلح"، اس کی تعلیل یہ بیان کی کہ: "بأن الفلوس عین، ولأن هذا صرف،... قال مالک: لا یصلح السلم فی الفلوس" (المدونۃ الجلد الرابع ۹/ ۲۰)۔

☆ دوسری حالت یا اعتبار ثانی: یہ اس اعتبار سے سامان تجارت سے مشابہ ہیں، اس لئے ان میں زکاۃ نہیں، یہی مالکیہ کا مشہور مذہب ہے، ہاں اگر انہیں ارادۂ تجارت کی غرض سے لیا گیا ہے تو پھر ان پر سامان تجارت کی زکاۃ لازم آئے گی چاہے ڈھلے ہوں یا نہ ہوں، اس حالت کے اعتبار سے فلوس ان کے نزدیک اموال ربویہ میں نہیں۔ اسی وجہ سے سامان تجارت کی طرح ان کی قیمت پر زکاۃ ہوگی نہ کہ عین پر، اور اگر تجارت کے لئے نہ ہوں تو ان پر زکاۃ نہیں (دیکھئے: مرجع سابق)۔

مذہب شافعی:

صحیح قول کے مطابق شوافع کے یہاں فلوس میں مطلقاً ربا نہیں ہے چاہے رائج ہوں یا

نہ ہوں، امام شافعیؒ فرماتے ہیں: "لا بأس في السلف بالفلوس إلى أجل؛ لأن ذلک ليس مما فيه ربا" (۶۱)۔

مذہب حنبلی:

فلوس کے سلسلہ میں حنابلہ کے یہاں دو موقف ہیں:

پہلا موقف: یہ ہے کہ وہ اموال ربا میں سے نہیں ہیں چاہے رائج ہوں یا نہ ہوں اس لئے کہ وہ نہ مکیلات میں سے ہیں اور نہ ہی موزونات میں سے۔

دوسرا موقف: یہ ہے کہ ان میں بھی ربا پایا جاتا ہے اس لئے ایک فلس دو فلس کے عوض نہیں بیچا جاسکتا۔ (۶۲)

۵-موجودہ زیر بحث کاغذی کرنسی (العملة الورقية Paper Money) اور فقہاء کرام:

جیسا کہ شروع ہی میں ہم کاغذی کرنسی کی حقیقت وامتداد پر روشنی ڈال چکے کہ اب یہ محض اصطلاحی کرنسی ہے جس کی اسمی قانونی قیمت کا دراصل اس کی حقیقی مادی سونے چاندی کی قیمت سے کوئی تعلق ہی نہیں، اسی لئے معاصر فقہاء کرام اس کرنسی کی تخریج کئی چیزوں پر کرتے ہیں جنہیں ہم مندرجہ ذیل سطور میں پیش کرتے ہیں:

تخریج اول: یہ کاغذی کرنسی قرض کی معتمد تحریری تصدیق ہے۔ (سندات دین): اس کا مطلب ہے کہ اس کے حامل کو اس کی حقیقی سونے چاندی کی شکل میں قیمت اس کے طلب کرنے پر ادا کی جائے گی، جیسا کہ پہلے تھا، اس صورت میں یہ بذات خود کوئی مال نہیں، بلکہ یہ صرف رسید کے مانند ہیں، انہیں دکھا کر اس کی حقیقی قیمت کا مال حاصل کیا جاسکتا ہے، اس اعتبار سے یہ حوالہ کے حکم میں ہوگا اور اس پر حوالہ کے سارے احکام جاری ہوں گے (۶۳)۔

اس کی نظیر سفتجہ ہے جس کی صورت یہ ہوتی تھی: "أن يدفع إلى تاجر مالا قراضا

إلی صدیقه، وإنما یدفعه قرضا لا أمانة لیستفید به سقوط خطر الطریق، فکأنه أحال الخطر المتوقع علی المستقرض، فکان فی معنی الحوالة وقیل فی صورتها أیضا هی کتاب صاحب المال لوکیله أن یدفع مالا قرضا یأمن به من خطر الطریق"(۶۴)۔

اس کاغذی کرنسی کو قرض کی تصدیق ماننے سے بہت سے آثار مرتب ہوں گے جن میں سے چند یہ ہیں:

(۱) سونے چاندی کی خرید وفروخت ناجائز ہوگی چونکہ دین ہے جس سے مجلس میں قبضہ کی شرط نہیں پائی جائے گی۔

(۲) زکاۃ میں اس کو دینا اس وقت تک درست نہ ہوگا جب تک کہ مستحق اس کی حقیقی قیمت حاصل کر کے اس پر قابض نہ ہو جائے۔

(۳) یہ بیع سلم میں راس المال نہیں بن سکتے؛ چونکہ اس سے بیع الکالی بالکالی لازم آئے گی جو جائز نہیں۔

(۴) کسی اموال کی کمپنی میں راس المال نہیں ہوسکتے چونکہ اس کا عین ہونا ضروری ہے اور یہاں وہ مفقود ہے۔

(۵) اس کی زکاۃ دین کی زکاۃ کے حکم میں ہوگی۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے: مجلة الشریعة/۱۱/۳ومابعدھا)۔

لیکن کرنسی نوٹوں کو وثیقہء دین قرار نہیں دیا جاسکتا جسے عام طور سے قدیم فقہاء ذکر کرتے ہیں بلکہ وہ تو ایسی کرنسی کا نام ہے جس کے ذریعہ تمام چیزوں کا تبادلہ کسی سے کسی وقت بھی ہوسکتا ہے چنانچہ وہ وثیقہء دین نہیں ہوسکتا بلکہ نقدین ہی کی طرح اثمان ہیں جیسا کہ شیخ محمد حسنین مخلوف فرماتے ہیں: "فإن حالة الدین المضمون بهذه الأوراق لا تتفق تماما مع

الاعتبارات الفقهية التي تراعي في با ب الدين، لأن الدين ليس في ذمة معينة حقيقية، ولا روعي في تحرير سنده أن يكون لشخص معين، ولكن مسألة الزكوة شيئ وتحرير سند الدين وتقريره في ذمة معينة شيئ آخر، ولا نزا ع في أن صاحب الورقة مالک لنصاب حال عليه حول يمكنه أن يقبضه نقدا ذهبا أو فضة في أي وقت شاء، ومن أي شخص كان، و أن يستبدل به مقوما، أو يهبه، أو يتصدق به على شخص آخر بواسطة هذه الورقة التي يعتبر وصولها إلى يد أخرى حوالة على المصرف الذي أصدرها أصالة، بحيث إذا قدمت إليه أو إلى من أنابه عنه لزمه قبولها، و دفع قيمتها كمبادلة النقدين سواء''(۶۵)۔

دوسرے اعتبار سے دین کا تحریری تصدیق نامہ صرف وثیقہ کی حیثیت رکھتا ہے جب کہ کاغذ کے نوٹ کرنسی ہیں جو اصطلاحی طور پر اثمان ہیں، اسی طرح دین نامی نہیں جب کہ کاغذی کرنسی نامی و رائج ہوتی ہے۔ ان سب وجوہات کی بنیاد پر کاغذی نوٹوں کی کرنسی کو وثیقہ دین قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہی فیصلہ مختلف فقہی اکیڈمیاں بھی کرچکی ہیں، مثال کے طور پر اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا (۶۶)۔

تخریج دوم: یہ فلوس کی نظیر ہیں جس کی تفصیل گذر چکی ہے، اسی پر بہت سے معاصرین فقہاء وعلماء نے تخریج کی ہے جس کی وجہ سے اس کے حکم میں بھی وہی اختلاف رونما ہوا جو فلوس کے حکم میں گذر چکا ہے، چونکہ یہ فلوس کا حکم علت ربا کے تعین پر مبنی تھا۔ چنانچہ نوٹوں کی کرنسی کو فلوس پر قیاس کرتے ہوئے فقہ حنفی کی نمائندگی کرتے ہوئے مفتی زید صاحب نے کہا'' غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ فلوس و کرنسی کو نقود کی طرح ثمن اوران کے قائم مقام ہیں لیکن من کل الوجوہ نہیں بلکہ من بعض الوجوہ اسی لئے ان کی بیع، بیع صرف نہیں کہلاتی اور یہ دونوں ہی امر فقہاء سے ثابت ہیں: ”لأن الفلوس الرائجة ثمن كالنقود وبيع الفلوس

بالدراهم لیس بصرف'' (مبسوط ۱۴/۲۴)، خلاصہ کلام یہ کہ مختلف کرنسیوں میں علت قدریہ من وجہ موجود من وجہ مفقود ہے، لہٰذا دونوں جہت کے لحاظ سے ایک جانب میں نقد ہونا شرط اور دوسری جانب میں ہونا شرط نہیں البتہ جانبین میں ادھار ہوتو ناجائز ہے، اور ایک ملک کی کرنسیوں میں اس ایک جہت کا لحاظ کر کے تفاضل اس واسطے جائز نہیں کہ ایک ہی ملک کی کرنسیاں باہم امثال مساویہ ہیں برخلاف مختلف ممالک کی کرنسیوں کے کہ وہ امثال مساویہ نہیں بلکہ متفاوتہ ہیں لہٰذا ایک ہی ملک کی کرنسی جو مختلف الاجناس ہو مثلاً ایک طرف گلٹ کے دو روپے دوسری طرف کاغذ کا ایک نوٹ کو مختلف الاجناس ہیں پھر بھی ان میں تفاضل جائز نہ ہوگا؛ کیوں کہ یہ امثال مساویہ ہیں۔ اس کے برخلاف دوسرے ممالک کی کرنسیاں گو بظاہر صورۃ متحد الجنس ہوں لیکن امثال متفاوتہ ہونے کی وجہ سے باہم تفاضل جائز ہوگا'' (مجلہ فقہ اسلامی ص/۵۵-۵۸، مقالات سمینار ۹-۱۱/اگست ۱۹۹۱ء)۔

جیسا کہ معلوم ہے کہ علت ربا کی بنیاد پر ہی فلوس کے حکم میں اختلاف پیدا ہوا ہے، اور بقول مولانا عتیق صاحب ''فقہاء اربعہ سے منقول ومصرح علت ربا کی روشنی میں جب کاغذی نوٹوں کا جائزہ لیتے ہیں تو واضح ہوتا ہے کہ یہاں کسی کی بیان کردہ علت ربا موجود نہیں ہے... ائمہ اربعہ کے نزدیک ربا کی جو علت ہے اس کی روشنی میں میرے خیال میں کرنسی نوٹ اموال ربویہ کے دائرہ میں نہیں آتے ---فقہ حنفی کے اصول ربا کے اعتبار سے ایک ملک کی کرنسی کا تبادلہ اسی ملک کی کرنسی کے ساتھ کمی بیشی کے ساتھ جب کی عوضین افراد متعین جائز ہونا چاہئے بشرطیکہ یہ معاملہ نقد ہو ادھار نہ ہو... دو ملک کی کرنسیاں دو جنس ہیں لہٰذا جنسیت کا وصف مفقود ہوا اور قدریت کا نہ ہونا تو ظاہر ہے، اور دونوں اوصاف کے معدوم ہونے کی صورت میں تفاضل اور نساً دونوں جائز ہوتا ہے ہاں اس بات کا خیال ضروری ہے کہ عوضین میں سے دونوں ادھار نہ ہوں بلکہ کم از کم ایک نقد ضرور ہوتا کہ ''بیع الکالئ بالکالئ' لازم نہ آئے'' (مرجع سابق) جو حرام ہے۔

لیکن علت ربا کی علت مطلق ثمنیت متعدیہ کے نمائندے اگرچہ قدیم زمانہ میں کم تھے لیکن عصر حاضر کی کرنسی کی صورت حال اور منتشر ربا کے مختلف رائج طریقوں کی روشنی میں اکثر مجامع فقہیہ اور معاصر علماء نے اسی رائے کو علت ربا تسلیم کر کے نوٹوں کی کرنسی پر شرعی حکم صادر کیا ہے، اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے دوسرے سیمینار منعقدہ ۸ تا ۱۱ / دسمبر ۱۹۸۹ء میں کرنسی نوٹ سے متعلق یہ فیصلہ کیا کہ: ''عصر حاضر میں نوٹوں نے ذریعہ تبادلہ ہونے میں مکمل طور پر زر خلقی (سونا چاندی) کی جگہ لے لی ہے اور باہمی لین دین نوٹوں کے ذریعہ انجام پاتا ہے اس لئے کرنسی نوٹ بھی احکام میں ثمن حقیقی کے مشابہ ہیں۔ لہذا ایک ملک کی کرنسی کا تبادلہ اسی ملک کی کرنسی سے کمی بیشی کے ساتھ نہ تو نقد جائز ہے نہ ادھار''۔ اسی میں تیسری دفعہ تھی کہ: ''دو ملکوں کی کرنسیاں دو اجناس ہیں اس لئے ایک ملک کی کرنسی کا تبادلہ دوسرے ملک کی کرنسی سے کمی بیشی کے ساتھ حسب رضائے فریقین جائز ہے'' (نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے ص/ ۱۲۲)۔ اور رابطۂ عالم اسلامی کے المجمع الفقہی نے ۸ تا ۱۶ / ربیع الآخر ۱۴۰۲ھ مکہ مکرمہ میں منعقدہ سیمینار میں بھی یہی فیصلہ کیا ہے (دیکھئے: روداد سیمینار)۔ یہی رائے ڈاکٹر جاسم کی بھی ہے (دیکھئے: مجلۃ الشریعہ/ ۳۱۷)۔

تخریج سوم: یہ کاغذ و نوٹ کی نظیر ہیں۔ جنہیں بعض قرض کا وثیقہ تسلیم کرتے ہیں پھر اس پر وہ سارے احکام منطبق ہوتے ہیں جو تخریج اول میں گذرے، اور بعض علماء انہیں عروض تجارت کی نظیر مانتے ہیں (۶۷)۔

۶ - رائے راجح اور نتائج بحث:

سابقہ تفصیل سے یہ بات واضح ہے کہ موجودہ حالات میں علت ربا: مطلق ثمنیت قرار دینا زیادہ قابل عمل اور مقاصد شریعت سے زیادہ قریب تر ہے ورنہ ربا کا دروازہ کھل جائے گا اور فقراء و مساکین اور ضرورت مندوں کا حق ضائع ہوگا۔ اسی وجہ سے اکثر فقہی مجامع نے اسی رائے کو اختیار کیا ہے، کاغذی کرنسی کو موجودہ عالمی قانونی کرنسی ہونے کے ساتھ ذریعہ تبادلہ کی

عمومی مقبولیت کی وجہ سے اسے وثیقہ دین قرار نہیں دیا جاسکتا، اسی طرح سے وہ ہر طرح کے معاملات میں مستعمل ہونے کی وجہ سے ثمنیت میں فلوس سے زیادہ قوی ہے اگر چہ فلوس اپنی اصلی دھات کی قیمت میں اس سے زیادہ قیمتی ہوتا تھا چونکہ اگر اس کاغذی کرنسی کی عرفی اصطلاحی قانونی قیمت ختم ہوجائے تو صرف کاغذ کی کیا قیمت واعتبار ذاتی ہے؟ لیکن قانونی عرفی حیثیت کی وجہ سے وہ دراہم ودنانیر سے ثمنیت کی علت میں مشترک ہے جب کہ سونے چاندی نقد ہونے میں اصلی وخلقی قیمت کے حامل ہیں اور کاغذی کرنسی کا ان سے کوئی مقابلہ نہیں، اگر ان کا اعتبار ختم ہوجائے تو اشتراک علت بھی ختم ہوجائے گا، اس کے ختم ہونے سے حکم بھی بدل جائے گا، اور جیسا کہ شروع میں ہم بتاچکے ہیں کہ اس کاغذی کرنسی کا شروع میں تو اس کی اصل سونے یا چاندی سے تعلق تھا لیکن آہستہ آہستہ اس کاغذ کا اب سونے یا چاندی سے کوئی ربط نہیں رہا، لہذا کاغذی نوٹ مستقل بالذات ایک الگ کرنسی ہے جو ذریعہ تبادلہ ہونے میں سونے چاندی کے دراہم ودنانیر کے قائم مقام ہے لیکن وہ ان کی جنس سے نہیں، اسی وجہ سے کرنسی کا اتار چڑھاؤ آئے دن کا مشغلہ ہوگیا ہے جس سے اصل رأس المال کی قیمت بھی خطرہ میں پڑجاتی ہے، اور جب تک اسے سونے یا چاندی سے نہیں جوڑا جائے گا کرنسی کے اتار چڑھاؤ کا کھیل ختم نہ ہوگا جس کی وجہ سے عالمی معاشیات بھی خطرہ سے دوچار ہوجاتی ہیں، اس سلسلہ میں کچھ آوازیں اٹھ رہی ہیں لیکن اس وقت کے عالمی تناظر میں کافی دقت طلب امر ہے، فی الحال کاغذی کرنسی کو قانونی طور پر ثمن کی حیثیت حاصل ہے اور یہی رائے اس بحث سے بھی ثابت ہوتی ہے نیز اسی پر بہت سے مجامع علمیہ وفقہیہ نے بھی قرارداد پاس کی ہیں۔

مذکورہ تفصیل کے نتیجہ میں بحث مندرجہ ذیل نتائج پر پہونچی کہ:

۱- ان کاغذی نوٹوں کی زکاۃ فرض ہوجائے گی جب ان میں نقدین کی زکاۃ کی شرطیں پائی جائیں۔

۲- ان کاغذی نوٹوں میں ربا وصرف کے احکام جاری ہوں گے۔

۳-ایک ملک کی کاغذی کرنسی ایک جنس شمار ہوگی۔

۴-ہر ملک کی کرنسی الگ جنس شمار ہوگی، اس طرح دو یا دو سے زیادہ ملکوں کی کاغذی کرنسیاں مختلف جنسیں ہیں۔

موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت کے ضمن میں سوالنامہ کا جواب یہ ہے:

چونکہ یہ بات تو یقین کے درجہ میں امر واقع ہے کہ اس کاغذ کو وثیقہ ثمن ماننے کو نہ تو کوئی بنک تیار ہے اور نہ ہی کوئی ملک، اور نہ ہی کوئی بینک اس کی اصل قیمت کی چاندی یا سونا دینے کو تیار ہے، تو پھر اس کی حقیقی قدر کے لئے کوئی پیمانہ بھلا کیسے ممکن ہے، لہذا ماہرین معاشیات کی طرف سے مقرر کردہ اندازہ پر مبنی اشاریہ بھی کرنسی کے اتار چڑھاؤ کی طرح غیر مستقر ہوگا اس لئے اسے معیار قرار نہیں دیا جاسکتا؛ جب کہ سونے اور چاندی کی قیمتوں میں ایک حد تک استحکام ہوتا ہے اس لئے طویل الامد یا مؤخر مطالبوں مثلاً قرض، مہر، پنشن، ادھار خریداری کی رقم اور وقت پر ادا نہ ہونے والی تنخواہوں کی ادائیگی سونے چاندی کی قیمتوں کے ذریعہ عمل میں لائی جائیں تو اصل رأس المال کی حفاظت ممکن ہے، لہذا نوٹوں کی شکل میں قرض دیتے وقت یا مہر کے تقرر کے وقت یا ادھار فروختگی کے وقت طرفین واجب الادا نوٹ کی مالیت سونے یا چاندی میں طے کرلیں اور بوقت ادائیگی اسی قدر سونے یا چاندی کی قیمت کے مساوی نوٹوں کی ادائیگی عمل میں آئے تو جائز ہوگا۔

جب کہ اس طرح کے تعاملات میں کرنسی کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنا عدم انضباط، اور عوام کے درمیان باہمی مستقل تنازعہ کا موجب ہوگا، نیز اس طرح سو روپے کے بدلے پانچ سو روپے کی ادائیگی باب ربا کو کھولنے کا ذریعہ بنے گی۔ واللہ اعلم بالصواب

۷- حواشی ومراجع:

〈۱〉 مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: Davies, Glyn (1996), "A history of money from ancient times to the present day", University of Wales Press, U.K., (PP. 1-50.].

〈۲〉 ملاحظہ ہو: النقود الالکترونیة،ماهیتها، مخاطرها وتنظیمها القانونی للدکتور محمد ابراهیم محمود الشافعی،مجلة الامن والقانون، دبی، السنة الثانیة عشر،العدد الاول، ینایر ۲۰۰۴م۔

〈۳〉 لسان العرب والقاموس المحیط مادة: نقد۔

〈۴〉 مغنی المحتاج ۱/ ۳۸۹۔

〈۵〉 الموجز فی النقود والبنوک للدکتور أحمد عبده محمود، دار المعارف مصر ۱۹۶۸،ص: ۱۸، والنظریة النقدیة للدکتور حازم الببلاوی،ص: ۱۱ مطبوعات جامعة الکویت ۱۹۷۱،وأصول الاقتصاد للدکتور أحمد أبواسماعیل،ص/ ۴۸۹،دار التألیف مصر ۱۹۶۶۔

〈۶〉 الموجز فی النقود والبنوک للدکتور أحمد عبده محمود، دار المعارف مصر ۱۹۶۸)۔

〈۷〉 تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: (الموجز فی النقود والبنوک للدکتور أحمد عبده،ص: ۸ وما بعدها، و النظریة النقدیة للدکتور حازم الببلاوی،ص: ۳۸ وما بعدہا، وأصول الاقتصاد للدکتور أحمد أبو اسماعیل ۴۹۳ وما بعدها)۔

〈۸〉 العملة وأحکامها فی الفقه الاسلامی للدکتور عجیل جاسم النشمی ،مجلة الشریعة،ص: ۲۷۰۔

(۹) فتوح البلدان للامام أبی الحسن البلاذری،ص: ۴۵۲ - ۴۵۳،طبع دار الکتب العلمیة ،بیروت، ۱۳۹۸ھ- ۱۹۷۸ء- مزید تفصیل کے لئے دیکھیں: (الأحکام السلطانیة للماوردی، ص: ۱۴۸،عیسی الحلبی مصر الطبعة الثانیة،۱۳۹۶ھ- ۱۹۶۶ء، ومعالم السنن لأبی سلیمان الخطابی، تحقیق: محمد الفقی ۵/ ۴۳،طبع دار المعرفة ،بیروت ۱۴۰۰ھ-۱۹۸۰ء)۔

(۱۰) العملة وأحکامها فی الشریعة الإسلامیة، للدکتور عجیل جاسم، مجلة الشریعة

کویت، عدد ۱۱، ۱۹۸۸ء۔

(۱۱) سنن أبي داؤد [مع شرحہ عون المعبود] ۲۲۴/۶، رقم الحدیث: ۳۳۴۸، واللفظ لہ، کتاب البیوع، باب قول النبي ﷺ: المکیال...، وسنن النسائي برقم: ۲۵۱۹ و۴۶۰۸۔

(۱۲) الاحکام السلطانیۃ للماوردي اردو، ص: ۳۴۵۔ ۳۴۷۔

(۱۳) الاحکام السلطانیۃ للماوردي، اردو ترجمہ، ص: ۳۴۸۔

(۱۴) عون المعبود شرح سنن أبي داؤد ۲۲۵/۶ والحاوي للفتاوي للعلامۃ جلال الدین السیوطي ۱/ ۱۰۲، دار الفکر بیروت، والفتح الرباني لترتیب مسند الامام أحمد بن حنبل للشیخ عبد الرحمن البنا ۸/ ۲۴۶، الطبعۃ الأولی ۱۳۵۶ھ، والمجموع شرح المھذب لأبي زکریا النووي ۱۹/۶۔

(۱۵) المصباح المنیر للعلامۃ الفیومي۔

(۱۶) التمھید لابن عبد البر۔

(۱۷) فتوح البلدان للبلاذري، ص: ۴۵۳۔

(۱۸) الأموال لأبي عبید، ص: ۵۲۰۔

(۱۹) العملۃ وأحکامھا في الفقہ الاسلامي للدکتور جمیل جاشم النشمي، مجلۃ الشریعۃ، ص: ۲۷۳۔

(۲۰) الاحکام السلطانیۃ للماوردي ۱۰۲/۱۔

(۲۱) الاحکام السلطانیۃ للعلامۃ ابي الحسن الماوردي، ترجمہ: مفتی انتظام اللہ شہابی۔ قرآن محل کراچی، ص: ۳۴۶، امام بلاذریؒ نے بھی درہم کے اس اختلاف کو ذکر کیا ہے، دیکھئے: فتوح البلدان ۴۵۱۔

(۲۲) الأموال لأبي عبید/ ۵۲۰۔

(۲۳) کتاب الاموال ۲/ ۲۸۷۔ ۲۸۹ الامام ابو عبید القاسم بن سلام، ترجمہ: عبد الرحمن طاہر سورتی، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، طباعت کی تاریخ کتاب میں موجود نہیں۔

(۲۴) مقدمۃ ابن خلدون تحقیق الدکتور علی عبد الواحد ۱۱/۲، مطبعۃ لجنۃ البیان مصر، الطبعۃ الثانیۃ ۱۳۸۴ھ۔

(۲۵) دیکھئے: الخراج والنظم المالیۃ للدولۃ الاسلامیۃ للدکتور محمد ضیاء الدین الریس ص: ۳۴۰ وما بعدھا، الطبعۃ الثالثۃ ۱۹۶۹ء مصر، فقہ الزکاۃ للدکتور یوسف القرضاوی ۱/ ۲۵۹، الطبعۃ الثالثۃ ۱۹۷۷ء، النظم الاسلامیۃ للدکتور صبحی الصالح ص: ۴۲۷، دار العلم للملایین بیروت ۱۹۸۰ء۔

(۲۶) دیکھئے: زکاۃ النقود والورقیۃ المعاصرۃ للدکتور محمود الخالدی، ص: ۱۵۱، مکتبۃ الرسالۃ، ۱۹۸۵ء، ڈاکٹر یوسف القرضاوی نے ان کی آراء کا مناقشہ ومؤاخذہ کیا ہے دیکھئے: فقہ الزکاۃ ۱/ ۲۵۷۔

(۲۷) الاموال اردو، ۲/ ۱۵۹۔ دینار و درہم کی زکاۃ کے نصاب کے سلسلے میں کتب فقہ میں مفصل بحث ہے دیکھئے: المحلی للامام ابن حزم الظاہری ۶/ ۶۹ طبع المیریۃ، نیل الاوطار للامام محمد بن علی الشوکانی ۴/ ۱۵۶ طبع مصطفیٰ البابی الحلبی، فقہ الزکاۃ للدکتور یوسف القرضاوی ۱/ ۲۴۶۔

(۲۸) الاموال اردو، ۲/ ۱۶۹۔ ۱۷۲۔

(۲۹) لسان العرب مادۃ ربو۔

(۳۰) ابن عابدین ۴/ ۱۷۶۔

(۳۱) مغنی المحتاج ۲/ ۲۱۔

(۳۲) البقرۃ: ۲۷۵۔

(۳۳) صحیح مسلم۔

(۳۴) مرجع سابق۔

(۳۵) مرجع سابق۔

(۳۶) أخرجہ البیہقی۔

(۳۷) دیکھئے: لأحکام ۸/ ۳۶۷۔

(۳۸) چوتھی رائے میں سونا و چاندی غیر معلل ہیں جب کہ پانچویں رائے میں علت ربا مالیت ہے: بدائع الصنائع للامام علاء الدین بن مسعود الکاسانی، ۷/ ۳۱۰۶، الطبعۃ الاولی ۱۹۱۰ء مطبعۃ الجمالیۃ مصر۔ الاختیار لتعلیل المختار لأبی عبداللہ الموصلی، ۲/ ۳۰، الطبعۃ الثالثۃ ۱۹۷۵ء مصر۔ المغنی لابن قدامۃ المقدسی ۴/ ۱۲۸ وفتاوی شیخ الاسلام أحمد بن تیمیہ ۲۹/ ۴۷۰، الطبعۃ

الاولی ۱۳۸۳ھ بمطابع الریاض، المجموع ۹/ ۴۴۶۔

(۳۹) بدائع الصنائع ۷/ ۳۱۰۶۔

(۴۰) المغنی ۴/ ۴ مطابع سجل العرب ۱۹۶۹، جبکہ ان کے نزدیک سونا چاندی کے علاوہ دوسری اجناس میں علت ربامکیلات جنس ہیں (ابن عابدین ۴/ ۱۷۶، المغنی ۴/ ۳۔ ۸)۔

(۴۱) الخرشی علی خلیل بحاشیۃ العدوی ۵/ ۵۶۔

(۴۲) فتاوی ابن تیمیہ ۲۹/ ۴۷۱۔

(۴۳) المجموع ۹/ ۴۴۳ و ۴۴۶۔

(۴۴) الوجیز للإمام أبی حامد الغزالی ۱/ ۱۳۶، مطبعۃ الآداب مصر ۱۳۱۷ھ۔

(۴۵) بدایۃ المجتھد و نھایۃ المقتصد للإمام أحمد بن رشد ۲/ ۱۲۸، مکتبۃ الکلیات الأزھریۃ مصر ۱۹۶۶ء۔

(۴۶) المغنی ۴/ ۵۔ اس رائے کی حجیت پر امام ابن قیمؒ نے مفصل بحث کی ہے، دیکھئے: اعلام الموقعین ۲/ ۱۳۷، الطبعۃ الثانیۃ ۱۹۵۵، مطبعۃ السعادۃ مصر۔

(۴۷) مجلۃ الشریعۃ ص: ۲۸۸۔

(۴۸) المدونۃ الکبری للإمام مالک بن أنس، المجلد الثالث ۸/ ۳۹۶ مطبعۃ السعادۃ مصر، ۱۳۲۳ھ۔

(۴۹) لسان العرب ۷/ ۱۵۸، دار الحدیث، القاھرۃ، ۲۰۰۳ء۔

(۵۰) تفصیل کے لئے دیکھئے: المعجم الاقتصادی للدکتور أحمد الشرباصی/ ۳۴۴، دار الجیل بیروت ۱۹۸۱ء، والموسوعۃ العربیۃ المیسر ۃللاستاذ محمد شفیق غربال ۲/ ۱۳۰۹، طبعۃ بیروت ۱۹۶۵ء۔

(۵۱) دیکھئے: حاشیۃ الدسوقی علی الشرح الکبیر للإمام محمد عرفۃ الدسوقی ۳/ ۴۵، دار احیاء الکتب العربیۃ، مصر۔

(۵۲) الحاوی للفتاوی ۱/ ۱۰۴۔

(۵۳) مسند أحمد، ۱۵/ ۵۱۰، رقم: ۲۱۲۸۰، وقال محققہ: اسنادہ صحیح۔ دار الحدیث، القاھرۃ مصر، الطبعۃ

الاولی ۱۹۹۵ء۔

(۵۴) مجلۃ الشریعہ/ ۲۹۱ بحوالہ: نھایۃ المحتاج الی شرح المنہاج للامام محمد بن ابی العباس الرملی ۳/ ۳۹۷، المکتبۃ الاسلامیۃ۔

(۵۵) رد المحتار علی الدر المختار للعلامۃ محمد امین المعروف با بن عابدین ۴/ ۱۸۴، طبع الامیریۃ مصر ۱۳۲۴ھ۔

(۵۶) شرح فتح القدیر لابن ہمام ۴/ ۱۸۴ و ۵/ ۳۸۴، الطبعۃ الامیریۃ مصر ۱۳۱۶ھ۔ ودرر الحکام فی شرح غرر الأحکام للعلامۃ ملاخسرو وبہامشہ حاشیۃ العلامۃ الشرنبلالی ۲/ ۵ فی کلامہ علی ما غلب فیہ الغش، وحاشیۃ ابن عابدین ۴/ ۲۵، والاختیار ۲/ ۲۱۔

(۵۷) البدائع ۷/ ۳۱۱۰، وشرح القدیر ۵/ ۳۸۲۔

(۵۸) المبسوط للسرخسی ۱۴/ ۲۴۔

(۵۹) المبسوط للسرخسی ۱۴/ ۲۴، حاشیۃ ابن عابدین ۴/ ۲۵۔

(۶۰) شرح فتح القدیر ۵/ ۳۸۴، ودرر الحکام ۲/ ۲۰۶۔

(۶۱) الأم للامام أبی عبداللہ محمد بن ادریس الشافعی المجلد الأول ۳/ ۲۸) شوافع کے مراجع اس بات سے پُر ہیں کہ فلوس سامان تجارت کے قبیل سے ہیں جن میں ربا نہیں پایا جاتا چنانچہ فلوس کو ایک دوسرے کے ساتھ کمی زیادتی سے نیز ادھار بھی بیچا جا سکتا ہے (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: المحلی علی منھاج الطالبین للنووی بحاشیۃ قلیوبی وعمیرۃ ۲/ ۱۷۰ و ۳/ ۱۵۱، طبع دار احیاء الکتب العربیۃ بمصر، تحفۃ المحتاج بحاشیۃ الشروانی وابن القاسم ۴/ ۲۵۶، ونہایۃ المحتاج ۳/ ۳۹۷، والحاوی للفتاوی للسیوطی ۱/ ۱۰۴، والمجموع ۹/ ۳۴۴، وروضۃ الطالبین ۱۲/ ۳۷۸۔

(۶۲) دیکھئے: منح الشفا الشافیات فی شرح المفردات للعلامۃ منصور بن یونس البھوتی / ۱۵۹-۱۶۰، والمغنی مع الشرح الکبیر ۴/ ۱۲۸ومابعدھا۔

(۶۳) حوالہ کے مباحث دیکھئے: المھذب ۱/ ۲۷۳ وامھات کتب الفقہ۔

(۶۴) المغرب فی ترتیب المعرب لناصر الدین الطرزی، نشر دار الکتاب العربی بیروت، والمصباح

المنیر للرافعی، والتعریفات للجرجانی۔

(۶۵) رسالۃ التبیان فی زکاۃ الأثمان للشیخ محمد حسنین مخلوف ص: ۳۸، طبعۃ المعاہد مصر ۱۳۴۴ھ۔

(۶۶) نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے ص: ۱۲۲۔

(۶۷) تفصیل دیکھئے: العملۃ واحکامہا فی الشریعۃ الاسلامیۃ للدکتور جاشم، ص: ۱۸۳ وما بعدہا، نقلا من: القول المنقح المضبوط فی جواز التعامل ووجوب الزکاۃ فیما یتعلق بورق النوط للشیخ السید ابی بکر بن محمد شطا، ص۹، مطبعۃ الانصاف، والمحلی علی المنہاج ۲/ ۲۸۔

☆ ☆ ☆

تیسرا باب

تفصیلی مقالات

قرض، اجرت وغیرہ کو اشاریہ سے مربوط کرنا - ایک شرعی جائزہ

مولانا مفتی اقبال محمد ٹنکاروی ☆

پچھلے دور میں سونا چاندی کے سکے رائج تھے، جنہیں درہم ودینار کہا جاتا تھا، لیکن مختلف تاریخی اسباب اور مرورِ زمانہ کی بنیاد پر سونا چاندی کے سکوں کا رواج اٹھتا گیا، اور ان کی جگہ کرنسی نوٹوں نے لے لی، اور ایک عرصہ تک اس کو وثیقہ محض اور رسید کی حیثیت سے جانا گیا، لیکن اب زندگی کے تمام کاروبار کرنسی نوٹوں سے ہی چلنے لگے، اس لئے اب اسے صرف وثیقہ محض کی حیثیت دینا مشکل ہوگیا، ہاں! اتنی بات مسلم ہے کہ نوٹ سونا چاندی کے مماثل نہیں، لیکن وہ ثمن عرفی ہے اور سونا چاندی ثمن خلقی ہے، کیوں کہ نوٹ کو ثمنیت عرف عام کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر عرف تبدیل ہوجائے یا حکومت اس کو منسوخ اور غیر معتبر قرار دے، تو اس کی حیثیت کاغذ کے پرزوں سے زیادہ کی نہیں رہے گی، اس کے برخلاف درہم اور دینار کی ثمنیت خلقی ہے، اس کی ثمنیت عرف عام کے تابع نہیں ہے، اگر عرف عام میں اس کا رواج موقوف ہوجائے یا حکومت اس کو غیر معتبر قرار دے، تب بھی فی نفسہ اس کی ثمنیت ختم نہیں ہوگی، کم از کم اس کی ذاتی قیمت ضرور رہ جائے گی۔

دوسری بات یہ ہے کہ درہم ودینار میں ثمنیت کے ساتھ وزن بھی معتبر ہے، اور اسی وجہ سے ان کا باہم تبادلہ کمی بیشی سے جائز نہیں ہے۔

☆ مہتمم دار العلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والا، بھروچ، گجرات۔

علامہ شامیؒ فتاوی شامی (۵/ ۱۷۷) میں تحریر فرماتے ہیں:

''فاستقرض مأة دینار من نوع فلا بد أن یوفی بدلھا مأة من نوعھا الموافق لھا فی الوزن أو یوفی بدلھا وزنا لا عددا'' (ایک آدمی نے ایک قسم کے سو دینار قرض لئے تو ضروری ہے کہ اسی قسم کے دینار اس کے بدلہ میں واپس کرے، جو وزن میں اس کے برابر ہوں، یا قرض کی ادائیگی وزن سے کرے، نہ کہ عدد سے)۔

امام شافعیؒ کتاب الام (۳/ ۹۸) میں تحریر فرماتے ہیں:

''أرأیت الذھب والفضة مضروبین دنانیر أو دراھم.......... لا یحل الفضل فی واحد منھما علی صاحبه لا ذھب بدنانیر ولا فضة بدراھم إلا مثلا بمثل وزنا بوزن وما ضرب منھما وما لم یضرب سواء لا یختلف ..... الربوا فی مضروبه وغیر مضروبه سواء'' (ڈھالے ہوئے سونا اور چاندی کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ خواہ دینار ہوں یا درہم ...... ان میں سے کسی میں بھی ایک دوسرے پر تفاضل جائز نہیں، نہ سونے کی بیع میں دینار کے بدلہ میں، اور نہ چاندی کے بیع میں درہم کے بدلہ میں، صرف برابر سرابر بیع جائز ہوگی، اور یہ برابری وزن کے اعتبار سے ہوگی، ڈھالا ہوا سونا چاندی بغیر ڈھالے ہوئے سونا چاندی یعنی سکہ اور غیر سکہ دونوں ربا کے باب میں برابر ہیں ...... دونوں میں ربا کا تحقق زیادتی وتفاضل کی صورت میں ہوگا)۔

اس عبارت میں امام شافعیؒ نے وزن کا خاص اعتبار کیا ہے، اور غیر مضروب اور مضروب ہونے کی صورت میں کسی بھی فرق کے قائل نہیں ہوئے۔

ان دونوں عبارتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ سونا چاندی میں ثمنیت کے ساتھ وزن کا خاص لحاظ کیا گیا ہے، جب کہ نوٹ میں وزن کا لحاظ کوئی معنی نہیں رکھتا، وہاں صرف ثمنیت میں مساوات ضروری ہے، اگرچہ گنتی اور عدد کے اعتبار سے مساوات موجود نہ ہو۔

غرض سونا چاندی اور کرنسی نوٹ کے درمیان خلقی اور عرفی ہونے کی حیثیت سے فرق ہے، اور یہاں فرق اس معنی میں ثابت کررہے ہیں کہ سونا چاندی کی ثمنیت بدیہی ہے، جس پر علماء وفقہاء کا اتفاق ہے، اور نوٹ کی ثمنیت نظری ہے، جسے دلائل سے ثابت کرنا پڑ رہا ہے۔

بہر حال نوٹ کی شرعی حیثیت کے متعلق اس مقام پر طویل بحث کرنا منظور ومقصود نہیں ہے، کیوں کہ ۱۹۹۸ء میں منعقدہ سمینار میں اس موضوع پر علماء ومفتیان کرام کے مفصل مقالات اور ان کی تحقیقی آراء کی روشنی میں نوٹ کو ثمن عرفی کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہے اور ایسا ہونا ہی امت کے حق میں تیسیر اور سہولت ہے، بہر حال اس تعین کے بعد اس میں اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ دیون یعنی مؤخر مطالبے مثلاً قرض، پینشن، اور ادھار خریداری کی رقم وغیرہ کی ادائیگی کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنا جائز ہوگا یا نہیں؟ اور کیا یہ اشاریہ ممکن بھی ہے یا نہیں؟ اور کیا فنی دقیق اصول پر قائم شدہ معیار باہمی تنازعہ کا موجب ہوگا اور اس طرح دئے گئے دس روپے کے عوض میں سو روپے لینا دینا ربا اور سود نہیں سمجھا جائے گا؟

اس مسئلہ کے بارے میں یہ بات ضرور یاد رکھنی چاہئے کہ اسلامی شریعت کے مزاج میں بڑی سادگی ہے، ادھر ادھر کی موشگافیوں اور پیچیدگیوں کو اسلام پسند نہیں کرتا، خصوصاً اس وقت جب کہ عوام الناس کے پریشان ہونے کا مسئلہ ہو اور کاروبار کے بگڑ جانے اور نیز تنازعات پیدا ہونے کا قوی اندیشہ ہو، اسی وجہ سے آپ ﷺ کا یہ فرمان ابوداؤد شریف ج:۱، ص: ۳۱۷ میں موجود ہے:

”نحن أمة أمية لا نكتب و لا نحسب“ کہ ہم امی جماعت ہیں، حساب کتاب نہیں جانتے، مطلب یہ ہے کہ باریک حسابات اور فنی تدقیقات وتشقیقات جو عوام کے بس میں نہ ہوں اور ان کی دسترس سے باہر ہوں وہ مذہب اسلام کو پسند نہیں، کیونکہ اسلامی نظام حیات خواص وعوام سب کے لئے یکساں ہیں، اس لئے وہ نظام حیات میں ایسے اصول تیار کرتا ہے جس میں

سادگی بھی ہواور عوام وخواص ہر طبقہ کے لئے یکساں دلچسپی کا حامل ہو۔

اس لئے ایسا نظام بنانا یا ایسے اصول بنانا جس سے مزاج شریعت پر زد پڑتی ہو، اور اس میں قانونی یا فنی پیچیدگی پیدا ہوتی ہو اس کی اسلام اجازت نہیں دے گا، قرضوں کو قیمتوں کے اشاریہ سے منسلک کرنے سے متعلق مسئلہ کا حل چند سوالات کے حل ہونے پر مبنی ہے۔

قیمتوں کے گھٹنے بڑھنے کا مطلب کیا ہے اور اس کے لئے معیار کیا ہے؟ قیمتوں کی کمی بیشی اضافی ہے یا حقیقی؟ روایات میں جو مثل ضروری قرار دیا گیا ہے، اس سے کیا مراد ہے؟ یہ برابری اور مثل مقدار میں ضروری ہے یا قیمت ومالیت میں ضروری ہے؟ اس مسئلہ کو ایک مثال سے حل کیجئے کہ آج سے پانچ سال قبل ایک مخصوص برانڈ کی گھڑی کی قیمت ۵۰۰ روپے تھی، جب کہ اس وقت اس کی قیمت ۸۰۰/روپے ہوگئی ہے، تو اب کیا کہا جائے گا، کہ گھڑی کی قیمت بڑھ گئی؟ یا روپیہ کی قیمت گھٹ گئی ہے یا پھر طرفین میں تبدیلی ہوئی؟

عام محاورات میں دونوں طرح کی باتیں کہی جاتی ہیں، کوئی کہتا ہے کہ گھڑی کی قیمت بڑھ گئی ہے، کوئی کہتا ہے کہ روپیہ کی قیمت گھٹ گئی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ روپیہ تو ثمن ہے، اس کی قیمت میں کیسے کمی بیشی ہوئی؟ وہ تو اپنے حال پر باقی ہے؟ البتہ سامان کی قیمت میں اضافہ ہوا ہے، اور سامان کی گرانی اور ارزانی کا تعلق طلب ورسد پر ہے، اگر طلب زیادہ ہے اور رسد کم ہے تو سامان کی قیمت بڑھ جائے گی، کبھی اقتصادی حالات کے پیش نظر حکومت وقت ٹیکس میں اضافہ کر دیتی ہے، اور تجار ٹیکس والی رقم قیمت بڑھا کر حاصل کر لیتے ہیں، مطلب یہ کہ قیمتوں کے گھٹنے بڑھنے کا تعلق سامان سے ہے، نوٹ اور کرنسی سے نہیں ہے۔

معلوم ہوا کہ روپے کی قیمت کا بڑھنا گھٹنا ایک اضافی امر ہے، کوئی حقیقی امر نہیں ہے، یہ تو ہم محاورات میں کہتے ہیں، ورنہ حقیقت میں گرانی وارزانی کا حقیقی تعلق اشیاء سے ہے، نہ کہ روپے سے، اس مقام پر اگر کوئی یوں کہے کہ نوٹ ثمن خلقی نہیں عرفی ہے، اس لئے اس میں قیمت

کا اعتبار کر کے ایک سو روپے کے بدلہ پانچ سو روپے لے سکتے ہیں، تو یاد رہے کہ اس کی تردید اس جزئیہ سے ہو جاتی ہے، جو ابوداؤد شریف ج:۲، ص:۵۲۶ پر موجود روایت میں مذکور ہے:

عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده قال كانت قيمة الدية على عهد رسول الله ﷺ، ثمان مأة دينار أو ثمانية آلاف درهم، فكان ذلك كذلك حتى استخلف عمر رضي الله عنه فقال خطيبا: ألا إن الإبل قد غلت قال: ففرضها عمر رضي الله عنه على أهل الذهب ألف دينار وعلى أهل الورق اثني عشر ألف درهم"۔

(فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کے زمانہ میں دیت کی قیمت آٹھ سو دینار یا آٹھ ہزار درہم تھی اور دیت کی یہ مقدار اسی طرح رہی یہاں تک کہ حضرت عمرؓ نے سونا والوں پر ایک ہزار دینار اور چاندی والوں پر بارہ ہزار درہم مقرر فرمائے)۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کے زمانہ ہی سے اونٹ کی قیمت بارہ ہزار درہم پہنچ گئی تھی اور آپ ﷺ نے بارہ ہزار درہم دیت کے لئے مقرر فرمائے۔ سنن نسائی حدیث نمبر: ۴۸۱۲، باب ذکر الدیۃ من الورق میں ہے:

عن ابن عباس رضي الله عنه قال: "قتل رجل رجلا على عهد رسول الله ﷺ فجعل النبي ﷺ ديته اثني عشر ألفا"۔

اور دارمی میں حدیث نمبر ۲۳۶۸/۲۴۵۴۶ میں ہے: "إن رسول الله ﷺ فرض على أهل الذهب ألف دينار" (قبیلہ بنو عدی کا ایک آدمی قتل کر دیا گیا تو نبی کریم ﷺ نے اس کی دیت بارہ ہزار درہم مقرر فرمائی اور سونا والوں پر ایک ہزار دینار مقرر فرمائی)۔

تو اب یہاں پر کیا کہا جائے گا؟ آیا اونٹ کی قیمت میں اضافہ ہوگیا تھا یا درہم ودینار کی

قیمت گھٹ گئی تھی؟ یا پھر اونٹ اپنے حال پر تھے اور درہم ودینار کی قیمت میں کمی واقع ہوئی تھی تو اس صورت میں کیا مسئلہ ہوگا؟ جب کہ ایک آدمی نے آٹھ ہزار درہم اس وقت قرض لیے تھے جب کہ اتنے میں سو اونٹ خریدے جا سکتے تھے، اور اس وقت واپس کررہا ہے جب کہ سو اونٹ کی قیمت بارہ ہزار ہو چکی ہے، تو قرض کی ادائیگی میں قیمت کا اعتبار کرکے چار ہزار درہم کے اضافہ کے ساتھ بارہ ہزار درہم میں قرض کی ادائیگی درست ہوگی؟ اور کیا یہ مفہوم ربا میں داخل نہیں ہوا؟

اس صورت میں علماء متفقہ طور پر فرماتے ہیں کہ ایک درہم کی زیادتی بھی ربا اور سود میں داخل ہوگی، معلوم ہوا کہ ثمن کی قیمت میں کمی بیشی نہیں ہوئی، بلکہ چیزوں میں مہنگائی بڑھ جاتی ہے، اس لئے پہلے جس مقدار ثمن پر وہ چیز مل جایا کرتی تھی، اس مقدار سے بڑھا کر ادا کرنے پر اب وہ چیز مل سکتی ہے، لہذا یہ خیال اور نظریہ شرعی اور عقلی ہر اعتبار سے بالکل غلط ہے کہ ثمن کی قیمت میں کمی بیشی ہو سکتی ہے۔ یہاں یہ بات بھی مدنظر رکھنی چاہئے کہ سکہ وغیرہ میں کمی بیشی کا اختیار اگر کسی کو ہو سکتا ہے تو وہ حکومت وقت کے لئے ہے اور اولاً اس کا احساس اسی کو ہو سکتا ہے، لیکن حکومت نے کبھی ایسا قدم نہیں اٹھایا تو پھر بغیر کسی قرینہ وعلامت کے یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ کرنسی نوٹ میں کمی بیشی واقع ہوتی ہے۔ نوٹ کے بارے میں حکومت کا سلوک مسلسل یہی رہا ہے کہ نوٹ کی قیمت یکساں رہتی ہے، مثلاً ہم ملک کے کسی بھی بینک میں چاہے روپے جمع کرائیں اور دس سال بعد جب ہم ان روپیوں کو اٹھاتے ہیں تو بینک اتنے ہی روپے واپس کرتی ہے جتنے ہم نے جمع کرائے ہیں اور جو کچھ زیادتی وہ دیتی ہے تو وہ سود ہے جو سود کے عنوان سے دیا جاتا ہے، معلوم ہوا کہ حکومت کے نزدیک بھی نوٹ، کرنسی کی قیمت میں کمی بیشی واقع نہیں ہوتی، خواہ اشیاء کی قیمت میں کتنا ہی اضافہ ہوتا چلا جائے نوٹ کی قیمت اتنی ہی رہتی ہے۔

ہمارا موضوع بحث مسئلہ قرضوں کو قیمتوں کے اشاریہ سے منسلک کرنا ہے تو منسلک کرنے کا مقصد کیا ہوتا ہے؟ اس پہلو کو متعین کرنے سے بات واضح بھی ہو جائے گی اور اس پر حکم

لگانا بھی آسان ہوجائے گا۔

قیمتوں کے اشاریہ (INDEX) میں اشیاء کی قیمتوں میں جس تناسب اور حساب سے اضافہ ہوا ہے اسی تناسب سے قرض دار قرض خواہ کو قرض واپس کرے گا، لئے ہوئے قرض کے برابر روپیہ واپس نہیں کرے گا۔ مثلاً اگر کسی شخص نے ۱۰۰ روپئے قرض لئے ہے اور قیمتوں کے اشاریہ میں دس فیصد کے تناسب سے بڑھوتری ہوئی ہے تو واپسی کے وقت دس فیصد قرض میں اضافہ کرکے ایک سو دس روپے واپس کرے گا۔

قرض اور قیمتوں کے اشاریہ کے مابین ربط وتعلق کے جوڑ سے متعلق بعض ماہرین معاشیات یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ یہ جو زیادتی قرض دار واپس کررہا ہے یہ حقیقی زیادتی نہیں بلکہ وہ اسی مالیت کو واپس رہا ہے جو قرض دار نے بطور قرض قرض خواہ کو دی تھی، اس لئے کہ سو روپئے کی Value بوقت قرض زیادہ تھی اور بوقت ادائیگی قرض وہ کم ہوگئی ہے، تو اسے دس فیصد زیادہ دیکر برابر کررہا ہے۔ اب اگر اس صورت میں وہ ۱۰۰ روپے ہی واپس کرتا ہے تو دائن پر زیادتی ہوگی کہ وہ اسے نوٹ واپس کررہا ہے جس کی مالیت فی الحال اتنی نہیں رہی ہے جتنی کے قرض لیتے وقت تھی، اور دس فیصد زیادہ دینے میں اس کی پوری مالیت ادا کرنا ہوگا، لہذا یہ زیادتی باب ربا میں داخل ہوکر حرام نہیں بن جاتی کیوں کہ یہ حقیقی زیادتی نہیں ہے۔

ماہرین کا اس زیادتی کو جائز قرار دینا از روئے شریعت وقواعد شریعت درست اور صحیح نہیں ہے۔ کیوں کہ قرض کی ادائیگی کے باب میں شریعت نے اسی قرض کے مقدار کی ''مثل'' ادا کرنا واجب اور ضروری قرار دیا ہے۔ اور یہ امر متفق علیہ ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے حتی کہ اشاریہ سے متعلق قرار دینے والا گروہ بھی ''مثل'' کا قائل ہے، تو اب ضروری ہے کہ مثل کی تعیین کی جائے کہ ''مثل'' سے کیا مراد ہے؟ آیا مقدار مراد ہے یا پھر مالیت؟ اور یہی اس مسئلہ میں بنیادی سوال ہے، چنانچہ کتاب وسنت میں تتبع اور لوگوں کے معاملات کا مشاہدہ اور معاینہ کرنے

کے بعد یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ مقدار اور کمیت میں برابری واجب ہے مالیت اور قیمت میں نہیں۔

اس سلسلے میں چند دلائل حضرت مولانا مفتی تقی صاحب دامت برکاتہم نے اپنی تصنیف ''فقہی مقالات'' (۱/ ۵۳) میں نقل فرمائے ہیں جس کو یہاں تحریر کرتا ہوں:

''اگر ایک شخص دوسرے سے ایک کلو گندم بطور قرض لے اور قرض لیتے وقت ایک کلو گندم کی قیمت پانچ روپے تھی اور جب وہ قرض دار اپنا قرض واپس کرنے لگا تو اس وقت ایک کلو گندم کی قیمت دو روپے ہوگئی تھی تو اب بھی وہ ایک کلو گندم واپس کرے گا زیادہ نہیں کرے گا۔ باوجود یہ کہ ایک کلو گندم کی قیمت پانچ روپے سے کم ہوکر دو روپے ہوگئی ہے۔ اور اس مسئلہ میں تمام فقہاء متقدمین ومتاخرین کا اجماع ہے، فقہاء میں سے کوئی بھی یہ نہیں کہتا ہے کہ اس صورت میں جب کہ گندم کی مالیت کم ہوگئی ہے صرف ایک کلو گندم واپس کرنا قرض خواہ پر ظلم ہے؛ اس لئے گندم کی قیمت میں جتنی کمی واقع ہوئی ہے اسی نسبت سے اضافہ کرکے قرض خواہ کو واپس کرے؛ یعنی ایک کلو گندم کے بجائے اب قرض دار ڈھائی کلو گندم واپس کرے؛ اس لئے کہ ڈھائی کلو گندم کی مالیت اب وہی ہے جو قرض لیتے وقت ایک کلو گندم کی تھی۔''

یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ قرض میں جس مثلیت اور برابری کا اعتبار شریعت میں ضروری ہے وہ مقدار اور کمیت میں برابری ہے، قیمت اور مالیت میں برابری معتبر نہیں۔

اس دلیل کا بعض حضرات یہ جواب دیتے ہیں کہ گندم تو سامان اور اشیاء کی قبیل سے ہے اور اس کی اپنی ذاتی مالیت اور حیثیت ہے، بخلاف ان کاغذی نوٹوں کے کہ ان کی ذاتی مالیت اور حیثیت کچھ بھی نہیں ہے اس لئے گندم کو نوٹوں پر قیاس کرنا درست نہیں۔

لیکن یہ جواب دراصل خلط مبحث پر مبنی ہے؛ اس لئے کہ یہاں پر اصل مسئلہ یہ ہے کہ قرض کی واپسی میں مثلیت اور برابری کونسی معتبر ہے؟ جب دلیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ قرض

میں مثلیت مطلوبہ مقدار اور کمیت کی مثلیت ہے، قیمت اور مالیت میں مثلیت کا اعتبار نہیں ہے، اس لئے اب یہاں گندم اور نوٹوں میں ماہیت اور اصلیت کے فرق سے حکم میں کوئی فرق نہیں پڑتا؛ اس لئے کہ گندم اور نوٹ دونوں میں مقدار بھی موجود ہے اور قیمت بھی، لہذا اگر گندم میں مثلیت مطلوبہ مقدار اور کمیت ہوگی، اسی طرح اگر گندم میں قیمت اور مالیت کے فرق کا اعتبار نہیں بالکل اسی طرح نوٹ میں بھی قیمت اور مالیت کا فرق معتبر نہیں ہوگا۔

۲-تمام لوگوں کے نزدیک یہ بات مسلم ہے کہ قرضوں کی واپسی میں برابری کی شرط صرف سود سے بچنے کے لئے ہے اور حضور اقدس ﷺ نے اس مطلوبہ برابری کو ربا الفضل کی احادیث میں پوری تشریح کے ساتھ واضح فرمادیا ہے۔

جامع الاصول لابن الاثیر (۱/ ۴۵۴) میں یہ روایت مذکور ہے:

''أبو سعيد الخدريؓ قال: كنا نُرزق تمر الجمع على عهد رسول الله ﷺ وهو الخلط من التمر فكنا نبيع صاعين بصاع فبلغ ذلک رسول الله ﷺ فقال: لا صاعين تمرا بصاع ولا صاعين حنطة بصاع ولا درهما بدرهمين''۔

(حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ عہد رسول اللہ ﷺ میں ہمارے پاس ملی جلی کھجوریں آیا کرتی تھیں، تو ہم دو صاع کھجور کو ایک صاع کھجور کے عوض بیچ دیتے تھے۔ جب حضور ﷺ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ دو صاع کھجور کو ایک صاع کھجور کے بدلہ میں مت بیچو اور نہ ہی دو صاع گندم کو ایک صاع گندم کے بدلے میں بیچو، اور ایک درہم کو دو درہم کے بدلے میں مت بیچو)۔

آپ ﷺ کو معلوم تھا کہ جو ایک صاع کھجور ہے وہ قیمتی ہے دو صاع کھجور کی بنسبت، اس کے باوجود آپ ﷺ اس پر راضی نہ ہوئے اور قیمت کا اعتبار کئے بغیر مقدار اور ناپ میں

مماثلت کا حکم فرمایا۔

جامع الاصول (۱/۴۵۸) پر روایت مذکور ہے:"عن أبی سعید وأبی ہریرة رضی الله عنهما أن رسول الله ﷺ استعمل رجلا علی خیبر، فجاءهم بتمرجنیب فقال: أکل تمر خیبر هکذا قال: إنا لنأخذ الصاع بالصاعین، والصاعین بالثلاث قال: لا تفعل، بع الجمع بالدراهم ثم ابتع بالدراهم جنیبا وقال: فی المیزان مثل ذلک"۔

(حضرت ابوسعید خدریؓ اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ایک آدمی کو خیبر کا عامل بنا کر بھیجا، وہ عامل جب واپس آئے تو آپ ﷺ کی خدمت میں جنیب کھجور پیش کی (یہ ایک عمدہ قسم کی کھجور ہے) تو آپ ﷺ نے یہ سوال کیا کہ کیا خیبر کی تمام کھجوریں اسی طرح کی ہوتی ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم ایک صاع (عمدہ کھجور) کو دو صاع (گھٹیا کھجور) کے عوض اور دو صاع کو تین صاع کھجور کے عوض میں تبدیل کر لیتے ہیں۔آپ ﷺ نے فرمایا: ایسا مت کرو، بلکہ ملی جلی کھجوروں کو پہلے دراہم کے عوض میں فروخت کر دو پھر ان درہموں سے جنیب کھجور خرید لیا کرو)۔

اس روایت سے بھی صاف واضح ہوجاتا ہے کہ اموال ربویہ میں مطلوبہ تماثل اور برابری مقدار میں ہے قیمت اور مالیت میں نہیں ہے۔اور مذکورہ روایت میں آپ ﷺ نے عمدہ اور گھٹیا ہونے کا بالکل اعتبار نہیں فرمایا بلکہ وزن میں تماثل کو ضروری بتلایا۔

اسی طرح آگے (۱/۴۶۰) حدیث نمبر ۴۶۰ میں ان الفاظ میں مروی ہے:"عن أبی ہریرة رضی الله تعالی عنه قال: قال رسول الله ﷺ: الذهب بالذهب وزنا بوزن مثلا بمثل، والفضة بالفضة وزنا بوزن مثلا بمثل فمن زاد أو استزاد فهو ربا"۔

(حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: سونا سونے کے بدلہ وزن کر کے بیچو برابر سرابر، اور چاندی چاندی کے عوض برابر سرابر بیچو، ان میں جو شخص زیادتی کرے یا زیادتی کا طلب گار ہو تو وہ زیادتی سود ہے)۔

آگے جامع الاصول (۱/۴۲۶) پر یہ حدیث ذکر کی گئی ہے: "وفي رواية أبي داؤد أن رسول الله ﷺ قال: "الذهب بالذهب بتبرها وعينها والفضة بالفضة بتبرها وعينها والبر بالبر مدين بمدين والتمر بالتمر مدين بمدين والملح بالملح مدين بمدين فمن زاد أو ازداد فقد أربى"۔

(ابو داؤد کی روایت میں حضرت عبادۃ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سونے کو سونے کے بدلہ میں چاہے وہ سونے کا ٹکڑا ہو یا ڈھلا ہو یا سکہ ہو، چاندی کو چاندی کے بدلے میں چاہے وہ چاندی کا ٹکڑا ہو یا ڈھلا ہو یا سکہ ہو، اور دو مد گندم کے عوض میں اور دو مد چھوہاروں کے عوض میں اور دو مد نمک کو دو مد نمک کے عوض میں (برابر کر کے بیچو) جس نے زیادتی کی یا زیادتی طلب کی اس نے سود لیا)۔

جامع الاصول (۱/۴۶۴) پر حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ سے منقول ایک روایت میں آپ ﷺ کے یہ کلمات مروی ہیں: "ثم قال لهم رسول الله ﷺ: الذهب بالذهب وزنا بوزن" (پھر آپ ﷺ نے ان سے فرمایا سونے کو سونے کے بدلے میں وزن کر کے بیچو)۔

ان روایات کے بارے میں مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں:

"مندرجہ بالا تمام احادیث اس بات کو واضح طور پر بیان کر رہی ہیں کہ شریعت میں جو تماثل اور برابری معتبر ہے وہ مقدار میں برابری ہے، اموال ربویہ میں قیمت کے تفاوت کا بالکل اعتبار نہیں ہے، یہ احکام اس صورت میں ہیں جب بیع نقد ہو رہی ہو، اور اگر معاملہ قرض کا ہو جس

میں اصل سود جاری ہوتا ہے جس میں ہر قسم کی زیادتی بلکہ زیادتی کے شبہ سے بھی بچنا ضروری ہے تو پھر اس میں قیمت کے تفاوت کا لحاظ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا''۔

اس مسئلہ میں ایک حدیث اور ہے جو خاص کر قرض ہی میں مثلیت اور زیادتی کو واضح کرتی ہے:

سنن ابو داؤد: کتاب البیوع: رقم الحدیث: ۳۳۵۴ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے، اور یہ روایت امام ترمذیؒ نے باب الصرف میں اور امام نسائیؒ نے باب بیع الفضة بالذهب میں نقل فرمائی ہے: "عن ابن عمر رضی الله عنهما قال: كنت أبيع الإبل بالبقيع فأبيع بالدنانير وآخذ الدراهم وأبيع بالدراهم وآخذ الدنانير، آخذ هذه من هذه، وأعطى هذه من هذه فأتيت رسول الله ﷺ وهو في بيت حفصة فقلت: يا رسول الله! رويدك، أسألك إني أبيع الإبل بالبقيع، فأبيع بالدنانير وآخذ الدراهم وأبيع بالدراهم وآخذ الدنانير آخذ هذه من هذه وأعطى هذه من هذه فقال رسول الله ﷺ: "لا بأس أن تأخذها بسعر يومها، ما لم تفترقا وبينكما شيئ"۔

(حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: میں مقام نقیع میں اونٹ بیچا کرتا تھا، تو میں دینار کے عوض بھاؤ کر کے بیچتا تھا اور دراہم لے لیتا، اور کبھی دراہم کے عوض بیچتا تھا اور دنانیر لے لیتا، اور میں درہم کو دینار کے بدلے میں اور دینار کو درہم کے بدلے میں وصول کرتا اور ادا کرتے وقت بھی درہم کے بدلے دینار اور دینار کے بدلے درہم ادا کرتا، ایک بار میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس وقت آپ ﷺ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہ کے گھر پر تھے، میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! ذرا ٹھہریئے، میں آپ سے سوال کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ میں مقام نقیع میں اونٹ بیچتا ہوں، کبھی میں دینار کے عوض بھاؤ کر کے بیچتا ہوں اور دراہم لے لیتا ہوں، اور کبھی دراہم کے عوض میں بیچتا ہوں اور دنانیر لے لیتا ہوں، یعنی میں درہم کو دینار

کے بدلہ میں وصول کرتا ہوں، دینار کو درہم کے بدلہ میں وصول کرتا ہوں، اور ادا کرتے وقت بھی درہم کے بدلے دینار اور دینار کے بدلے درہم ادا کرتا ہوں، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس طرح کرنے میں کوئی حرج نہیں مگر اس شرط کے ساتھ کہ اس روز کے بھاؤ کے برابر لو اور تمہارے درمیان اس حالت میں جدائیگی نہ ہو کہ تمہارے درمیان کوئی لین دین باقی رہے)۔

اس روایت کا طریقہ استدلال حضرت مفتی تقی صاحب ''فقہی مقالات'' (۱/ ۵۷) پر اس طرح تحریر فرماتے ہیں:

''حضور ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے لئے اس چیز کو جائز اور مباح قرار دیا کہ جب بیع دینار کے ذریعہ ہو تو ادائیگی کے روز دینار کی جو قیمت ہو اس قیمت کے برابر درہم وصول کرلیں، جس روز ذمہ میں واجب ہوئے ہوں اس روز کی قیمت کا اعتبار نہیں، مثلاً بیع میں ایک دینار طے ہوا اور بیع کے روز ایک دینار کی قیمت دس درہم تھی اور اس وقت مشتری نے قیمت ادا نہیں کی، کچھ روز بعد جب مشتری نے قیمت ادا کرنا چاہا تو اس وقت اس کے پاس دراہم تو تھے مگر دینار نہیں تھے اور اس روز ایک دینار کی قیمت گیارہ درہم ہوگئی تو اب مشتری بائع کو گیارہ درہم ہی ادا کرے گا۔

اس سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ ادائیگی کے روز کی قیمت کا اعتبار رہتا ہے، جس روز ذمہ میں واجب ہوئی تھی اس روز کی قیمت کا اعتبار نہیں ہوتا، اگر قرضوں میں قیمت کے اعتبار سے مثلیت معتبر ہوتی ہو تو قرض کی ادائیگی میں واجب ہونے کے روز کی قیمت کی ادائیگی ضروری ہونی چاہئے، حالانکہ آپ ﷺ نے "**بعسر یومها**" فرمایا جو صاف حکم ہے کہ ادائیگی کے روز کی قیمت کا اعتبار ہوگا۔

الفقہ اسلامی وادلتہ (۴/ ۶۷۲) پر ڈاکٹر وہبہ زحیلی تحریر فرماتے ہیں:

''والخلاصة أن تبادل الأموال الربوية يجب فيه التساوي في

الکمیات المبادلة فی الجنس الواحد" (خلاصہ یہ ہے کہ اموال ربویہ کے تبادلہ میں ضروری ہے جنس واحد کے تبادلہ کے وقت کمیات (مقدار) میں مساوات کا پایا جانا)۔

مثلیت مقدار میں ضروری ہے اس بات کی وضاحت اس بات سے ہوتی ہے جس کو صاحب فتح القدیر نے (۷/۱۳۵) پرتحریر فرمایا ہے، وہ فرماتے ہیں:

نعم حدیث الخدری فی البخاری عنه ﷺ: لا تبیعوا الذهب بالذهب إلا مثلا بمثل الخ........ وقوله وزنا بوزن بعد ذلک ولا تشفوا فی حدیث البخاری المذکور تفسیر لمثلا بمثل، فإن المثلیة أعم ففسرها بانها من حیث المقدار۔

(حدیث بخاری میں آپ ﷺ کا فرمان کہ سونا سونے کے عوض میں مت بیچو مگر برابر سرابر الخ........پھر اس کے بعد آپ کا وزناً بوزن اور اسی حدیث بخاری میں **ولا تشفوا** (زیادتی مت کرو) یہ مثلاً بمثل کی تفسیر ہے، اس لئے کہ مثلیت میں عموم ہے تو اس کی تفسیر فرمادی کہ وہ مقدار کے اعتبار سے ہے)۔

نیز فتح القدیر (۷/۱۳۴) کے حاشیہ چلپی پر جو فرمایا گیا ہے اس سے بھی مثلیت سے مقدار کی مثلیت مراد ہے، یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں: **"الذهب بالذهب مثلا بمثلا" الحدیث والمراد به المماثلة فی القدر لا فی الصفة لقوله ﷺ: "جیدها وردیها سواء"** کہ حدیث میں مذکور مثلاً بمثل سے مراد مقدار میں مماثلت ہے نہ کہ صفت میں، کیوں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اس کا عمدہ اور ردی دونوں برابر ہیں۔

الغرض ثمن کے باب میں ماضی کا کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا ہے کہ جس میں ادائیگی قرض کے باب میں وجوب کے وقت کی قیمت اور مالیت کا اعتبار کر کے قرض کی ادائیگی کو ضروری قرار دیا گیا ہو، نیز ثمن کی مالیت اور قیمت میں کمی بیشی کا تصور ہی غلط ہے اور جو کچھ کمی بیشی

ہوتی ہے وہ اشیاء کی قیمتوں میں کمی بیشی ہوتی ہے جس کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں جیسا کہ رسد وطلب، قلت وکثرت، حکومتی ٹیکس وغیرہ۔

نوٹ کے بارے میں حکومت نے کبھی بھی ایسا رویہ اختیار نہیں کیا جس سے معلوم ہو کہ نوٹ کی قیمت میں کمی بیشی ہوتی ہے بلکہ اس کا سلوک تو اس قسم کا سمجھ میں آتا ہے کہ نوٹ کی قیمت یکساں رہتی ہے، مثلاً جیسا کہ پیچھے بتلایا کہ سرکاری وغیر سرکاری بینک میں جمع شدہ رقم واپس لیتے وقت اتنی ہی واپس کرتے ہیں جتنی کہ جمع کروائی تھی، کبھی حکومت نے یا حکومتی بینک نے یہ کہہ کر نوٹ میں اضافہ نہیں کیا کہ جمع کرتے وقت کی مالیت زیادہ تھی اور اس وقت کی مالیت نصف ہوگئی ہے **لہٰذا** (۱۰۰۰) کے بجائے (۲۰۰۰) کے نوٹ آپ کو واپس کئے جاتے ہیں، بلکہ اتنے ہی واپس کئے جاتے ہیں، اور زیادتی تو سود کے نام سے معینہ شرح سے ملتی ہے، یہ رویہ اس امر کی واضح **دلیل** ہے کہ حکومت کے نزدیک بھی نوٹ کی قیمت یکساں رہتی ہے، خواہ اشیاء کی قیمتوں میں کتنا ہی اضافہ ہو جاتا ہو۔

قرآن وسنت اور فقہی روایات سے یہ بات مسلمہ طور پر ثابت ہوتی ہے کہ قرض کی واپسی کے وقت مقدار میں مثلیت اور برابری شرط ہے، اٹکل اور اندازہ یعنی تخمینہ سے واپس کرنا جائز اور درست نہیں، بہت سی فقہی روایات اور جزئیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اٹکل واندازہ صحیح بھی ہو تب بھی تخمینہ سے ایک صاع واپس کرنا بھی حلال اور جائز نہیں ہے اور اسی وجہ سے بیع مزابنہ حرام ہے۔

اب اگر قرضوں کو قیمتوں کے اشاریہ سے منسلک کرے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ادائیگی قرض میں مطلوبہ حقیقی مثلیت کا اعتبار نہیں کیا بلکہ ایک تخمینی مثلیت پر بنیاد رکھی گئی، کیوں کہ قیمتوں میں کمی زیادتی کا حساب اور تناسب محض تقریبی اور تخمینی ہوگا، اور اس کی اساس ایک مخصوص حسابی طریقہ پر ہوئی ہے۔

کرنسی کی مثلیت میں عرف کو فیصل بنانا:

اس مقام پر اس نظریہ اور تصور کو بھی زیر بحث لانا ہے کہ بعض ماہرین معاشیات قرضوں کے اشاریہ کے جواز میں یوں استدلال کرتے ہیں کہ مثلیت کا اعتبار تو ہوتا ہے اور مثلیت واجب اور ضروری بھی ہے، لیکن مثلیت کا تعین عرف وعادت سے ہوگا؛ کیوں کہ فقہی قاعدہ ہے: "العادة محكمة" یعنی عادت شرعاً معتبر ہے، اسی طرح مادہ/ ۴۵ "التعيين بالعرف كالتعيين بالنص" کہ جو چیز عرف سے متعین ہوتی ہے وہ ایسی ہی ہے جیسا کہ وہ نص سے متعین ہوئی ہو، لہذا جس مثلیت کا عرف میں اعتبار ہے اس مثلیت کا شرعاً بھی اعتبار کرنا چاہئے؛ کیوں کہ کرنسی کی وہ قیمت جو اشاریہ کی بنیاد پر نکالی گئی ہو موجودہ معاشیات کے عرف میں اس کی ادائیگی کے واسطے لیے ہوئے قرض کی رقم کے مثل اور برابر سمجھی جاتی ہے، تو ادائیگی کے باب میں شریعت کو بھی اس عرف کا لحاظ رکھنا چاہئے۔

ماہرین کا یہ استدلال غلط، بے بنیاد اور باطل ہے، اولاً تو اس وجہ سے کہ عرف وعادت کا اعتبار وہاں ہوتا ہے، جہاں نصوص کی خلاف ورزی نہ ہوتی ہو نیز وہ حکم شرعی نص سے ثابت نہ ہو "العادة محكمة" کی تشریح میں شرح القواعد الفقہیہ میں ص:۲۱۹ پر مرقوم ہے: إن العادة عامة كانت أو خاصة تجعل حكما لإثبات حكم شرعي لم ينص على خلافه بخصوصه۔

یہ تمام نصوص جو سود کی حرمت پر دلالت کرتی ہیں جن کا گزشتہ تذکرہ ہو چکا ہے، ان سے مثلیت کے معنی کا تعین بالکل صراحت کے ساتھ ہو جاتا ہے کہ مثلیت کا اعتبار مقدار میں ہے، قیمت میں اس کا اعتبار نہیں، لہذا اس مسئلہ کا تعلق عرف وعادت سے نہیں، نیز عرف وعادت کے اعتبار کے بارے میں شرح القواعد الفقہیہ کے مذکورہ قاعدہ کے تحت تحریر فرماتے ہیں: فالمراد بها حينئذ مالا يكون مغايرا لما عليه أهل الدين والعقل المستقيم ولا منكرا في

نظرهم" کہ عادت وعرف سے مراد وہ عادت وعرف ہے جو اس نظریہ سے بالکل مغائر نہ ہو جس کو اہل دین وشریعت اور سلیم العقل حضرات نے اپنایا ہو اور نہ ہی وہ ان کی نظر میں منکر اور غیر پسندیدہ ہو، جب قیمت میں برابری کا تصور اہل دین کی اکثریت کا نہیں ہے بلکہ اس تصور کو اہل دین وشریعت پسند ہی نہیں کرتے تو پھر ایسا عرف معتبر بھی نہیں ہوگا۔

ثانیاً یہ عرف وعادت تمام جگہوں میں رائج وغالب ہونی چاہئے، جب کہ مالیت اور قیمت کو مثل قرار دینے کا تصور ماہرین معاشیات کا عرف غالب بھی نہیں ہے کہ اس کا اعتبار کیا جائے کیوں کہ "العادة محكمة" اور "التعيين بالعرف كالتعيين بالنص" کی تشریح میں "شرح القواعد الفقہیہ ص: ۲۹۱ پر مرقوم ہے: أن تكون مطردة أو غالبة في جميع البلدان .... فالاطراد والغلبة شرط لاعتبارها سواء كانت عامة أوخاصة کہ عرف وعادت مطرد ہو یا تمام جگہوں میں غالب ہو پس عرف وعادت کا اعتبار کرنے میں اطراد اور غلبہ شرط ہے، چاہے عرف وعادت عام ہو یا خاص ہو۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے اکثر ممالک قرضوں کو قیمتوں سے مربوط کرنے کے نظریہ سے متفق نہیں ہیں اور یہ ان کے عمل سے ثابت ہوتا ہے، اسی طرح اس نظریہ کو ایک عام اصول کے طور پر تسلیم کرنا اور جاری کرنا ممکن بھی نہیں ہے، کیوں کہ اشاریہ میں کس چیز کو بنیاد بنایا جائے گا؟ بعض مرتبہ اناج کی قیمت بڑھتی ہے لیکن سونے کی قیمت نہیں بڑھتی، اسی طرح دوسری اشیاء کہ اس میں قیمتوں کے گھٹنے اور بڑھنے کا کوئی اصول نہیں، اور یہ ضروری نہیں ہے کہ ایک چیز کی قیمت گھٹ گئی یا بڑھ گئی تو دوسری چیزوں کی قیمت بھی اسی تناسب سے گھٹے یا بڑھے، اور اگر کوئی ایسا اشاریہ بنادیا گیا جیسا کہ حکومت ملازمین کی اجرت میں مہنگائی بھتہ کے اضافہ سے بناتی ہے تو ہر وقت نوٹوں کی قیمت میں کمی بیشی کا عمل کرتے رہنا ہوگا، ظاہر ہے کہ یہ سب باتیں ذہنوں کو الجھا دینے والی اور مسائل کو بجائے سلجھانے کے الجھانے والی ہیں اور باہمی نزاع پیدا کرنے کا باعث ہوں گی قرض کی ہر قسط ادا کرتے وقت

نیا حساب لگانا ہوگا، ظاہر ہے اس کو نہ لوگوں کا مزاج قبول کرسکتا ہے اور نہ اسلام کی سادہ اور سہل شریعت اس کو قبول کرسکتی ہے۔

عرف عام اور عادۃ الناس بھی یہی ہے کہ قرضوں کی ادائیگی (جب کہ غیر سودی ہوں) خواہ وہ کتنے ہی عرصہ کے بعد کیوں نہ ہو اتنے ہی روپے کرنسی نوٹوں میں ادا کی جاتی ہے جتنے روپے کے کرنسی نوٹ لئے گئے تھے، یا واجب تھے، قیمتوں کے اشاریہ کے حساب سے واجبات کی ادائیگی کا تصور بالکل نیا، ناقابل عمل اور باعث نزاع ہے، ضروری نہیں کہ ہر وقت اشیاء کی قیمتیں بڑھتی رہتی ہوں، اگر کسی وقت قیمتیں گھٹ گئیں تو کیا واجبات کی ادائیگی کم روپیوں میں کی جائے گی۔

فقہی مقالات (۱/۷۱) پر مولانا تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں کہ ''ہم دیکھتے ہیں کہ ایسے بہت سے معاشیین جو قرضوں کی ادائیگی میں ''حقیقی قیمت'' کے نظریہ کی تائید کرتے ہیں اس بات کی بھی وضاحت کرتے ہیں کہ ہم اس نظریہ کو ان ''صرفی قرضوں'' کی ادائیگی میں جاری نہیں کرتے جو قرضے انسان اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے حاصل کرتا ہے، جیسے کوئی شخص ایک ہزار روپے اس لئے قرض لیتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ وہ اپنے کھانے، پینے اور اوڑھنے کی ذاتی ضروریات پوری کرسکے، تو ان معاشیین کے نزدیک بھی اس قسم کے قرض کو ''قیمتوں کے اشاریہ'' کے ساتھ جوڑ دینا مناسب نہیں، بلکہ وہ اس حقیقی قیمت کے نظریہ کو صرف ''سرمایہ کاری کے قرضے'' میں جاری کرتے ہیں، کیا یہ خود ان معاشیین کی طرف سے اس بات کا اعتراف نہیں ہے کہ ''صرفی قرضوں'' میں ''حقیقی قیمت'' معتبر نہیں ہے؟ تو اگر ''صرفی قرضوں'' میں اس کا اعتبار نہیں تو پھر ''سرمایہ کاری کے قرضوں'' میں کیوں اعتبار کیا جاتا ہے؟ اس لئے کہ مثلیت اور برابری تو ایک حقیقت ہے جو قرضوں کے اقسام کے اختلاف سے مختلف نہیں ہونی چاہئے؟''۔

بہرحال یہ بات بھی دیکھنے میں آئی کہ ماہرین معاشیات قرضوں میں حقیقی قیمت کے

اعتبار کرنے کے نظریہ کی افراط زر کی صورت میں تو تائید کرتے ہیں لیکن تفریط زر کی صورت میں کوئی بھی اس کی تائید نہیں کرتا۔ تفریط زر کی صورت میں اگر دس فیصد قیمت گھٹ گئی تو کون شخص گوارا کرے گا کہ اس کو اپنے قرض دار سے ایک سو روپے کے بجائے نناوے روپے مل جائے۔ مطلب تفریط زر کی صورت میں لاحق ہونے والے نقصان کو کوئی بھی قبول کرنے کے لئے تیار نہیں، اور اس نقصان کے خوف سے کوئی بھی اپنا روپیہ بینک میں رکھنے کے لئے تیار نہیں۔ معلوم ہوا کہ ''حقیقی قیمت'' Real Value کا یہ نظریہ کوئی ٹھوس اور مبنی برحقیقت بنیادوں پر قائم نہیں؛ بلکہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ افراط زر کے نقصان سے بچنے کے لئے ''حقیقی قیمت'' کو محض ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے۔

کیا یہ جائز ہوگا کہ نوٹوں کی شکل میں قرض دیتے وقت یا مہر مقرر کرتے وقت طرفین واجب الاداء نوٹ کی مالیت سونے یا چاندی میں طے کرلیں اور بے وقت ادائیگی اس قدر سونے یا چاندی کی قیمت کے مساوی نوٹوں کی ادائیگی عمل میں آئے؟

''حقیقی قیمت'' Real Value کا معیار اور اشاریہ مقرر کر کے قرض دیتے وقت ہی دونوں معاملہ کرنے والوں کو اس بات کا پابند بنایا جائے کہ سونا چاندی کی قیمت معلوم کر کے دستاویزی شکل میں اپنے قرض کی رقم کی قیمت محفوظ رکھیں، تو اس طرح کرنے سے وہ پریشانیاں سامنے آئیں گی جو تصور سے باہر ہیں۔

پھر قیمتوں میں کمی بیشی کا معیار کیا ہے اور اس معیار کو سمجھنا خواص کے لئے مشکل ہے تو پھر عوام الناس جس کا قرض کا معاملہ زیادہ ہوتا ہے تو کیسے آسانی سے سمجھ سکیں گے، پھر شریعت کا تعلق عوام وخواص دونوں طبقہ کے لئے یکساں ہے اور شریعت نے سہولت کو ہمیشہ ملحوظ رکھا ہے بلکہ حرج وعسر کو دور کرنے کی حمایت کی ہے، نیز اس طرف رغبت بھی دلائی ہے: ''**وما جعل علیکم فی الدین من حرج**'' کہ اللہ نے تمہارے لئے دین میں تنگی پیدا نہیں فرمایا ''الحرج

مدفوع" اور "الدین یسر" کہ حرج مدفوع ہے اور بیشک دین وشریعت آسان ہے۔ جابجا آسانی اور سہولت پیدا کرنے کے احکام اور رغبت دلائی گئی ہے، تو پھر ایسے حساب سے تو تنگی اور پریشانی کا ایک سلسلہ جاری ہوجائے گا اور ایسی ایسی اصولی اور فنی تحقیقات اور تدقیقات کرنی پڑے گی جو اسلام کی سادگی اور یسر وسہولت یعنی مزاج شریعت کے منافی ہے۔

اس کے علاوہ نوٹوں سے قرض کا رواج عام ہو چکا ہے، اگر نوٹ ذوات القیم میں سے ہوتی یعنی اس کی قیمت کا اعتبار ہوتا تو اس سے قرض کا جواز ہی نہیں ہوسکتا تھا، جب کہ تمام فقہاء، علماء اور مسلمان غرض خواص وعوام سب ہی نوٹوں سے قرض کا معاملہ کرتے ہیں اور بوقت ادائیگی نوٹوں ہی سے ادا کرتے ہیں اور اس میں کوئی نزاع بھی نہیں ہوتا، جو اس بات کی کھلی علامت ہے کہ نوٹ ذوات الامثال سے ہے اس لئے اس کے تمام معاملات میں "سواء بسواء" اور "مثلاً بمثل" کا لحاظ کرنا ضروری ہوگا جس طرح کے درہم ودنانیر میں ہے۔

۱- لہذا نوٹوں کی شکل میں دئے ہوئے قرض کو سونے یا چاندی کی مالیت میں طے کرنا اور بوقت ادائیگی اس قدر سونے یا چاندی کی قیمت کے مساوی نوٹوں کی ادائیگی پر معاملہ کرنا جائز نہ ہوگا؛ کیوں کہ یہ سود کی صورت ہے، کرنسی نوٹ ایک جنس ہے اور اس کی اسی جنس سے تبادلہ کی صورت میں ادائیگی سواء بسواء اور مثلاً بمثل کے اصول پر ہونی چاہئے اور یہ ضروری ہے، فقہی نقطہ نظر سے دیکھئے تو ثمن کا تبادلہ سونے کی مقدار سے ادھار ہے اور پھر سونے کی مقدار کو ثمن کی شکل میں اضافہ کے ساتھ حاصل کرنا ہے اس لئے اس کے جواز کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔

۲- مہر کے معاملہ میں فریقین مہر کو ابتداء ہی سے سونا یا چاندی ہی کی شکل میں طے کرلیں، اس تکلف کی آخر کار کیا ضرورت ہے؟ کہ نوٹوں میں مہر مقرر کیا جائے اور سونا یا چاندی میں اس کی مالیت طے کی جائے، پھر ادائیگی کے وقت سونا یا چاندی کی قیمت کے مساوی نوٹ حاصل کئے جائیں۔ صاف اور سیدھی بات یہی ہے کہ سونا یا چاندی کی شکل میں طے کرلے، اب

اگر عورت چاہے تو اس وقت سونے یا چاندی کے بازاری نرخ سے نوٹ وصول کرسکتی ہے اور اس میں شرعاً کوئی قباحت اور حرج بھی نہیں، عورت کو کوئی خسارہ بھی نہیں اور مرد پر کوئی زائد بوجھ بھی نہیں آتا۔

وقت پر ادا نہ ہونے والی تنخواہوں اور اجرتوں کو اشاریہ سے مربوط کرنے کے سلسلے میں شرعی نقطۂ نظر:

اجرتوں اور تنخواہوں کے باب میں حکم قرضوں جیسا ہی ہوگا جب کہ اجرت قرض بن جائے یعنی اس میں بھی مقدار میں مثلیت معتبر ہوگی قیمت اور اشاریہ سے جوڑنا جائز نہیں ہوگا۔

دراصل اجرت اور تنخواہ وغیرہ کو اشاریہ سے منسلک کرنے کی چند صورتیں ہوسکتی ہیں:

پہلی صورت: اجرت کو نوٹوں کے ذریعہ طے کی جائے، کہ اتنی اجرت یا تنخواہ دی جائے گی اور پھر مالک ومزدور یا کمپنی یا حکومتی ادارہ اور اس کے ملازمین کے درمیان یہ بات بطور معاہدہ طے ہوجائے کہ اجرت اور تنخواہ اشاریہ کی زیادتی کے تناسب سے بڑھتی جائے گی اور دونوں اس پر رضامند بھی ہوگئے، اب کتنی اجرت ہر سال بڑھے گی اس کا تناسب معلوم نہیں، اس صورت میں اجیر یعنی ملازم یا مزدور کی تنخواہ فی الحال مثلاً چار ہزار روپے ماہانہ ہے، اب جب نیا سال شروع ہوگا تو قیمتوں کا اشاریہ دیکھا جائے گا اور اس میں سال بھر جس تناسب سے زیادتی ہوئی ہے اسی تناسب سے اجرت اور تنخواہ میں زیادتی ہوگی مثلاً ۱۰ رفیصد اضافہ ہوا ہے تو اب اس ملازم کی تنخواہ چار ہزار چارسو ہوجائے گی اور ہر سال اس زیادتی پر عقد کی تجدید ہوگی۔ شرعی نقطۂ نظر سے یہ صورت جائز ہے؛ کیوں کہ دونوں ہر سال ایک معین زیادتی پر راضی اور متفق ہوگئے ہیں، اگرچہ تناسب مجہول ہے لیکن وہ پیمانہ معلوم ہے جس سے تناسب کی زیادتی کی جہالت دور ہوجاتی ہے، اس لئے زیادتی کے مقدار میں جو جہالت کا شبہ تھا وہ دور ہوگیا؛ کیوں کہ ایسے عقود میں جہالت یسیرہ قابل تحمل ہے، جب کہ اس کا ازالہ بھی ہوجاتا ہو، لہذا یہ صورت جائز ہوگی۔

فتاوی ہندیہ (۴/ ۴۱۲) پر مرقوم ہے:

''وإن كان في البلد نقود مختلفة فإن كانت في الرواج على السواء ولا فضل للبعض على البعض فالعقد جائز ويعطي المستأجر أي النقود شاء وإن كانت الأجرة مجهولة لأن هذه الجهالة لا تفضي إلى المنازعة''۔

الموسوعۃ الفقہیہ (۱/ ۲۶۳) پر مرقوم ہے: "ولو كانت في الأجر جهالة مفضية للنزاع فسد العقد"۔

مذکورہ بالا دونوں عبارتوں سے صرف یہ بتلانا ہے کہ اجرت کی جہالت مفضی الی المنازعۃ ہوتب تو عقد فاسد ہوجاتا ہے، اور اگر جہالت یسیرہ ہو، مفضی الی المنازعۃ نہ ہو، اور کسی طرح اس کا ازالہ ہوجاتا ہوتو یہ قابل تحمل ہے، اور عقد صحیح ہوجاتا ہے۔ اجرت کی مذکورہ صورت میں تناسب مجہول ہے، مگر اس کو معلوم کرنے کا معیار تیار کردہ اشاریہ موجود ہے، جس سے جہالت کا ازالہ ہوجاتا ہے؛ لہذا یہ جہالت صحت عقد کے لئے مانع نہیں ہے۔

اجرت کو اشاریہ سے مربوط کرنے کی دوسری صورت یہ ہے کہ اجرت کی تعیین نوٹوں کی ایک معلوم مقدار پر ہوجائے، مثلاً کسی نے زید کو ایک مہینہ کی ملازمت کے لئے رکھا اور یہ بات طے ہوئی کہ مہینہ کے اخیر میں اس ملازم کو قیمتوں کے اشاریہ کا لحاظ کرتے ہوئے اتنی رقم اجرت میں دے گا جو فی الحال ایک ہزار روپیہ کے مساوی ہوگی۔ مگر اس شرط کے ساتھ کہ مالک کے ذمہ یہ معلوم مقدار واجب الاداء نہیں بلکہ مہینہ کے اخیر میں قیمتوں کے اشاریہ کے لحاظ سے اس مقدار معلوم (ایک ہزار) کے مساوی اور برابر واجب الاداء ہے۔

اب مہینہ کے اخیر میں دیکھا تو قیمتوں کے اشاریہ میں دو فیصد کے تناسب سے قیمتوں میں اضافہ ہوا ہے، تو اب مالک زید کو اخیر میں ایک ہزار بیس روپے ادا کرے گا؛ کیوں کہ اس وقت یہ ایک ہزار بیس روپے مہینہ کی شروعات کے ایک ہزار روپے کی مالیت اور قیمت کے مساوی

اور برابر ہیں۔ پھر جب مہینہ کے اخیر میں یہ طے ہوگیا کہ اجرت ایک ہزار بیس روپے ہے، تو اب یہ اجرت دائمی طور پر اتنی ہی رہے گی، اس میں اشاریہ کے اضافہ سے اضافہ نہیں ہوگا، چاہے مالک نے ادائیگی میں ایک سال کی مدت لگادی، پھر بھی اب ایک ہزار بیس روپے ہی ادا کرنے ہیں۔

شرعی نقطۂ نظر سے اس شرط کے ساتھ یہ صورت بھی جائز ہونی چاہئے کہ اشاریہ اور اس کے حساب کا طریقہ فریقین کو اچھے طریقے سے معلوم ہو، تاکہ اشاریہ اور حساب کے طریقے سے جہالت باہمی نزاع کا باعث نہ بنے۔

حضرت مفتی تقی عثمانی دامت برکاتہم نے اس مسئلہ کو ایک اور مسئلہ سے تشبیہ دی ہے، اس کو یہاں نقل کرتا ہوں۔ فقہی مقالات: ج ا، ص: ۷۶ آپ تحریر فرماتے ہیں کہ ''جیسے کہ ایک شخص نے کسی کو ملازم رکھا اور اجرت میں طے کی کہ مہینہ کے اخیر میں دس گرام سونے کی قیمت جو ہوگی وہ مالک کے ذمہ ادا کرنی واجب ہوگی، جب مہینہ کے اخیر میں دیکھا تو دس گرام سونے کی قیمت دو ہزار روپے تھی، تو خود بخود طے ہوگیا کہ اجرت دو ہزار روپے ہے۔ اب اس کے بعد اس اجرت میں نہ تو زیادتی ہوگی اور نہ کمی ہوگی، چاہے سونے کی قیمت اس کے بعد زیادہ ہوجائے یا کم ہوجائے اس سے اجرت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

بہر حال یہ تو ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی پر ایک دینار واجب الاداء ہے، جس کی ادائیگی مہینہ بعد ہے، اور واجب ہونے کے دن ایک دینار کی قیمت دس درہم ہے لیکن ادائیگی کے دن اس کی قیمت گیارہ درہم ہوگئی تو اس پر اس وقت گیارہ درہم واجب ہوں گے۔ جیسا کہ وہ اس روایت جس میں آپ ﷺ نے فرمایا: "**لا بأس أن تأخذها بسعر يومها**" (پوری حدیث گذر چکی ہے) سے ثابت ہوتا ہے، لہذا یہ صورت جائز ہوگی۔

تیسری صورت اشاریہ سے اجرتوں کو مربوط کرنے کے متعلق یہ ہے کہ اجرت تو معینہ مقدار پر طے ہوجائے اور شرط بھی کرلی جائے کہ مالک اس اجرت کو ادا کرنے کا ذمہ دار ہے جو

اس عقد میں طے ہوئی ہے، لیکن مالک ادا کرتے وقت قیمتوں کے اشاریہ میں جس تناسب سے اضافہ ہوا ہے اسی تناسب سے اجرت میں بھی اضافہ کرے گا۔

جس کی مثال یہ ہے کہ کسی شخص نے ایک ہزار روپے کے عوض میں ملازمت پر کسی کو رکھا اور دونوں کے درمیان طے ہوگیا کہ اجرت ایک ہزار روپے ہے، لیکن مالک پر یہ ضروری ہوگا کہ ادائیگی کے وقت اشاریہ میں جس تناسب سے اشیاء کی قیمت میں اضافہ ہوگا اسی تناسب سے وہ بھی ہزار روپیہ میں اضافہ کرے گا۔ لہذا مہینہ کے آخری دن میں اشاریہ میں دو فیصد اضافہ ہوا ہے تو ایک ہزار بیس روپے ادا کرے گا، اور اگر یہ اجرت سال کے بعد ادا کی اور قیمتوں کے اشاریہ میں دس فیصد اضافہ ہوا ہے، تو سال کے بعد دس فیصد کا اضافہ کر کے ادا کرے گا۔

اس صورت کا حکم قرضوں کو اشاریہ سے مربوط کرنے کی طرح ہے کہ وہ ناجائز ہے، لہذا یہ بھی ناجائز ہے؛ کیوں کہ مالک نے مہینہ کے بعد یہ تنخواہ ادا نہیں کی بلکہ پورا سال گزر گیا تو یہ تنخواہ مالک کے ذمہ قرض ہوگئی، اب وہ اگر سال گزرنے کے بعد تنخواہ ادا کرتا ہے تو اس وقت اشاریہ میں دس فیصد کا اضافہ ہوا ہے، تو تنخواہ میں بھی دس فیصد اضافہ کر کے دے گا، شرعی نقطۂ نظر سے یہ صورت ناجائز ہے؛ کیوں کہ یہاں بھی اجرت (جو کہ میعاد گزرنے پر قرض بن چکی ہے) کو قیمتوں کے اشاریہ سے مربوط کیا گیا، اور قرض کو اشاریہ سے مربوط کرنا باب ربا کو کھولنا بلکہ اس کو رائج کرنا، نیز تقویت دینا ہے۔ معاً دوسری خرابی یہ ہے کہ اس صورت میں اجرت مجہول ہوجاتی ہے اور صحت عقد اجارہ کے لئے اجرت کا معلوم و متعین ہونا ضروری ہے، جیسا کہ کتب فقہ میں اس طرح کی عبارت منقول و مذکور ہے: "ولو كان فى الأجر جهالة مفضية للنزاع فسد العقد" (الموسوعة الفقہیہ ۱/ ۲۶۳)، یعنی کہ اجرت کی مفضی الی النزاع جہالت عقد اجارہ کو فاسد کر دیتی ہے، لہذا اس صورت میں بھی اجرت کو اشاریہ سے مربوط کرنا جائز نہیں ہوگا۔

هذا ما عندي والله أعلم بالصواب۔

کرنسی کو اشاریہ سے مربوط کرنا
وضاحت اور شرعی حکم

مولانا راشد حسین ندوی ☆

افراط زر کا مسئلہ:

پہلے زمانہ میں سونے چاندی کے سکے رائج تھے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ طویل عرصہ تک کرنسی کی قوت خرید یکساں رہتی تھی، اور فرق ہوتا بھی تھا تو بہت معمولی، اور طویل مدت کے بعد واقع ہوتا تھا، لیکن موجودہ دور میں سونے چاندی کے سکوں کی جگہ نوٹ نے لے لی ہے، شروع میں اس نوٹ کا تعلق سونے سے رہا کرتا تھا، لیکن خاص اسباب کے تحت بعد میں یہ تعلق بھی ختم ہوگیا، چنانچہ مولانا تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

''اس طرح اب سونا کرنسی کے دائرہ سے بالکل خارج ہو چکا ہے، اور اب سونے کا کرنسی سے کوئی تعلق باقی نہیں رہا ہے، اور نوٹوں اور زر علامتی (یعنی کم قیمت کے سکوں) نے پوری طرح سے سونے کی جگہ لے لی ہے، اب نوٹ نہ سونے کی نمائندگی کرتے ہیں نہ چاندی کی، بلکہ ایک فرضی قوت خرید کی نمائندگی کرتے ہیں'' (فقہی مقالات ۱/۲۱)۔

اس کا نتیجہ اب یہ نکلا ہے کہ نوٹ کی قوت خرید کا تعلق اب چیزوں کی مہنگائی اور ان کے

☆ مدرسہ ضیاء العلوم تکیہ، رائے بریلی۔

سستا ہونے سے ہے، خود اپنی ذات سے اس میں سستا مہنگا سونے کی صلاحیت نہیں ہے، نہ پیدائشی دھاتوں کی قیمتوں میں کمی بیشی سے اس میں فرق پڑتا ہے۔

مولانا عثمانی فرماتے ہیں:

''موجودہ علم معاشیات کے الفاظ میں اس کی تشریح اس طرح کی جاسکتی ہے کہ آج کے دور میں کرنسی کی اندرونی قیمت کا مدار ملک میں افراط زر اور تفریط زر پر ہوتا ہے، اگر ملک میں افراط زر ہو جائے تو کرنسی کی قیمت کم ہو جاتی ہے، اور جب تفریط زر ہو جائے تو کرنسی کی قیمت بڑھ جاتی ہے'' (ایضا ۱/۴۹)۔

آگے اس کو سمجھاتے ہوئے فرماتے ہیں:

تفریط زر کے وقت ہم کرنسی کے ذریعہ اشیاء صرف کی بڑھتی مقدار خرید سکتے ہیں، مثلاً اس وقت ہم سو روپے میں مندرجہ ذیل اشیاء خرید سکتے ہیں:

گندم ۲۰ کلو

نمک ۲۰ کلو

کپڑا ۱۰ میٹر

آگے فرماتے ہیں: ''افراط زر کے وقت وہی اشیاء مندرجہ ذیل مقدار میں خرید سکیں گے:

گندم ۱۰ کلو

نمک ۱۰ کلو

کپڑا ۵ میٹر'' (ایضاص/۵۰)۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر ایک شخص نے تفریط زر کے وقت کسی سے سو روپے ادھار لیے، یا ایک ہزار مہر مقرر کی، یا اسی کے مثل کوئی مؤخر مطالبہ اپنے ذمہ لیا، اور ان چیزوں کی ادائیگی وہ

افراطِ زر کے وقت کررہا ہے، تو ادائیگی کے وقت جتنا اس نے لیا تھا یا جتنا اس پر لازم تھا اتنی رقم ہی کا ادا کرنا اور اس میں کمی بیشی نہ کرنا اس پر لازم ہے، ورنہ سود لازم آئے گا، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اگر وہ صرف سو روپے واپس کررہا ہے تو کیا جتنا اس پر لازم ہوا تھا اتنا اس نے ادا کیا؟ صاف ظاہر ہے کہ لزوم تفریط کے وقت ہوا، واپسی افراط کے وقت ہورہی ہے، لہذا جتنی اشیاء سو روپے سے لیتے وقت مل سکتی تھیں اب نہیں مل سکتی ہیں، تو کیا صرف سو روپے کی واپسی مقرض پر ظلم نہیں؟ اور چوں کہ افراطِ زر ہی زیادہ تر ہوا کرتا ہے اس لئے مقرض ہمیشہ ہی گھاٹے میں رہتا ہے، تو یہ تو عجیب بات ہے کہ وہ کسی کی امداد بھی کرے اور اس کو مزید گھاٹے میں بھی مبتلا کردیا جائے۔

اس فکر کے تحت بعض ماہرین معاشیات نے یہ حل نکالا کہ کیوں نہ اس طرح کی ادائیگیوں کو قیمتوں کے اشاریہ (Price Index) سے مربوط کردیا جائے، اس سے مقرض اس نقصان سے محفوظ رہے گا، برازیل، آسٹریلیا اور اسرائیل جیسے چند ممالک نے اس نظام کو پسند کیا اور اپنا بھی لیا، ہمیں اس شکل کا شرعی حکم دریافت کرنا ہے، لہذا پہلے ہم کو اس پرائس انڈیکس کا مطلب سمجھنے کی ضرورت ہے، اس لئے کہ یہ خالص اقتصادی صطلاح ہے، مولانا تقی عثمانی صاحب اس کو سمجھاتے ہوئے فرماتے ہیں:

''زیر بحث مسئلہ کا شرعی حکم جاننے کے لئے قیمتوں کا اشاریہ وضع کرنے کا طریقہ اور کرنسی کی قیمت میں اس کے استعمال کو جاننا ضروری ہے، لہذا قرضوں کا قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ تعلق کے مسئلہ میں ماہرین معاشیات جو طریقہ اختیار کرتے ہیں اس کا خلاصہ ہم آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں:

جاننا چاہئے کہ کرنسی چاہے دھات کی ہو یا کاغذی کرنسی ہو وہ بذاتِ خود مقصود نہیں ہوتی، اس لئے کہ وہ کرنسی بذاتِ خود نہ تو بھوک مٹاسکتی ہے اور نہ اس سے جسم کو ڈھانپا جاسکتا ہے، اور نہ اس کے ذریعہ خواہش پوری کی جاسکتی ہے، اور نہ اس کے ذریعہ تکلیف دور کی جاسکتی ہے،

بلکہ اس کرنسی کے ذریعہ انسان اپنی ضروریات زندگی کی اشیاء وخدمات خریدتا ہے، اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہر کرنسی کی دو قیمتیں ہوتی ہیں، ایک اس کی ظاہری قیمت (Face Value) یہ وہ قیمت ہے جو اس کرنسی پر رکھی ہوتی ہے، دوسری اس کی واقعی قیمت (Real Value) یعنی اس کرنسی کا حقیقی عملی فائدہ جو ایک انسان اپنی ضروریات میں اس کرنسی کو خرچ کر کے حاصل کرتا ہے، اس کو دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس کرنسی کی حقیقی قیمت اشیاء اور خدمات کا وہ مجموعہ ہے جو ایک انسان کے لئے اس کرنسی کے ذریعہ خریدنا ممکن ہو، آج کل اقتصادیین اشیاء کے اس مجموعہ کا نام ''اشیاء کی ٹوکری'' (Basket of Goods) رکھتے ہیں، لہذا کرنسی کی حقیقی قیمت وہ اشیاء کی ٹوکری ہے جس کو کرنسی کے ذریعہ خریدنا ممکن ہو'' (ایضاً، ص ر ۵۹)۔

پھر آگے موصوف نے تفصیل سے سمجھایا ہے کہ یہ قوت خرید یکساں نہیں رہتی، اس میں تغیر ہوتا رہتا ہے، اگر ۲۰۰۹ء میں پانچ ہزار روپے میں اشیاء کا ایک خاص مجموعہ ملتا ہے تو ۲۰۱۲ء میں ہوسکتا ہے کہ یہ مجموعہ ۱۰ ہزار میں ملے، مولانا فرماتے ہیں:

''اگر ہم فرض کریں کہ ۱۹۸۰ء میں ایک شخص کی ماہانہ تنخواہ پانچ ہزار روپے تھی، اور ۱۹۸۷ میں اس کی تنخواہ زیادہ ہوکر دس ہزار روپے ہوگئی، تو اس کی ماہانہ تنخواہ کی قیمت اور حیثیت کا حساب مندرجہ ذیل طریقہ سے کیا جائے گا:

سال	تنخواہ کی ظاہری قیمت	نرخنامہ میں زیادتی کا تناسب	حقیقی قیمت
۱۹۸۰ء	۵۰۰۰ روپے	۱،۰	۵۰۰۰
۱۹۸۷ء	۱۰۰۰۰ روپے	۲،۵	۴۰۰۰

مندرجہ بالا مثال میں آپ دیکھیں گے کہ اگر چہ اس شخص کی تنخواہ کی ظاہری قیمت دس ہزار روپے ہوگئی لیکن اس کی تنخواہ کی حقیقی قیمت ۱۹۸۰ء کی قیمتوں کی سطحوں پر نظر رکھتے ہوئے چار ہزار روپے ہوگئی، اس لئے کرنسی کی حقیقی قیمت کو دیکھتے ہوئے ۱۹۸۷ء کے دس ہزار روپے

۱۹۸۰ء کے چار ہزار روپے کے مساوی ہوگئے" (ایضا، ص ۶۲، ۶۳)۔

اس طرح اگر کسی نے ۱۹۸۰ء میں چار ہزار روپے قرض لئے تھے، تو اگر ہم قرضوں کی ادائیگی کو قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ وابستہ کردیں تو ۱۹۸۷ء میں اسے دس ہزار واپس کرنے ہوں گے، اس لئے کہ اس کی حقیقی قیمت معتبر ماننے کا مطلب یہی ہوگا۔

مسئلہ کی وضاحت کے بعد سوال پر شرعی حیثیت سے نگاہ ڈالتے ہیں:

مسئلہ مختلف فیہ ہے:

اس مسئلہ کے شرعی جواب میں علماء کے دو فریق ہوگئے ہیں: مجوزین، اور مانعین، ہم دونوں کے دلائل ترتیب وار لکھتے ہیں؛ تا کہ مسئلہ کی حقیقت تک پہنچنا اور صحیح صحیح حکم شرعی دریافت کرنا آسان ہوجائے۔

مجوزین کے دلائل:

اشاریہ سے وابستہ کرنے کو جائز قرار دینے والے مندرجہ ذیل دلائل سے استدلال کرتے ہیں:

۱۔ قرآن مجید میں کئی مقامات میں ناپ تول میں برابری کی تائید کی گئی ہے، ارشاد ہے:

"أوفوا الكيل والميزان بالقسط" (سورۃ الانعام/ ۱۵۲)۔

(اور ناپ تول پوری پوری کیا کرو)۔

"وزنوا بالقسطاس المستقيم" (سورۃ الشعراء/ ۱۸)۔

(اور سیدھی ترازو سے تولا کرو)۔

ایفاء بالقسط کا یہ حکم صرف کیلی اور وزنی چیزوں ہی کے لئے نہیں ہے، اس کا تعلق تمام مالی معاملات سے ہے، اور مؤخر مطالبات چاہے قرض ہو یا مہر ہو، اگر ادائیگی کے وقت افراط زر

ہوگیا ہے، تو صرف لی گئی تعداد کی ادائیگی کو اس کی حقیقی قیمت کی ادائیگی نہیں قرار دیا جا سکتا ہے، ہاں اگر اس کو اشاریہ سے منسلک کردیا جائے تو یہ ضرر دور ہوسکتا ہے (معرض للمؤلفات الاسلامیہ ص ۵ او ۴۴ بحوالہ البحوث الفقہیہ المعاصرۃ، العدد الثانی والثلاثون ۱۴۱۷ھ، ص ۶۱)۔

۲-حدیث شریف میں اموال ربویہ کی ایک دوسرے سے بیع کے وقت، مثلاً بمثل کا حکم ہے، چنانچہ حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت میں ہے:

"عن أبی سعید الخدریؓ أن رسول الله ﷺ قال: "لا تبیعوا الذهب بالذهب إلا مثلا بمثل" (بخاری: بیوع، باب بیع الفضۃ بالفضۃ، رقم: ۲۱۷۷، مسلم، مساقاۃ، باب الربا رقم: ۱۵۸۷) (سونے کو سونے سے نہ بیچو مگر برابر سرابر)۔

اس کا تقاضہ یہ ہے کہ دین یا قرض کی ادائیگی کے وقت اس کی حقیقی قیمت واپس کی جائے، اور یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب اشاریہ سے وابستہ کرکے واپسی کی جائے، اگر ایک شخص نے ایک ہزار روپے کا پنکھا خریدا، یا دس ہزار روپے قرض لیا، یا بیوی کا مہر پانچ ہزار روپے مقرر کیا، اور ان مطالبات کی واپسی دس سال بعد کی، تو اگر اس نے اشاریہ سے وابستہ نظام یعنی اشیاء کی ٹوکری کا اعتبار کرکے ان مطالبات کی ادائیگی کی تو اس نے درحقیقت ان رقوم کا صحیح مثل ادا کیا ہے، اور اگر ایسا نہیں کیا تو اس نے مقرض پر گویا ظلم کیا ہے، جب کہ فقہ کا مسلمہ قاعدہ ہے: "الضرر یزال" اور اشاریہ سے منسلک کرکے اس ضرر کو آسانی سے دور کیا جا سکتا ہے (مجلہ مذکور بحوالہ ربط المعاملات بمستوی الاسعار، ص ۱۶)۔

۳-سامان کو نقد بیچتے وقت الگ قیمت پر اور ادھار بیچتے وقت الگ قیمت پر بیچنا جائز ہے (المبسوط للسرخسی ۱۳/۸، معجم المغنی ۱/۱۴۰، مسئلہ: ۱۰۹)، یہ مسلک جمہور کا ہے اس سے معلوم ہوا کہ ان حضرات نے بھی تسلیم کیا ہے کہ کسی چیز کی قیمت الگ الگ زمانہ میں الگ الگ ہوسکتی ہے (ربط المعاملات، ص ۲۴)۔

۴- امام ابو یوسف کے فلوس کے سلسلہ میں مسلک سے بھی ان حضرات کا استدلال ہے، ان کا قول علامہ شامی نے المنتقی کے حوالہ سے ان الفاظ سے نقل کیا ہے:

''وفی المنتقی: إذا غلت الفلوس قبل القبض أو رخصت قال أبویوسف: قولی وقول أبی حنیفة فی ذلک سواء ولیس له غیرها، ثم رجع أبویوسف، وقال: علیه قیمتها من الدراهم یوم وقع البیع ویوم وقع القبض''(الی) هکذا فی الذخیرة والخلاصة بالعزو إلی المنتقی، وقد نقله شیخنا فی بحره وأقره، فحیث صرح بأن الفتوی علیه فی کثیر من المعتبرات فیجب أن یعول علیه إفتاء وقضاءً (إلی قوله) یوم وقت البیع أی فی صورة البیع وقوله ویوم وقع القبض أی فی صورة القرض کما نبه علیه فی النهر''

(شامی ۴/۲۶، ۲۷ کتاب البیوع مطلب مہم فی احکام النقود اذا کسدت، وتنبیہ الرقود علی مسائل النقود، رسائل ابن عابدین ۲/ ۶۰، سہیل اکیڈمی لاہور)۔

(اور المنتقی میں ہے: جب قبضہ سے پہلے فلوس کی قیمت گراں ہوجائے یا سستی ہوجائے تو امام ابو یوسف فرماتے ہیں: میرا اور امام صاحب کا قول اس کے بارے میں یکساں ہے، اور اس کو وہی فلوس ملیں گے، پھر امام ابو یوسف نے رجوع کرلیا اور فرمایا: اس کے اوپر دراہم سے ان فلوس کی اس روز کی قیمت لازم ہوگی جس روز بیع واقع ہوگی اور جس روز قبضہ واقع ہوا (آگے ہے) الذخیرہ اور الخلاصہ میں المنتقی کے حوالہ سے یہی ہے، ہمارے شیخ نے البحر میں نقل کرکے اس کا اثبات کیا ہے، تو جبکہ بہت سی معتبرات میں تصریح کی گئی ہے کہ فتوی اسی پر ہے تو ضروری ہے کہ فتوی اور قضاء میں اس پر اعتماد کیا جائے (آگے ہے) مصنف کا قول: جس روز بیع واقع ہوئی ہو کا مطلب ہے بیع ہونے کی صورت میں اور مصنف کا قول جس روز قبضہ واقع ہوا ہو کا مطلب قرض کی صورت میں)۔

ظاہر بات ہے کہ فلوس ثمن اصطلاحی قرار دیئے جاتے ہیں، اور نوٹ بھی ثمن اصطلاحی ہیں، لہذا جب فلوس کے سلسلہ میں امام ابو یوسف کا مفتی بہ قول اس کی یوم بیع و یوم قبض والی قیمت کا لحاظ کر کے ادائیگی کا ہے تو کوئی شبہ نہیں کہ یہ قول قرضوں کے اشاریہ کے ساتھ مربوط کرنے کو کھلی تائید کرتا ہے، اس لئے کہ نوٹ کے ثمن اصطلاحی ہونے پر علماء کا اتفاق ہو چکا ہے، چنانچہ فقہ اکیڈمی کی قرارداد میں ہے:

۱- کرنسی نوٹ سند وحوالہ نہیں ہے، بلکہ ثمن ہے، اور اسلامی شریعت کی نظر میں کرنسی نوٹ کی حیثیت زر اصطلاحی وقانونی کی ہے (نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے ص ۱۱۶، تجاویز دوسرا فقہی سمینار بعنوان کرنسی نوٹ کی شرعی حیثیت)۔

مانعین ربط کے دلائل:

جو حضرات اشاریہ سے وابستگی کے خلاف ہیں ان کا استدلال مندرجہ ذیل دلائل سے ہے:

۱- نوٹ کی حیثیت اب ثمن حقیقی یعنی سونے چاندی جیسی مان لی گئی ہے؛ چنانچہ مجمع الفقہ الاسلامی- جو مؤتمر اسلامی کا ذیلی ادارہ ہے- اپنی قرارداد نمبر (۹/ ۳/ ۱۰۷) میں کہتی ہے:

"إنها نقود اعتبارية فيها صفة الثمنية كاملة ولها الأحكام المقررة للذهب والفضة من حيث أحكام الربا والزكاة والسلم وسائر أحكامها" (مجلة البحوث الفقهية المعاصرة، العدد الثاني والثلاثون ۱۴۱۷ھ، ص/ ۶۸)۔

(یہ ایسے اعتباری سکے ہیں جن میں مکمل ثمنیت پائی جاتی ہے، اور سود، زکوۃ سلم اور تمام احکام میں اس کو سونے چاندی کے مقررہ احکام حاصل ہیں)۔

اور مجمع الفقہ الاسلامی التابع لرابطۃ العالم الاسلامی کی قرارداد میں ہے:

"إن العملة الورقية نقد قائم بذاته له حكم النقدين من الذهب والفضة" (ایضا)۔

(کاغذی نوٹ مستقل کرنسی ہے، اس کو نقدین یعنی سونے چاندی کا حکم حاصل ہے)۔

اور جب ہم یہ تسلیم کرلیں کہ یہ سونے چاندی کے حکم میں ہے تو یہ بات متفقہ ہے کہ چاندی یا سونے کے سکہ سے بیع کی جائے تو باعتبار نوع وعدد وہی سکہ متعین ہوجاتا ہے جس کا نام لیا ہے، چاہے اس کی قیمت گھٹ جائے یا بڑھ جائے:

"والذی يغلب على الظن ويميل إليه القلب أن الدراهم المغلوبة الغش أو الخالصة إذا غلت أو رخصت لا يفسد البيع قطعا ولا يجب إلا ما وقع عليه العقد من النوع المذكور فيه، فإن أثمان عرفاً وخلقةً ولا يجري في ذلك خلاف أبي يوسف" (تنبیہ الرقود، رسائل ابن عابدین ۲/ ۶۳)۔

(اور جس کا ظن غالب ہے اور جن کی طرف دل کا میلان ہے یہ ہے کہ جن دراہم پر کھوٹ غالب ہو یا جو خالص ہوں جب گراں ہوجائیں یا ارزاں ہوجائیں تو بیع قطعاً فاسد نہیں ہوگی اور جس پر عقد واقع ہوا ہے یعنی ذکر کردہ نوع، وہی واجب ہوگی، اس لئے کہ وہ عرفاً اور خلقۃً ثمن ہیں، اور اس میں امام ابو یوسف کا اختلاف جاری نہیں ہوگا)۔

۲- حدیث شریف میں صاف صاف فرمایا گیا ہے:

"لا تبيعوا الدينار بالدينارين، ولا الدرهم بالدرهمين" (مسلم، مساقاۃ، باب الربا، رقم: ۴۰۵۷)۔

(ایک دینار کی دو دینار سے اور ایک درہم کی دو درہم سے بیع نہ کرو)۔

جب سونے کی بیع سونے سے اور چاندی کی بیع چاندی سے ہورہی ہو تو صریح طور سے اس میں زیادتی کرنے کو سود قرار دیا گیا:

''الذهب بالذهب وزنا بوزن، مثلا بمثل والفضة (إلى) فمن زاد أو استزاد فهو ربا'' (مسلم: مساقاۃ، باب الصرف، رقم: ۴۰۶۹)۔

(سونے کی بیع سونے سے ہم وزن اور مثلیت کے ساتھ اور چاندی کی چاندی سے (آگے ہے) تو جو زیادہ دے یا زیادتی طلب کرے تو سود ہوگا)۔

پھر جب ہم نے نوٹ کو بھی نقدین کی طرح مان لیا تو اس میں بھی مکمل طور سے یہی احکام جاری ہونے چاہئیں، اور اشاریہ سے منسلک کرنے میں یہ بات لازمی طور سے ہوگی۔

۳-یہ مسلک کھلے طور پر ایک حدیث سے متصادم ہے:

''عن ابن عمر رضي الله عنهما قلت: يا رسول الله! إني أبيع الإبل بالبقيع فأبيع بالدنانير وآخذ هذه من هذه و أعطي هذه من هذه، فقال رسول الله ﷺ: لا بأس أن تأخذها بسعر يومها ما لم تفترقا وبينكما شيئ'' (ابوداؤد: بیوع، باب فی اقتضاء الذہب من الورق، رقم: ۳۳۵۴، مسند احمد، رقم: ۶۲۳۹، والحاکم بیوع ۲/۰۱ ۳، رقم: ۲۲۸۵، وقال: صحیح علی شرط مسلم ووافقہ الذہبی)۔

(حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں: میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں بقیع (یا نقیع) میں اونٹ فروخت کرتا ہوں، تو دیناروں کے بدلہ بیچتا ہوں اور دراہم لیتا ہوں اور دراہم سے بیچتا ہوں اور دینار لیتا ہوں، اور اس کے بدلہ اس کو لیتا ہوں، اور اس کے بدلہ اس کو دیتا ہوں، تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اس میں کوئی حرج نہیں کہ تم اس کو اسی دن کے بھاؤ میں لے لو بشرطیکہ تم دونوں اس حال میں جدا نہ ہو کہ تمہارے درمیان کوئی چیز (باقی) ہو)۔

معلوم ہوا کہ جس دن دراہم کے بدلہ میں دینار یا دینار کے بدلہ میں دراہم دیتے ہیں، اسی دن ان کے قیمت کا اعتبار کیا جا رہا ہے، یہ نہیں دیکھا جا رہا ہے کہ معاملہ کے دن ان کی کیا قیمت تھی، جب کہ اشاریہ کا تقاضہ یہ ہے کہ یوم عقد کی قیمت کا اعتبار کیا جائے۔

۴- مؤخر مطالبات کی تمام انواع میں تعیین شرط ہے، چاہے بیع کی ثمن ہو، چاہے مہر ہو، اسی طرح قرض لیا تو اس میں بھی مثلیت مشروط ہے، اشاریہ سے ربط کرنے میں اس میں جہالت ہوگی، صحیح مقدار بائع مشتری، مقرض، مستقرض، شوہر بیوی کسی کو بھی معلوم نہیں ہوگی، اس لئے نہ تو اس طرح قرض لینا صحیح ہوگا، نہ عقد بیع صحیح ہوگا، نہ تعیین مہر صحیح ہوگی۔

۵- اگر ہم اشاریہ سے ربط کو جائز قرار دیں تو یہ بھی جائز ہونا چاہئے کہ گیہوں وغیرہ جیسے سامان کو قرض لے کر ان کو بھی اشاریہ سے جوڑ دیں جب کہ اس کا کوئی بھی قائل نہیں ہے۔ علامہ ابن قدامہ فرماتے ہیں:

"یجب رد المثل فی المکیل والموزون لا نعلم فیه خلافاً"

(المغنی ۴؍ ۳۵۷، بیوع، باب القرض، ط مکتبہ دار البیان)۔

(کیلی اور وزنی چیزوں میں مثل کا لوٹانا واجب ہے، اس کے متعلق ہمیں کسی اختلاف کا علم نہیں ہے)۔

۶- اصل یہ ہے کہ اشیاء کی قیمت کا اندازہ نقود سے کیا جائے، اور اشاریہ کا قائل ہونے پر یہ لازم آئے گا کہ نقود کا اندازہ سامانوں سے کیا جائے، یہ بلاشبہ قلب موضوع ہے۔

دلائل کا جائزہ:

۱- جہاں تک اشاریہ کے حامیوں کی پہلی دلیل کا تعلق ہے تو وہ بہت کمزور ہے، اس لئے کہ یہاں حکم پوری پوری ناپ تول کا ہے کہ جب دوسرے کے لئے تولا جائے تو اسی طرح پورا پورا دیا جائے جیسا کہ اپنے لئے تو لتے وقت پورا پورا لیا جاتا ہے۔

تفسیر ابن کثیر میں فرماتے ہیں:

"أی إذا دفعتم للناس فکملوا الکیل لهم، ولا تبخسوا الکیل فتعطوه ناقصا، وتأخذوه إذا کان لکم تاماً وافیاً ولکن خذوا کما تعطون، وأعطوا کما

تأخذون" (تفسیر ابن کثیر ۳/ ۳۴۴، ط دار الجیل بیروت، فی تفسیر قولہ تعالیٰ: أوفوا الکیل ولا تکونوا من المخاسرین- سورۃ الشعراء/ ۱۸۱)۔

(یعنی جب لوگوں کو دینے لگو تو ان کا پیمانہ مکمل کرو، اور پیمانہ میں کمی نہ کرو کہ ادائیگی تو ناقص کرو اور جب تمہیں لینا ہو تو پورا پورا لو، لیکن جس طرح دیتے ہو اسی طرح لو اور جس طرح لیتے ہو اسی طرح دو)۔

اس اعتبار سے یہ دلیل تو ناعیین ربط کی ہے، اس لئے کہ اس کا تقاضہ ہے کہ جتنا دیا ہے ٹھیک ٹھیک وزن اور ناپ کے ذریعہ اتنا ہی لیا جائے، اس سے کمی بیشی نہ کی جائے، آیت کریمہ میں وزن اور کیل کے علاوہ کسی اور چیز کو معیار بنانے کی صاف طور سے نفی ہے، اور اشاریہ سے مربوط کرنے میں وزن اور کیل کے بجائے دوسری مبہم چیزوں پر نگاہ ہوتی ہے، جس کی وجہ سے مقرض اور دائن نے جتنا دیا ہے وزن، کیل اور عدد میں اس سے زیادہ لیتا ہے، اور یہ تو کھلا ہوا ربا الفضل ہے۔

۲- جہاں تک "مثلاً بمثل" والی حدیث کا تعلق ہے تو اس سے استدلال کرنا بھی صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ شریعت میں مثل سے مثل صوری مراد ہے نہ کہ مثل معنوی، چنانچہ مثل کی تعریف کرتے ہوئے فقہاء نے اس کی مثال کیل، وزن اور عدد متقارب سے دی ہے: "المثلی هو ما يوجد مثله في السوق بدون تفاوت يعتد به" (الدر المختار ۵/ ۱۱۷، ۱۱۸، نیز المغنی ۶/ ۴۳۵، بدائع الصنائع ۷/ ۱۵۰)۔

(مثلی وہ ہے جس کا مثل بازار میں بغیر کسی قابل اعتبار تفاوت کے پایا جائے)۔

اسی لئے حدیث میں صراحت سے جنس کو جنس سے بیچتے وقت کیل یا وزن سے برابری کا حکم دیا گیا، قیمت کی طرف ادنی التفات بھی نہیں کیا گیا:

"عن أبي سعيد الخدري وأبي هريرة رضي الله عنهما أن رسول الله

ﷺ استعمل رجلاً علی خیبر، فجاءہ بتمر جنیب فقال رسول اللہ ﷺ: أکل تمر خیبر ھکذا؟ قال: لا واللہ یا رسول اللہ! إنا لنأخذ الصاع من ھذا بالصاعین، والصاعین بالثلاثۃ، فقال رسول اللہ ﷺ: لا تفعل، بع الجمیع بالدراھم ثم ابتع بالدراھم جنیباً'' (بخاری: بیوع، باب إذا أراد بیع تمر بتمر خیر منہ، رقم: ۲۲۰۱، ۲۲۰۲، مسلم: مساقاۃ، باب بیع الطعام مثلاً بمثل، رقم: ۱۵۹۳)۔

(حضرت ابوسعید خدریؓ اور حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک شخص کو خیبر پر عامل بنایا، تو وہ عمدہ کھجوریں لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کیا خیبر کی تمام کھجوریں اسی طرح ہوتی ہیں؟ انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ ایسا نہیں ہے، ہم اس کا ایک صاع دو صاع کے بدلہ میں اور دو صاع تین صاع کے بدلہ میں لیتے ہیں، تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ایسا مت کرنا، سب کو دراہم کے بدلہ بیچو پھر دراہم کے بدلہ عمدہ کھجوریں خریدلو)۔

اس کے علاوہ یہی بات چند احادیث میں صراحت سے آئی ہے:

الف-''عن أبی سعید الخدری أن رسول اللہ ﷺ قال: لا تبیعوا الذھب بالذھب ولا الورق بالورق إلا وزنا بوزن مثلا بمثل سواءً بسواء'' (مسلم: مساقاۃ، باب الربا، رقم: ۴۰۵۵)۔

(حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: سونے کو سونے سے اور چاندی کو چاندی سے نہ بیچو مگر ہم وزن کر کے مثلیت کے ساتھ برابر سرابر)۔

ب- عن أبی ھریرۃؓ قال: قال رسول اللہ ﷺ: الذھب بالذھب وزنا بوزن مثلاً بمثل فمن زاد أو استزاد فھو ربا'' (مسلم: مساقاۃ، باب الصرف، رقم: ۴۰۶۸)۔

گزشتہ حدیث ہی کے مفہوم میں یہ حدیث بھی ہے:

ج-"عن عبادة بن الصامت أن رسول الله ﷺ قال: الذهب بالذهب تبرها وعينها والفضة بالفضة تبرها وعينها والبر بالبر مديا بمدى والشعير بالشعير مديا بمدى والتمر بالتمر مديا بمدى والملح بالملح مديا بمدى"

(ابوداؤد: بیوع، باب فی الصرف، رقم: ۳۳۴۹، ترمذی: بیوع، باب ماجاء أن الحنطة مثلا بمثل، رقم: ۱۲۴۰)۔

احادیث واضح ہیں کہ بقدر ممکن حقیقی تماثل مطلوب ہے، اسی لئے فقہاء نے کیلی چیزوں میں وزن اور وزنی چیزوں میں کیل کا اعتبار نہیں کیا ہے، مغنی میں ہیں:

" لا خلاف بين أهل العلم في وجوب المماثلة (إلى) وأن المساواة المرعية هي المساواة في الكيل كيلا وفي الموزون وزنا" (المغنی ۴/ ۱۳۳، بیوع، باب الربا والصرف، نیز دیکھئے: بدائع الصنائع ۵/ ۱۹۳، ۱۹۴)۔

(اہل علم کے درمیان مماثلت کے وجوب کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے (الی) نیز اس بات میں بھی کہ جس برابری کی رعایت کی جائے گی وہ کیل کرکے کیلی چیزوں میں اور وزن کرکے وزنی چیزوں میں ہوگی)۔

۳-جہاں تک قاعدہ " لا ضرر و لا ضرار" کا تعلق ہے تو اس کے جواب میں کہا جاسکتا ہے:"الضرر لا يزال بضرر مثله" (ضرر کو اسی جیسے ضرر سے زائل نہیں کیا جائے گا)۔

۴-جہاں تک بیع بالتقسیط کے جواز پر قیاس کا تعلق ہے تو اس میں ثمن معلوم ہوتی ہے، اور اس میں ثمن مجہول ہے۔

۵-جہاں تک امام ابو یوسف کے قول سے استدلال کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں مولانا تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں کہ امام ابو یوسف کے اس فتوی کا اشاریہ کے مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس لئے کہ اس وقت افراط وتفریط زر نیز اشاریہ جیسے نئے مسائل معیشت کا تصور ہی موجود نہیں تھا، بات دراصل یہ تھی کہ اس وقت فلوس دراہم ودنانیر کے تابع ہوا کرتے تھے، لیکن

فلوس کی یہ قیمت محض علامتی تھی جس کو لوگوں نے ایک اصطلاح بنالیا تھا، لہذا اگر کبھی دس سکوں کو ایک درہم کے مساوی مانا جاتا ہو تو یہ بھی ممکن تھا کہ کبھی ۲۰ فلوس کو ایک درہم کے مساوی قرار دیا جائے، اس طرح کی صورت حال ہو تو جمہور کے نزدیک سکوں کی اتنی ہی مقدار لوٹائے گا جتنی اس پر عقد کے دن لازم ہوئی تھی، لیکن امام ابو یوسف نے اس مسئلہ میں جمہور سے اختلاف کرتے ہوئے فرمایا: ''اس صورت میں قرض دار ان سکوں کی قیمت واپس کرے گا جو سکے درہم کی بنیاد پر قرض لئے گئے تھے، لہذا مندرجہ بالا مثال میں اگر کسی شخص نے سو سکے قرض لئے تھے تو اب وہ دو سو سکے واپس کرے گا، اس لئے کہ سکے، تو جس شخص نے سو سکے قرض لئے تھے گویا کہ اس نے دس درہم کی ریزگاری قرض لی تھی اور اب ادائیگی کے روز دس درہم کی ریزگاری دو سو سکے ہوگئی اس لئے قرض دار پر دو سو سکے ادا کرنا واجب ہے (فقہی مقالات ۱/۶۸)۔

یہی وجہ ہے کہ خاص اسی موضوع پر منعقد ہونے والے سیمینار میں جس کو اسلامی ترقیاتی بینک جدہ اور عالمی ادارہ برائے اسلامی اقتصادیات اسلام آباد نے مشترکہ طور سے شعبان ۱۴۰۷ھ میں منعقد کیا تھا، مندرجہ ذیل قرارداد پر تمام شرکاء نے اتفاق کیا:

۱- کرنسی نوٹ تمام معاملات (مثلاً اس میں سود جاری ہونے اور زکوۃ واجب ہونے، بیع سلم اور مضاربت اور شرکت وغیرہ کے راس المال بننے) میں نقدین یعنی دراہم اور دنانیر کی طرح ہیں، اور امام ابو یوسف کا یہ قول کہ اگر سکوں کی قیمت زیادہ ہو جائے یا کم ہو جائے تو اس صورت میں قرض کی ادائیگی کے وقت نقدین کے تناسب سے سکوں کی قیمت واپس کرنا ضروری ہے، ان کا یہ قول کرنسی نوٹوں میں جاری نہ ہوگا، اس لئے کہ یہ کرنسی نوٹ نقدین کے قائم مقام ہیں اور ان نقدین کی قیمت بڑھنے اور کم ہونے کا معتبر نہ ہونا متفق علیہ ہے۔

۲- سیمینار میں حاضر تمام علماء نے توثیق کی کہ سود اور قرض کے احادیث میں جو مثلیت اور برابری ضروری قرار دی گئی ہے وہ شرعاً جنس اور قدر یعنی وزن ناپ اور عدد میں برابری مراد

ہے، قیمت میں برابری مراد نہیں، اور یہ بات ان احادیث کے ذریعہ پوری طرح واضح ہو جاتی ہے جو احادیث اموال ربویہ کے تبادلہ کے وقت عمدہ اور گھٹیا ہونے کے وصف کو غیر معتبر قرار دیتی ہیں، اور اس پر امت کا اجماع ہے، اور اس پر عمل جاری ہے۔

۳- ذمہ میں ثابت شدہ دیون چاہے وہ کسی بھی قسم کے ہوں، ان کو قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ منسلک کر دینا جائز نہیں ہے، بایں طور کہ عاقدین عقد بیع یا عقد قرض کے وقت اس کرنسی کو جس کے ذریعہ عقد بیع یا عقد قرض کر رہے ہیں کسی سامان کے ساتھ منسلک کر کے یہ شرط ٹھہرائیں کہ مدیون ادائیگی کے وقت اس سامان کی قیمت موجودہ کرنسی میں ادا کرے گا (فقہی مقالات ۱/۴۷، ۷۳)۔

خلاصہ کلام:

یہ کہ دیون یعنی مؤخر مطالبات خواہ وہ قرض ہو یا مہر یا پنشن (جس کی ادائیگی وقت پر نہ ہو سکے اور ذمہ میں رہ جائے) یا ادھار خریداری کی رقم، یا وقت پر ادا نہ ہو پانے والی تنخواہوں کی ادائیگی) میں سے کسی کو بھی اشاریہ سے وابستہ کرنا شرعاً درست نہیں ہے، اس لئے کہ اشاریہ سے وابستہ کرنا خاصا پیچیدہ نظام ہے، جس سے عقد میں جہالت ہوگی اور اس کے نتیجہ میں تنازعات ہوں گے، پھر اشاریہ سے وابستہ کرنے کے بعد جتنی مقدار لازم ہوئی یا لی گئی اس سے عدد میں اضافہ کر کے واپسی کرنی ہوگی، جب کہ کیلی، وزنی اور عددی چیزوں میں تفاوت سے واپسی کو منع کیا گیا ہے اور سود قرار دیا گیا ہے۔

البتہ تنخواہ اور پنشن جب قرض نہ بنیں، اور متعاقدین کے درمیان یہ معاہدہ ہو جائے کہ یہ تنخواہ یا پنشن ہر سال قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ بڑھتی رہے گی تو اس کا حکم الگ ہوگا؛ اس لئے کہ سال ختم ہونے کے بعد گویا عقد کی تجدید ہوگی، اور نئی تنخواہ یقینی طور سے فریقین کو معلوم ہو جائے گی، لہذا شرعاً اس میں کوئی حرج نہ ہوگا (فقہی مقالات ۲/۵۷)۔

۲-سونے یا چاندی سے تعیین:

مہر کی سونے یا چاندی سے تعیین:

جہاں تک مہر کو سونے چاندی سے متعین کرنے یا پہلے روپیوں سے مقرر کر کے بعد میں سونے چاندی سے تبدیلی کرنے کا تعلق ہے تو اس کے جواز میں کوئی کلام نہ ہونا چاہئے، اور اس کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

۱-مہر میں شرعی احکام کچھ اس طرح کے ہیں کہ اس کو نقدین خاص طور سے چاندی سے جوڑنا ہی پڑتا ہے، اس لئے کہ احناف کے نزدیک اس کی اقل مقدار دس درہم ہے، اب اگر کوئی درہم کے علاوہ سے مہر مقرر کرے جیسا کہ آج کل درہم نہ ہونے کے سبب متعین بات ہے تو دس درہم کا خیال رکھتے ہوئے مقرر کرنا ضروری ہوگا، اس سے کم مقرر کیا تو خود بخود دس درہم یا اس کی مالیت مقرر ہوجائے گی ''أقله عشرة دراهم (إلى) أو عرضا قيمته عشرة وقت العقد'' (الدرالمختار ۲/ ۳۵۷، ۳۵۸، نکاح، باب المہر) (مہر کی کم از کم مقدار دس درہم ہے (آگے ہے) یا اتنا سامان جس کی قیمت عقد کے وقت دس درہم ہو)۔

اسی طرح ایک عام رواج مہر فاطمی پر نکاح کا ہے، اس کی تعیین بھی درہم ہی کے ذریعہ انجام پاتی ہے، لہذا معلوم ہوا کہ نقدین خاص طور سے دراہم سے مہر کا گہرا ربط ہے، تو اگر کوئی مجلس عقد ہی میں چاندی یا سونے سے تعیین کرتا ہے تو گویا وہ اس چیز سے تعیین کر رہا ہے جو باب مہر میں اصل کی حیثیت رکھتی ہے، لہذا اس کے صحیح ہونے میں کوئی کلام نہیں۔

اگر مجلس عقد میں روپئے سے تعیین کی، بعد میں فریقین اسی کی مالیت میں سونا یا چاندی مقرر کر لیتے ہیں تو اس میں بھی کوئی حرج نہ ہوگا، اس لئے کہ جب باہمی رضامندی سے مہر میں حط وزیادتی جائز ہے، فإن زادها في المهر بعد العقد لزمته الزيادة (إلى) وإن حطت عنه من مهرها صح الحط (ہدایہ نکاح، باب المہر ۲/ ۳۲۵، طبع سرمدیم اینڈ کمپنی دیوبند)۔ اسی طرح

پہلے مہر مقرر نہ کی ہو تو بعد میں باہمی رضامندی سے کسی مقدار کی تعیین جائز ہے: "وإن تزوجها ولم يسم لها مهراً ثم تراضيا على تسميته فهي لها الخ" (حوالہ سابق)، تو اگر روپے سے طے کرنے کے بعد باہمی سمجھوتے سے چاندی یا سونے کی تعیین کر لی تو بدرجہ اولی جائز ہوگا، بلکہ مہر کے تسمیہ میں راقم کے نزدیک بہتر یہی ہوگا کہ سونے یا چاندی سے تعیین کی جائے تا کہ عورت کو ضرر لاحق نہ ہو، پھر جب یہ تعیین کر لی جائے گی تو سونے چاندی کی یہی متعینہ مقدار مہر ہوگی، خواہ اس کی قیمت بعد میں گھٹے یا بڑھے۔

ثمن کی سونے یا چاندی سے تقدیر:

جہاں تک بیع کے وقت سونے یا چاندی سے ثمن کی تعیین کا تعلق ہے تو اس کو بھی جائز ہونا چاہئے، اس لئے کہ اگر شروع ہی میں یعنی مجلس عقد ہی میں سونے چاندی سے ثمن طے کی جاتی ہے، تو اس میں تو سرے سے کوئی قباحت ہی نہیں ہے، اس لئے کہ یہ تو سیدھے سیدھے اصل نقد یعنی سونے یا چاندی سے ثمن کی تعیین ہے تو اس میں بھلا کیا خرابی ہو سکتی ہے، اور اگر بعد میں دونوں باہمی رضامندی سے سونے یا چاندی سے تعیین کرتے ہیں تو اس میں بھی بظاہر کوئی حرج نہیں ہے، اور اس کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

۱- جہاں تک ممکن ہو مسلمان کے تصرفات کی تصحیح کی کوشش کرنی چاہئے، یہاں بھی اقالہ کے بعد عقد جدید پر محمول کر کے جواز ہو سکتا ہے، اس لئے کہ اقالہ کبھی اقتضاء کے طور پر ہوتا ہے، صاحب ہدایہ فرماتے ہیں:

"والفسخ قد يثبت بطريق الاقتضاء كما إذا تبايعا بألف ثم بألف وخمس مائة" (ہدایہ مع الفتح؛ الفتح، کتاب الصرف ۲۷۲/۶، ۲۷۳، مکتبہ رشیدیہ)۔

(اور فسخ کبھی کبھی اقتضاءً ثابت ہوتا ہے جیسے فریقین ایک ہزار کے بدلہ پھر ایک ہزار پانچ سو کے بدلہ بیع کو دیں)۔

۲-شامی کے ایک جزئیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ثمن میں تبدیلی اور تصرفات کرنا جائز ہے، اور یہ بھی استبدال کی ایک شکل ہے:

'' ویصح الاستبدال به فی غیر الصرف والسلم لا فیهما (قوله ویصح الاستبدال الخ) الأولی أن یقول: ویصح التصرف به قبل قبضه فی غیر الصرف والسلم، لأن الاستبدال یصح فی بدل الصرف لأنه لا یتعین بالتعیین'' (شامی: بیوع، باب الصرف ۲/ ۲۷۱، مکتبہ فیض القرآن دیوبند)۔

(ثمن کا استبدال صرف اور سلم کے علاوہ یہی صحیح ہے نہ کہ ان دونوں میں (مصنف کا قول ویصح الاستبدال الخ) بہتر یہ تھا کہ مصنف کہتے: ثمن میں قبضہ سے پہلے تصرف صحیح ہے سوائے صرف اور سلم کے، اس لئے کہ استبدال بدل صرف میں بھی صحیح ہے، اس لئے کہ وہ تعیین سے متعین نہیں ہوتا)۔

۳-علامہ شامی نے اپنے رسائل میں ایک طویل بحث کی ہے جس سے ہماری اس شکل کا جواز بھی معلوم ہو رہا ہے، اہل مصر کے ایک عرف کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''بل یطلقون القروش وقت العقد ویدفعون بمقدار ما سموه فی العقد تارة من المصاری وتارة من غیرها ذهبا أو فضة فصار القرش عندهم بیانا لمقدار الثمن من النقود الرائجة المختلفة المالیة لا لبیان نوعه ولا لبیان جنسه (إلی) وقد رأیت بفضل الله تعالی فی القینیة نظیرهذا حیث قال فی باب المتعارف بین التجار کالمشروط برمز علاء الدین الترجمانی: باع شیئاً بعشرة دنانیر واستقرت العادة فی ذلک البلد انهم یعطون کل خمسة أسداس مکان الدینار فاشتهرت بینهم فالعقد ینصرف إلی ما یتعارفه الناس فیما بینهم فی تلک التجارة (إلی) فاذا باع شخص سلعة بمائة قرش مثلا ودفع له

المشتری بعد الرخص ما صارت قیمته تسعین قرشا من الریال أو الذهب مثلا لم یحصل للبائع ذلک المقدار الذی قدره و رضی به ثمنا لسلعته'' (رسائل ابن عابدین (تنبیہ الرقود) ۲/۶۵، ۶۷)۔

(بلکہ عقد کے وقت قروش کا نام لیتے ہیں اور عقد میں تسمیہ کردہ مقدار کی ادائیگی کبھی مصاری سے کرتے ہیں کبھی اس کے علاوہ سونے چاندی سے، تو ان کے یہاں قرش مختلف مالیت والے رائج سکوں سے ثمن کی مقدار کی وضاحت کے طور پر ہوتا ہے اس کی نوع اور جنس بیان کرنے کے لئے نہیں ہوتا (آگے ہے) اور اللہ کے فضل سے میں نے قنیہ میں اس کی نظیر دیکھی ہے؛ چنانچہ باب ''التعارف بین التجار کالمشروط'' میں علاء الدین ترجمانی کی علامت سے فرماتے ہیں: کوئی چیز دس دینار کی فروخت کی، اور اس شہر کا عرف یہ قرار پایا ہے کہ وہ ایک دینار کی جگہ (۶/۵) پانچ سدس دیتے ہیں اور یہ چیز ان میں شہرت پا چکی ہے تو لوگوں کے درمیان اس تجارت میں جو عرف ہو عقد اسی پر منصرف ہوگا (آگے ہے) تو مثلاً اگر کوئی سو قرش میں کوئی سامان بیچے اور ارزانی کے بعد مشتری ریال یا سونے سے اتنی مقدار دے جس کی قیمت ۹۰ قرش ہوگئی ہے تو بائع کو وہ مقدار حاصل نہیں ہوئی جس کو اس نے متعین کیا تھا اور جس سے وہ اپنے سامان کی ثمن کے طور پر راضی ہوا تھا)۔

جب عرف کی بنیاد پر قرش بول کر اس سے مخصوص مالیت مراد لی جاسکتی ہے تو بدرجہ اولی تصریح کے ساتھ روپیہ بول کر سونا چاندی سے اس کی مالیت بھی مراد لی جاسکتی ہے۔

قرض کو سونے یا چاندی سے مربوط کرنا:

صرف قرض لینے والے مسئلہ میں بظاہر اشکال ہوتا ہے کہ چاندی یا سونے سے مربوط کیسے کرسکتے ہیں؟ اس لئے کہ جب دس ہزار قرض لیے تو اب اصل یہ ہے کہ دس ہزار ہی واپس کریں، اگر سونے یا چاندی سے مربوط کر کے اس سے واپس کرتے ہیں تو گویا ذوات الامثال

میں مثل کی واپسی پر قدرت کے باوجود غیر مثل سے ادائیگی کرتے ہیں جو ممنوع ہے۔

پھر قرض لے کر اس کو سونے چاندی سے مربوط کرنا گویا روپیوں کی بیع سونا یا چاندی سے کرنا ہے، اوپر گذر چکا ہے کہ روپے نقدین کے حکم میں ہو چکے ہیں تو گویا یہ اموال ربویہ کی .... ایک جنس کی دوسری جنس سے بیع ہے، مسلمہ حکم ہے اس صورت میں تفاضل جائز ہوتا ہے لیکن نسیئہ جائز نہیں ہوتا، ظاہر ہے کہ قرض کی صورت میں یہ نسیئہ لزومی طور پر رہے گا، لہذا قرض کی صورت میں سونے یا چاندی سے مربوط کرنا جائز نہ ہونا چاہئے، اس لئے کہ اس کا تعلق باب ربوا سے ہے اور اس میں احتیاط ہی مناسب ہے۔

خلاصہ بحث:

۱- دیون یعنی مؤخر مطالبات (خواہ وہ قرض ہو یا مہر یا پنشن (جس کی ادائیگی وقت پر نہ ہوسکی ہو اور ذمہ میں رہ گئی ہو) یا ادھار خریداری کی رقم یا وقت پر ادا نہ ہو پانے والی تنخواہوں کی ادائیگی) میں سے کسی کو بھی اشاریہ سے وابستہ کرنا شرعاً درست نہیں ہے، اس لئے کہ یہ ایک خاصا پیچیدہ نظام ہے جس سے عقد میں جہالت ہوگی اور اس جہالت کے نتیجہ میں تنازعات اٹھ کھڑے ہوں گے، پھر اس نظام سے وابستہ کرنے کے بعد جتنی مقدار لازم ہوگی یا لی گئی اس سے عدد میں اضافہ کر کے واپسی کی جائے گی جو کہ کھلا ہوا سود ہے؛ اس لئے کہ کیلی، وزنی اور عددی چیز میں بالترتیب کیل، وزن اور عدد ہی کا اعتبار ضروری ہے، ان چیزوں میں اشاریہ سے واپسی کی جائے تو یقینی طور پر تفاوت ہو جائے گا۔

۲- مہر کو چاندی یا سونے سے مربوط کرنا جائز نہیں اولی و بہتر ہے، اس لئے کہ مہر کے احکام میں چاندی کی مقدار کی طرف ویسے بھی رجوع کرنا ہی پڑتا ہے، اس لئے کہ کم از کم مہر دس درہم مقرر کی گئی ہے، پھر مہر فاطمی کا عام رواج ہے۔

اور واضح رہے کہ اس کی دو شکلیں ہو سکتی ہیں:

الف- مجلس عقد ہی میں سونے یا چاندی کو بطور مہر مقرر کرنا۔

ب- پہلے روپے مقرر کر کے بعد میں اس کی تعیین سونے یا چاندی سے کرنا۔ پہلی شکل کے جواز میں تو کوئی کلام ہی نہیں، دوسری شکل بھی بلاشبہ جائز ہے، اس لئے کہ باہمی رضامندی سے جب کمی بیشی کرنا جائز ہے تو استبدال بدرجہ اولی جائز ہوگا۔

جہاں تک سونے چاندی کو بیع کی ثمن بنانے کا تعلق ہے تو اگر مجلس عقد ہی میں ان کو ثمن بنالیا تو جواز میں کوئی کلام ہی نہیں ہے، اور اگر پہلے روپے مقرر کر کے بعد میں اس کی مالیت سونے یا چاندی سے مقرر کی تب بھی جائز ہوگا، اس لئے کہ:

الف- اس کو اقتضاءً فسخ مان کر عقد جدید مانا جا سکتا ہے۔

ب- روپے ذکر کر کے مخصوص مقدار کی علامت کے طور پر قرار دیا جا سکتا ہے، جیسا کہ علامہ شامی نے مصری لوگوں کا عرف ذکر کر کے اس کے جواز کا اشارہ کیا ہے۔ البتہ ثمن یا مہر کو سونے چاندی سے مربوط کرنے کے بعد ادائیگی کے وقت ادائیگی کے دن کی سونے چاندی کی مالیت کا اعتبار لازم ہوگا تاکہ حضرت ابن عمر کی حدیث پر عمل ہو جائے۔

البتہ قرض والے مسئلہ میں بظاہر سونے چاندی سے مربوط کرنا جائز نہ ہوگا، اس لئے کہ ذوات الامثال میں اصل یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو مثل حقیقی سے واپسی کی جائے۔

مزید یہ کہ روپیہ جیسا کہ گزر انقدین کے حکم میں ہو چکا ہے، پھر جب اس کو سونے سے جوڑ رہے ہیں تو گویا روپے سے سونے کی بیع کر رہے ہیں، لہذا اموال ربویہ میں جنس مختلف ہونے پر تفاضل جائز ہوگا لیکن نسیئہ جائز نہیں ہوگا۔ واللہ اعلم۔

موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت

مولانا محی الدین بڑودوی ☆

ثمن دو قسم کے ہیں۔ ثمن خلقی (سونا چاندی) اور ثمن اصطلاحی، یعنی سکۂ رائج، ہمارے دور میں سکۂ رائج کاغذی نوٹ ہیں، ایک زمانہ تھا کہ سکہ رائج چاندی کے سکے تھے، پھر نوٹ ایجاد ہوئے، ایک عرصہ تک چاندی کے سکے اور نوٹوں کا چلن ایک ساتھ رہا، پھر سکے مفقود ہو گئے اور اب ان سکوں کی جگہ صرف نوٹ ہی کا چلن ہے، سکوں کا تصور بھی نہیں ہے، آج کل کی نسلوں نے وہ سکے دیکھے بھی نہیں ہیں۔

اس لئے پہلے نوٹ کو وثیقہ اور حوالہ کہا جاتا تھا لیکن آج نوٹ مستقل ثمن کی حیثیت رکھتے ہیں، جب تک حکومت ان نوٹوں کا چلن بند نہ کردے، اس وقت تک اس کی ثمنیت ختم نہیں ہوسکتی، اگر ہم نوٹ کو ثمن تسلیم نہ کریں تو لاکھوں کروڑوں کے نوٹ مال نامی ہونے سے، بلکہ نوٹ کی کوئی قیمت نہیں تو مال متقوم ہونے سے بھی خارج ہو جائیں گے، اور صرف زکوۃ ہی نہیں قربانی اور صدقۃ الفطر بھی نوٹوں پر واجب نہ ہوں گے، اور مسائل زکاۃ پر اس کا بہت بڑا اثر ظاہر ہوگا، بہر حال نوٹ اس دور میں مستقل ثمن ہیں فقہاء کرام نے اس قسم کے رائج چلن کو اصطلاحی ثمن قرار دیا ہے۔

علامہ شامیؒ لکھتے ہیں: "وكذا تعليلهم قول الإمام لبطلان البيع، بأن الثمنية

☆ دار الفقہ والافتاء بزم منصر المؤمنین، بڑودہ۔

بطلت بالكساد لأن الدراهم التي غلب غشها إنما جعلت ثمنا بالاصطلاح" (شامی ۷/ ۵۴ زکریا دیوبند)۔

یعنی وہ سکے جو خالص چاندی یا غالب چاندی کے نہ ہوں جب ان کا چلن بند ہو جائے تو اس کی ثمنیت باطل ہو جائے گی؛ کیوں کہ یہ اصطلاحی ثمن قرار دئے گئے ہیں، جب اس کا چلن نہ رہا اور لوگوں نے اس سے لین دین کا معاملہ ترک کر دیا تو اصطلاح باطل ہوگئی اور ایسے سکے ثمن نہ رہے۔

اس لئے رائج چلن ثمن اصطلاحی ہے، البتہ عبادات مالیہ صدقات وزکاۃ میں یہ ثمن اصطلاحی ثمن خلقی کے ساتھ وابستہ رہے گا؛ کیوں کہ شریعت میں زکوۃ کے نصاب کو سونا چاندی (ثمن خلقی) سے مقدر فرمایا گیا ہے، اس لئے زکوۃ میں سونا چاندی یا اس کے برابر مالیت کا لحاظ رائج چلن (ثمن اصطلاحی) میں ہوگا۔

معاملات میں ثمن رائج کا مستقل اعتبار ہوگا، عاقدین نے جس ثمن پر عقد کیا ہے وہ متعین رہے گا۔

۱- ظاہر ہے کہ اثمان اصطلاحیہ کے اندر اس زمانہ میں جو اتار چڑھاؤ ہو رہا ہے، ایسا نہیں ہے کہ صرف گراوٹ ہی آرہی ہے، بلکہ پاؤنڈ میں گراوٹ آتی ہے تو عمومی طور پر تہتر (۷۳)، چوہتر (۷۴) ہندی روپئے تک گرتا ہے، لیکن چند ماہ میں آج کل پچاسی (۸۵)، چھیاسی (۸۶) روپئے ہندی کے برابر چڑھاؤ میں پہونچتا ہے، یعنی دس گیارہ کا فرق آجاتا ہے، ویسے تو روزانہ کم وبیش ہوتا رہتا ہے، اسی طرح ڈالر اور یورو کے معیار میں بھی اضافہ اور کمی روزانہ ہوتی رہتی ہے۔

مگر سرکاری ادارے بھی اس قسم کی کمی بیشی کو نظر میں نہیں لاتے، اگر تنخواہوں اور کرایوں کو اس قسم کے اشاریہ سے وابستہ کیا جائے تو تیس دن کی تنخواہ اور کرایہ کا ہر روز کا حساب

جدا رکھنا ہوگا اور ہر تیس روز یا دس روز (جس جگہ جیسا رواج ہو) میں تنخواہوں اور کرایوں میں اس قدر کمی بیشی کرنا ہوگا، ظاہر ہے یہ حساب بہت مشکل بلکہ چھوٹے اداروں میں اور دیہاتوں کے لئے ناممکن ہے، بلکہ بڑی پرائیویٹ کمپنیوں کے لئے جہاں سیکڑوں مزدور کام کرتے ہوں ایسا حساب ناممکن ہی نہیں بلکہ تماشہ بن جائے گا۔

تنخواہوں، اجرتوں اور پنشن وغیرہ میں یہ معمول رہا ہے کہ مہنگائی اور افراط زر کے پیش نظر تنخواہوں وغیرہ میں اضافے اور مہنگائی بھتے بڑھتے رہتے ہیں، اس لئے اجارہ کے معاملات کو اشاریہ سے جوڑنے یا سونا چاندی سے وابستہ کرنے کا نظریہ بے سود ہے۔ سونا چاندی کے بھاؤ میں اتار چڑھاؤ ہوتا ہی رہتا ہے؛ اسی لئے دنیاداروں نے بھی اس کو نظر انداز کیا ہے۔

تجارت کے معاملات میں عاقدین نے جو ثمن باہم تراضی سے طے کیا ہے، وہ شرعاً متعین ہے اور عاقدین اس کے پابند ہیں۔

طویل المیعاد مؤجل سودوں میں ہماری شریعت میں اس کی گنجائش ہے کہ پہلے سے یہ طے کرلیا جائے کہ نقد ادائیگی کی صورت میں اس شئی کی قیمت مثلاً ایک ہزار ہے، اگر اجل معین سے ہو تو ڈیڑھ ہزار میں یہ چیز ملے گی، مشتری ایک شق کو اختیار کرلیتا ہے تو باہمی نزاع کا خدشہ نہیں رہتا اور ثمن میں جہالت بھی نہیں رہتی۔

چنانچہ اسلامی بنکوں اور اداروں نے یہ طریقہ اپنایا ہوا ہے اور مفتیان کرام نے اس پر فتاوی جاری کئے ہیں، مگر اس کو دنیاداروں نے بنکوں کے سود سے بھی زیادہ نفع خوری کا ذریعہ بنا لیا ہے، یوکے وغیرہ میں سرکاری مارگیج (لون) سے بچنے کے لئے یہ طریقہ رائج ہوا تو ایک مکان جو سرکاری مارگیج سے دس سالوں میں لون بھرنے کے ساتھ پچیس ہزار میں پڑتا ہے، دینداروں نے اس کی قیمت چالیس ہزار متعین کرکے دس قسطوں پر تقسیم کردیا، ٹھیک ہے کہ سودی لین دین نہیں ہوا، لیکن مسلمین کے ایک طبقہ سے دولت سمٹ کر دوسرے کے آغوش میں جانے کا ایک حیلہ

وجود میں آ گیا، یقیناً یہ جائز طریقہ ہے مگر اس کو غلط طریقہ سے استعمال کیا تو غریبوں کو سودی قرضوں سے بچانے کے لئے جواز کی صورت نکالی گئی وہی غریبوں کے گلے کی ہڈی بن گئی۔

۲- مہر کا مسئلہ تو نبی کریم ﷺ نے اپنی صاحب زادی حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالی عنہا اور ازواج مطہرات کا مہر چاندی کی صورت میں ہی مقرر فرمایا ہے، آج کل مہر فاطمی کی تقدیر اسی چاندی کے ذریعہ ہورہی ہے، اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے نواۃ ذہب کے عوض نکاح کیا، تو بہت آسان صورت ہے کہ چاندی کی شکل میں ہی مہر کی تعیین ہو۔ مؤجل یا معجّل جو معین ہوجائے وہ دینا ہے۔ اگر معجّل دے دیا پھر بھاؤ میں کمی بیشی ہوئی تو اس کا کیا علاج ہے؟ اگر سونا چاندی خرید لیا پھر بھاؤ بڑھ گیا یا گھٹ گیا آدمی کی اپنی قسمت ہے، مہر مؤجل میں جو مدت ہے اس پر ادا کردیا، جو بھاؤ ہو مقدر سونا چاندی ادا کرنا ہے، ورنہ آج نکاح ہوا اور ایک تولہ سونا مہر مؤجل مقرر ہوا، دو روز میں سونے کے بھاؤ بڑھ گئے اور بڑھتے چلے گئے جیسے کہ آج کل ہو رہا ہے، اور مہر کا مطالبہ آ گیا جو شوہر سمجھتا تھا کہ پانچ ہزار کا ایک تولہ دے دینگے، اس کے سر پر پندرہ ہزار کا مطالبہ آ گیا تو کون سے انصاف کی بات ہوئی؟ اگر نوٹ ثمن یا مال متقوم نہیں ہے تو مہر میں ان کی تقدیر ہی درست نہیں رہے گی حالاں کہ "أن تبتغوا بأموالکم" کہا گیا ہے۔

صرف قرض کا معاملہ رہ جاتا ہے۔

قرض کی شرعی تعریف:

"**هو ما تعطيه لتتقاضاه وشرعا ما تعطيه من مثلي لتتقاضاه، وهو اخصر من قوله، عقد مخصوص، أى بلفظ القرض ونحوه، يرد على دفع مال، بمنزلة الجنس، مثلي، خرج القيمي، لآخر ليرد مثله، خرج نحوه وديعة وهبة، وصح، القرض، في مثلي، هو كل ما يضمن بالمثل عند الاستهلاك، لا في غيره، من**

القیمات کحیوان وحطب وعقار وکل متفاوت لتعذر رد المثل'' (درمختار مع الشامی ۷/۳۸۸ زکریا دیو بند)۔

لغت میں قرض اس چیز کو کہتے ہیں جو واپس لینے کے لئے دی جائے اور شرعاً اس مثلی شئی کو کہتے ہیں جو واپس لینے کے لئے دی جائے، اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ لفظ قرض وغیرہ سے ایسا مخصوص عقد جو دوسرے شخص کو مثلی مال دینے پر وارد ہوا ہو، تاکہ دوسرا شخص اس مال کا مثل واپس کرے، اور قرض مثلی میں صحیح ہوتا ہے اور غیر مثلی (قیمی) میں درست نہیں ہوتا۔

مثلی سے وہ اشیاء مراد ہیں جس کے افراد میں زیادہ تفاوت نہ ہو لتعذر رد المثل بقرض کی اس تفصیل کے پیش نظر مثل کی واپسی ہوگی، ظاہر ہمارے زیر بحث مسئلہ میں کاغذی نوٹ مثلی ہیں، اگر نوٹ کی کوئی قیمت نہ ہو جس قدر روپیے کاغذ دئے ہیں اسی قدر اتنے کاغذ واپس کرتے ہیں، اگر نوٹ ثمن ہیں (اور ثمن ہی ہیں) تو ثمن مثلی ہیں قیمی نہیں رہے کہ قیمت واپس کی جائے اس لئے جس قدر نوٹ دئے اس قدر نوٹ واپس کرتے ہیں۔ اور قرض میں تاجیل مدت جائز نہیں ہیں۔ علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

''لکن قال فی الهداية فإن تأجيله لا يصح لأنه إعادة وصلة فی الابتداء حتى يصح بلفظ الإعادة، ولا يملكه من لا يملك التبرع، وعلى اعتبار الانتهاء لا يصح، لأنه يصير بيع الدراهم بالدراهم نسيئة وهو رباه ومقتضاه أن قوله لا يصح على حقيقته، لأنه إذا وجد فيه مقتضى عدم اللزوم ومقتضى عدم الصحة وكان الأول لا ينافي الثاني، لأن ما لا يصح لا يلزم وجب اعتبار عدم الصحة، ولهذا علل في الفتح لعدم الصحة أيضا بقوله: ولأنه لو لزم كان التبرع ملزما على المتبرع، ثم للمثل المردود حكم العين كأنه رد العين، وإلا كان تمليك دراهم بدراهم بلا قبض في المجلس، والتأجيل في الأعيان لا يصح،

أم ملخصا، ويؤيد ما في النهر عن القنية التأجيل في القرض باطل" (ردالمختار ۳۸۴ زکریا دیوبند)۔

ہدایہ میں فرمایا: قرض کے لئے مدت مقرر کرنا صحیح نہیں ہے کیوں کہ قرض ابتداءً اعارہ اور صلہ ہے، چنانچہ لفظ اعارہ سے قرض صحیح ہوجاتا ہے اور جس شخص کو تبرع کا اختیار نہیں ہے وہ قرض دینے کا مختار نہیں ہے جیسے وصی اور بچہ، اور قرض انتہاءً معاوضہ ہے، تو ابتداء کا اعتبار کرتے ہوئے تاجیل لازم نہیں ہوتی، جیسے اعارہ میں تاجیل لازم نہیں ہے، کیوں کہ تبرع میں جبر (زبردستی) نہیں ہے، اور انتہاء کے اعتبار سے قرض میں تاجیل صحیح نہیں ہے، کیوں کہ تاجیل کی صورت میں دراہم کو دراہم کے بدلے ادھار بیچنا لازم آئے گا، اور یہ ربا ہے اھ۔ اور اس تفصیل کا مقتضی یہ ہے کہ ماتن کا لایصح کہنا حقیقت ہے؛ کیوں کہ تاجیل میں عدم لزوم کا اقتضاء بھی ہے اور عدم صحت کا اقتضاء بھی ہے اور پہلا دوسرے کے منافی نہیں ہے، کیوں کہ جو صحیح نہیں ہوتا، تو عدم صحت کا اعتبار ضروری ہوگیا۔

اسی بنا پر فتح میں عدم صحت کی وجہ اس طرح بیان کی ہے، کیوں کہ اگر قرض میں تاجیل لازم ہوجائے تو تبرع تبرع کرنے والے پر لازم ہوجائے گا۔

پھر قرض میں واپس کیا جانے والا مثل عین کے حکم میں ہے، گویا بعینہ لی ہوئی شئی کو واپس کیا، ورنہ دراہم کی دراہم کے عوض تملیک مجلس میں بغیر قبض لازم آئے گی، اور اعیان میں تاجیل صحیح نہیں ہوتی، اھ ملخصا، اور اس کی تائید قنیہ سے نہر میں جو منقول ہے اسی سے ہوتی ہے، التاجيل في القرض باطل، تاجیل قرض میں باطل ہے۔

جب قرض میں تاجیل صحیح نہیں ہے تو واجب الاداء نوٹ کی مالیت سونے چاندی میں کس طرح طے ہوسکتی ہے؟ واجب الادا نوٹ مستقل ثمن ہے تو اس کی قیمت بھی طے نہیں ہوسکتی، کیوں کہ مثل کی واپسی ضروری ہے، اگر نوٹ ثمن نہیں ہے تو اس کی مالیت سونے یا چاندی جیسی

گر اس ثمن سے کس معیار سے طے کی جائے گی، اگر نوٹ کو چاندی یا سونے کا بدل مانا جائے تو دو قسم کا صریح ربا لازم آتا ہے، کیوں کہ اس صورت میں یہ بیع صرف ہو جائے گی، اور کمی بیشی جائز نہیں ہو سکتی، اس لئے ربا الفضل لازم آئے گا، اگر تاجیل کرتے ہیں تو ربا النسیئہ لازم آئے گا، نیز سونا اور چاندی کی قیمت روزانہ گھٹتی اور بڑھتی رہتی ہے تو قرض دیتے وقت جو مقدار سونا یا چاندی کی طے کی گئی تھی ادائے قرض کے وقت سونا یا چاندی کی قیمت میں کمی بیشی ہوگئی ہے تو یا تو مستقرض کو خسارہ ہوگا یا مقرض کو خسارہ ہوگا، جیسے آج کل سونے کی قیمت میں جو تیزی اور کمی ہو رہی ہے اس سے ظاہر ہے۔

اس لئے نوٹ کو ہم ثمن ہی قرار دیتے ہیں، اور جہاں تک نوٹ میں غلاء ورخص کا معاملہ یعنی مالیت کے اتار چڑھاؤ کا مسئلہ ہے تو صاحب درمختار رائج چلن کے بالکلیہ بند ہو جانے کی صورت میں لکھتے ہیں: "قلت: ومما يكثر وقوعه ما لو اشترى بقطع رائجة فكسدت بضرب جديدة يجب قيمتها يوم البيع من الذهب لا غير، إذ لا يمكن للحاكم بمثلها لمنع السلطان منها ولا يدفع قيمتها من الفضة الجديدة لأنها ما لم يغلب غشها فجيدها ورديئها سواء إجماعا، أما ما غلب غشه ففيها الخلاف كما سيجيء في فصل القرض، فتنبه وبه أجاب سعدى آفندى وهذا إذا بيع بثمن دين فلو بعين فسد" (درمختار)۔

فرماتے ہیں: کثیر الوقوع مسائل میں سے یہ مسئلہ بھی ہے، اگر رائج چلن سے کوئی شئی خریدی پھر نئے سکوں کی وجہ سے پہلا چلن بند ہوگیا تو بیع کے روز اس بندشدہ چلن کی قیمت کا صرف سونا واجب ہوگا، کیوں کہ حکام کے لئے مثل کا فیصلہ کرنا ممکن نہ رہا، کیوں کہ بادشاہ (حکومت) نے اس قدیم چلن کو ممنوع قرار دے دیا، اور جدید چاندی (سکوں) کے حساب سے قیمت نہیں لگ سکتی؛ کیوں کہ جب تک سکوں میں کھوٹ غالب نہ ہو تو بڑھیا اور گھٹیا بالا جماع

برابر ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایسے دراہم جس میں چاندی غالب ہو بیع کے بعد بند ہو جائے تو یوم بیع میں سونے کے حساب سے اس کی قیمت واجب ہوگی، نئے چاندی کے سکوں کے حساب سے قیمت نہیں دی جائے گی؛ کیوں کہ دونوں جانب چاندی ہے، ایک مغلوب الغش ہے دوسری جید ہے تو جید اور ردی بالاجماع برابر ہیں۔

اگر قدیم سکے جو بند ہو گئے وہ غالب الغش ہوں یا فلوس ہو تو اختلاف ہے، اگر سودا فلوس یا غالب الغش سے ہوا ہے اور بائع کو دینے سے پہلے بند ہو گئے، تو امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بیع باطل ہو جائے گی، اور مشتری پر مبیع کو واپس کرنا لازم ہوگا، اگر موجود ہو تو بعینہ مبیع واپس کرے، اگر مبیع ختم ہو چکی ہو تو اس کا مثل (مثلی ہونے کی صورت میں) یا اس کی قیمت (قیمی ہونے کی صورت میں) لازم ہوگی، اگر مبیع پر مشتری کا قبضہ ہونے سے قبل فلوس یا غالب الغش چلن بند ہو جائے تو اس بیع کا کوئی حکم نہیں ہے یعنی بیع کالعدم سمجھی جائے گی۔

اور صاحبینؒ کے نزدیک بیع باطل نہ ہوگی، کیوں کہ بدل کے بند ہو جانے سے تسلیم بدل (فلوس یا غالب الغش) متعذر ہو چکا ہے، اور تسلیم بدل کا متعذر ہو جانے سے فساد بیع لازم نہیں آتا؛ کیوں کہ دوبارہ چلن کا رائج ہونا محتمل ہے۔

لیکن اس صورت میں حضرت امام ابو یوسفؒ کے نزدیک یوم بیع میں بدل (فلوس یا غالب الغش) کی جو قیمت ہو وہ لازم ہوگی، اور حضرت امام محمد کے نزدیک یوم الکساد میں (یعنی جس دن لوگوں نے اس بدل سے معاملہ ترک کر دیا) جو قیمت تھی اس کا اعتبار ہوگا۔

اور غلاء و رخص کی صورت میں یعنی فلوس کی قیمت گھٹنے بڑھنے کی صورت میں بیع باطل نہ ہوگی بحال رہے گی، اور مشتری کو اختیار نہ ہوگا، مشتری سے اسی معیار سے نقد کا مطالبہ ہوگا جو معیار بیع کے روز تھا، اولاً اس بارے میں امام ابو یوسفؒ اور امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے درمیان کوئی

اختلاف نہیں تھا لیکن بعد میں امام ابو یوسفؒ نے قول اول سے رجوع کرلیا کہ فلوس کی قیمت گر جانے کی صورت میں ان فلوس کی دراہم کے لحاظ سے یوم بیع میں جو قیمت تھی وہ ادا کرنا ہوگی، یا اگر قرض دیا تھا تو قرض پر قبضہ کے دن فلوس کی جو قیمت دراہم کے لحاظ سے تھی وہ ادا کرنی ہوگی۔

وفی الذخیرة من المنتقی إذا غلت الفلوس قبل القبض أو رخصت قال أبو یوسفؒ قولی وقول أبی حنیفةؒ فی ذلک سواء ولیس له غیرها ثم رجع أبو یوسفؒ وقال علیه قیمتها من الدراهم یوم وقع البیع ویوم وقع القبض قوله یوم وقع البیع ای فی صورة القرض، کما نبه علیه فی النهر فی باب الصرف۔

وحاصل ما مر أنه علی قول أبی یوسفؒ المفتی به لا فرق بین الانقطاع والکساد والرخص والغلاء فی أنه تجب قیمتها یوم وقع البیع أو القرض، لا مثلها (ردالمحتار ۵۶/۷)۔

پہلے درمختار کی عبارت سے معلوم ہوا کہ اگر بندھ چلن میں چاندی غالب ہو تو اس کی قیمت کا سوا یوم بیع میں لازم ہوگا، اور نئے چاندی کے سکوں سے اس کی قیمت نہیں لگائی جائے گی؛ کیوں کہ جب تک غش غالب نہ ہو چاندی چاندی کے مقابلہ میں ہونے کی وجہ سے گھٹیا اور بڑھیا بالاجماع برابر سمجھے جائیں گے۔

خالص دراہم یا مغلوب الغش دراہم کا چلن اگر بند ہو جائے یا اس کے معیار میں اتار چڑھاؤ ہو جائے تو اس کے بارے میں علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ولم أر أنه من صرح بحکم الدراهم الخالصة أو المغلوبة الغش سوی ما أفاده الشارح هنا۔

وینبغی أنه لا خلاف فی أنه لا یبطل البیع بکسادها ویجب علی المشتری مثلها فی الکساد والانقطاع والرخص والغلاء، أما عدم بطلان البیع

فلانها ثمن خلقه فترک المعاملة بها لا يبطل ثمنيتها فلا يتاتى تعليل البطلان المذكور وهو بقاء البيع بلا ثمن، وأما وجوب مثلها هو ما وقع عليه العقد كمأة ذهب مشخص أو ماة ريال فرنجي فلبقاء ثمنيتها أيضا وعدم بطلان تقومها، وتمام بيان ذلک في رسالتنا (تنبيه الرقوم في أحكام النقود) وأما ما ذكره الشارح من أنه تجب قيمتها من الذهب فغير ظاهر لأن مثليتها لم تبطل فكيف يعدل إلى القيمة؟ (شامی ۷/۵۷ زکریا)۔

علامہ فرماتے ہیں: دراہم خالصہ اور مغلوب الغش کے حکم کے بارے میں شارح (صاحب درمختار) نے جو کچھ لکھا ہے اس کے سوا کسی نے صراحت کے ساتھ لکھا ہو میرے علم میں نہیں ہے۔

اور لائق ضابطہ یہ ہے کہ اس بارے میں کوئی اختلاف نہ ہونا چاہئے کہ خالص چاندی کے دراہم یا مغلوب الغش کے بند ہوجانے سے بیع باطل نہیں ہوگی، اور مشتری پر ان دراہم کے بند ہوجانے یا ان کے معیار میں اتار چڑھاؤ کی صورت میں مثل واجب ہوگا، بیع کا باطل نہ ہونا اس وجہ سے ہے کہ چاندی خلقۃً ثمن ہے لہذا اس سے معاملہ کا متروک ہوجانا اس کی ثمنیت کو باطل نہیں کرتا ہے؛ اس لئے بیع کے باطل ہونے کی جو وجہ بیان کی گئی ہے کہ "بیع بلا ثمن کے رہ جائے گی" یہاں ثابت نہیں ہوتی، اور مشتری پر مثل کا وجوب یعنی جس دراہم پر عقد واجب ہوا ہے ان کے مثل کا وجوب اس لئے ہے کہ ان کی ثمنیت باطل نہیں ہوئی ہے اور ان کا تقوم (قابل قیمت ہونا) باطل نہیں ہوا ہے۔

اور شارح (صاحب درمختار) نے اس صورت میں ان دراہم کی قیمت کے سونے کے وجوب کا جو ذکر کیا ہے وہ غیر ظاہر ہے؛ کیوں کہ دراہم کی ثمنیت باطل نہیں ہوئی ہے تو قیمت کی طرف عدول کیسے ہوسکتا ہے؟ اس تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ رخص وغلاء اور کساد کی صورت میں

مبیع کے ثمن میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی اور وہی دراہم واجب ہوں گے، تو قرض (جس کی بنیادی مثل کے لوٹانے پر ہے اور مثل کو عین کا حکم دیا گیا ہے) میں ثمنیت باقی ہوتے ہوئے قیمت کی طرف رجوع کیسے ہوسکتا ہے جب کہ مروجہ نوٹ ثمن ہیں اور مال متقوم ہے تو ان کے معاملہ میں سونا یا چاندی کی کوئی مقدار کیسے طے ہوسکتی ہے، بالفرض طے بھی کرلیں تو ہمارا مقصد (کہ رخص وغلاء کی صورت میں توازن قائم ہوجائے اور مقرض کو بیجا نقصان سے بچایا جائے) حاصل نہیں ہوتا، کیوں کہ چاندی اور سونے کا معیار بھی ہر روز گھٹتا اور بڑھتا رہتا ہے، ہم نے پانچ ہزار روپے کے بدلہ ایک تولہ سونا مقدر کردیا، چند ماہ میں سونے کی قیمت میں کئی گنا اضافہ ہوگیا جیسے آج کل ہورہا ہے، اگر مقرض کو ایک تولہ سونا ادا کیا جاتا ہے تو مقرض کو دس ہزار روپے کا نفع چند دنوں میں حاصل ہوجاتا ہے۔ اور مقروض پر پانچ ہزار کی ادائیگی کے بجائے پندرہ ہزار کی ادائیگی لازم ہوجاتی ہے تو مقروض کا قلیل مدت میں کتنا بڑا نقصان ہورہا ہے۔

دوسری قباحت یہ ہے کہ مستقرض پر سونا مقدر کردیا اور قرض میں تاجیل صحیح نہیں ہے، مقرض نے تقاضہ کیا کہ ایک تولہ سونا مقدر لاؤ، ظاہر ہے کہ مقرض نے جب سونے کا بھاؤ چڑھتے دیکھا تو وہ تقاضہ کرے گا کیوں کہ اس کا نفع ہے، اب یہ بیچارہ مقروض جس نے مجبوری کی حالت میں پانچ ہزار روپے لئے اس پر پندرہ ہزار کا مطالبہ دو ماہ میں ہی آگیا، وہ کیسے ادا کرسکتا ہے۔

سودی قرض لیتا تو دو ماہ میں مثلاً اس قدر سود مقرض کو بھی حاصل نہیں ہوسکتا تھا، اور مستقرض پر دو ماہ میں پانچ ہزار کے بجائے پندرہ ہزار نہیں آسکتے تھے۔ تو مقرض کی آغوش میں اتنا عظیم نفع ڈال دینا اور مقروض پر اس قدر بھاری بوجھ ڈال دینا کون سے انصاف کی بات ہے؟ اس لئے دس ہزار روپے دس سال کے بعد بھی بصورت قرض دس ہزار ہی ملیں گے۔

جب شریعت نے قرض میں تاجیل کو صحیح قرار نہیں دیا ہے تو قرض کو موجل کرنے کی ضرورت کیا ہے؟ اور اگر فریقین نے موجل کردیا شریعت کو نظر انداز کردیا تو اب کسی کا نقصان

ہوتا ہے تو اس کا الزام شریعت پر کیوں آئے؟ اور شریعت اس کے حل کی مکلف کیوں ہو؟ رہی یہ بات کہ مقرض کو نقصان ہو رہا ہے تو مستقرض قصداً تاخیر کر رہا ہے تو وہ ظالم ہے عدالت اسکا فیصلہ کرے گی ورنہ آخرت میں ظالم کی نجات نہیں ہے، اور مقرض کو تاخیر پر جو اجر وثواب کا وعدہ کیا گیا ہے احادیث میں اس اجر عظیم کا تذکرہ ہے، اور اللہ عز وجل نے فرمایا ہے: "من ذا الذی یقرض اللہ قرضا حسنا فیضاعفہ لہ أضعافا کثیرۃ"۔ یہ آیت کریمہ انفاق فی سبیل اللہ کے بارے میں ہے اور اللہ عز وجل کی راہ میں مال خرچ کر دینے پر یہ بشارت ہے تو عیال اللہ اور مخلوق خدا کے ساتھ قرض حسنہ کی صورت میں برتاؤ بھی اللہ کو قرض دینے کے برابر ہے اور اس آیت کریمہ کا مصداق ہے، تو مقرض کے سامنے صرف دنیوی نفع ہی کیوں رہے اور ہم اس کے دنیوی نقصان کا رونا کیوں روئیں، اس کو سمجھائیں کہ اس کے صبر پر آخرت میں اس کو کس قدر نفع ملنے والا ہے۔ دین دار بھی دنیا داروں کی طرح صرف دنیا کے نفع کو پیش نظر رکھیں، اور دنیا داروں نے سود کی صورت میں جو ظلم عیال اللہ پر روا رکھا ہے ہم بھی فقراء کو شریعت کی دی ہوئی راحتوں کو چھین لینے کا باعث کیوں بنیں، یہ انصاف کی بات نہیں ہے۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب

خلاصہ:

موجودہ کرنسی مستقل ثمن اصطلاحی ہے، نوٹ فلوس کے حکم میں نہیں، جب چاندی کے سکے رائج تھے اور نوٹ بھی تو نوٹ کو وثیقہ کہا جاتا تھا عصر حاضر میں چاندی کے سکے بالکل مفقود ہیں، نوٹ ثمن اور مال متقوم ہیں، اگر ان کی کوئی قیمت نہ ہو تو ان کی بنیاد پر نہ زکاۃ واجب ہوگی نہ صدقۂ فطر وقربانی واجب ہوگی؛ بلکہ بہ ذریعہ نوٹ مہر کی تقدیر جائز نہ ہوگی، کیونکہ مہر کا مال ہونا ضروری ہے۔

عبادت مالیہ صدقات وزکوۃ میں یہ ثمن اصطلاحی ثمن خلقی کے ساتھ وابستہ رہے گا؛ کیوں کہ شریعت میں زکاۃ کے نصاب کو سونا چاندی سے مقدر فرمایا ہے۔

۱-معاملات میں ثمن رائج کا مستقل اعتبار ہوگا، عاقدین نے جس ثمن پر عقد کیا ہے وہ متعین رہے گا۔ اثمان اصطلاحیہ میں اتار چڑھاؤ روزانہ کی بات ہے، اشاریہ سے وابستہ کرنے میں روزانہ کی تنخواہ وغیرہ کا جداحساب مشکل بھی ہے، اور نزاع کا باعث بھی ہے، اس لئے اشاریہ سے وابستہ نہیں کیا جاسکتا، ثمن اصطلاحی مثلی ہے قیمی نہیں ہے، اس لئے اس کی سونا چاندی میں کوئی قیمت طے نہیں کی جاسکتی اور یہ حل بے سود ہے، کیوں کہ خود سونا چاندی کے بھاؤ میں اس قدر اتار چڑھاؤ ہورہا ہے کہ جس خسارہ سے مقرض کو بچانا مقصود ہے وہ حاصل نہیں ہوتا۔

پانچ ہزار روپئے کے بدلے مثلاً ایک تولہ سونا مقرر ہوا، چند ماہ میں سونے کی قیمت میں تین گنا اضافہ ہوگیا، پندرہ ہزار روپے تولہ ہوگیا (آج کل اس سے بھی زیادہ قیمت ہے) تو مقرض کو دو ماہ میں دس ہزار کا نفع ہوگیا، اور مستقرض کے ذمہ پانچ ہزار کی ادائیگی کے بجائے پندرہ ہزار کا سونا آگیا، کیا یہ انصاف کی بات ہے؟

تنخواہوں میں روزانہ کی کمی بیشی کو اس طرح روزانہ کے سودوں میں بیع یا ثمن نے روزانہ کی کمی بیشی کو تاجر بھی نظر میں نہیں لاتے، صبح ایک ثمن میں سودا ہوا، شام کے وقت مبیع کی قیمت بڑھ گئی یا ثمن میں گراوٹ آگئی تو نہ وہ سودا کینسل ہوتا ہے اور نہ مبیع وثمن میں کمی بیشی ہوتی ہے، تنخواہوں، اجرتوں اور پینشن وغیرہ میں مہنگائی اور افراط زر کے پیش نظر اضافے اور مہنگائی بھتے بڑھتے رہتے ہیں، جس سے خسارہ کی تلافی ہوجاتی ہے۔ مہر خود شریعت میں سونا چاندی سے مقدر رہا ہے، نبی کریم ﷺ نے اپنی صاحب زادی اور ازواج مطہرات کے مہر چاندی سے اور بعض صحابہ نے سونے سے متعین کئے، اس لئے مہر میں آسان صورت یہ ہے کہ سونا یا چاندی مقدر کیا جائے، پھر بھی سونا چاندی کے بھاؤ میں اتار چڑھاؤ ہوگا ہی، شوہر نے ایک تولہ سونا (پانچ ہزار کا سمجھ کو متعین کیا اور مطالبہ مہر کے وقت ایک تولہ سونا پندرہ ہزار کا ہوگیا تو کیا علاج؟)۔

قرض مثلی چیزوں میں ہی جائز ہے، جب کہ وہ مثلی افراد میں صغر وکبر میں زیادہ تفاوت

نہ ہو، قرض میں مثل کی واپسی ضروری ہے، یہ مثل کی واپسی عین کی واپسی کے حکم میں ہے، اس لئے جس قدر نوٹ دئے ہیں اسی قدر واپس لینے ہیں، نوٹ کی ثمنیت جب تک باطل نہ ہو اس کی قیمت نہیں لگا سکتے۔ اگر تبادلہ ہوگا تو یہ قرض بیع صرف میں تبدیل ہو جائے گا اور کمی بیشی جائز نہ ہوگی۔ صریح ربا لازم آئے گا، قرض میں تاجیل صحیح نہیں ہے، اگر تاجیل ہوئی تو تبادلہ کی صورت میں ربا النسیئہ لازم آئے گا اور بیع بلا قبض فی المجلس لازم آئیگی۔

اس لئے تنخواہ اور مہر کو اشاریہ سے وابستہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور مہر و تنخواہ میں مقرر کردہ کرنسی کو چاندی سونا سے مقدر کرنا بے سود بھی ہے اور جائز بھی نہیں ہے، اسی طرح قرض کی رقم کا چاندی سونا سے مقدر کرنا جائز نہیں ہے، اس میں ربا لازم آتا ہے، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

دیون کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنے کی شرعی حیثیت

مولانا محمد شاہجہاں ندوی ☆

یقیناً اسلامی اقتصاد پیداوار کی زیادتی اور ذرائع پیداوار کی تقسیم میں عدل وانصاف کا اہتمام کرتا ہے، نیز خرچ کرنے میں راہ اعتدال اختیار کرنے پر زور دیتا ہے، اسی کے ساتھ ساتھ ان اسباب ووسائل کی روک تھام کرتا ہے، جو دام کی گرانی کا ذریعہ بنتے ہیں، چنانچہ اسی بنا پر اس نے بیع کی بعض صورتوں کو ممنوع قرار دیا ہے، الغرض اسلام انسانیت پر ہونے والے ظلم وستم کے طریقوں کو مسدود کرتا ہے، چنانچہ اسلامی نقطۂ نظر سے حکومت کی ذمہ داری متی ہے کہ افراط زر پر کنٹرول رکھے۔

ابن القیم تحریر کرتے ہیں:

"فان الدراهم والدنانير أثمان المبيعات، والثمن هو المعيار الذي به يعرف تقويم الأموال، فيجب أن يكون محدوداً مضبوطاً، لا يرتفع ولا ينخفض، إذ لو كان الثمن يرتفع، وينخفض كالسلع، لم يكن لنا ثمن نعتبر به المبيعات، بل الجميع سلع، وحاجة الناس إلى ثمن، يعتبرون به المبيعات، حاجة ضرورية عامة، وذلك لا يمكن إلا بسعر تعرف به القيمة، وذلك لا يكون إلا بثمن، تقوم به الأشياء، ويستمر على حالة واحدة، ولا يقوم هو بغيره،

☆ جامعہ اسلامیہ شانتاپورم، ملاپورم کیرلہ۔

إذ يصير سلعة، يرتفع وينخفض، فتفسد معاملات الناس، ويقع الخلف، ويشتد الضرر''، الى أن قال رحمه الله: ''فالأثمان لا تقصد لأعيانها، بل يقصد التوصل بها إلى السلع، فإذا صارت فى أنفسها سلعة تقصد لأعيانها، فسد أمر الناس، وهذا معنى معقول يختص بالنقود، لا يتعدى إلى سائر الموزونات'' (اعلام الموقعین: آراء العلماء فی تعلیل ربا الفضل، فصل فی ربا الفضل، والحکمۃ فی تحریمہ ۲/۱۵۶، ط: دار الجیل، بیروت ۱۹۷۳ء)۔

(کیونکہ درہم ودینار مبیع کے ثمن ہیں، اور ثمن ہی وہ کسوٹی ہے جس کے ذریعہ اموال کی قیمت جانی جاتی ہے، لہذا لازم ہے کہ ثمن متعین اور منضبط ہو، اس میں اتار چڑھاؤ نہ ہو، کیونکہ اگر سامان کی طرح ثمن میں بھی اتار چڑھاؤ ہونے لگے، تو ہمارے پاس کوئی ایسا ثمن نہ رہے گا، جس کے ذریعہ ہم مبیع کا اعتبار کرسکیں، بلکہ سب سامان بن جائے گا، اور لوگوں کے لئے ایسے ثمن کی ضرورت جس سے مبیع کا اندازہ کرسکیں، عمومی ہے، اور ایسا ایسے ہی ثمن سے ممکن ہے جس سے قیمت معلوم ہوسکے، اور ایسا ایسے ثمن سے ہی ہوگا، جس سے اشیاء کی قیمت لگائی جاسکے، اور ایک ہی حالت پر برقرار رہے اور اس کی قیمت دوسری شئ سے نہ لگائی جائے، کیونکہ ایسی صورت میں ثمن بھی سامان بن جائے گا، جس میں اتار چڑھاؤ ہوگا، چنانچہ لوگوں کے معاملات بگڑ جائیں گے، اور محال لازم آئے گا، اور ضرر عظیم واقع ہوگا، آگے ابن قیم نے تحریر فرمایا ہے: چنانچہ ثمن بذات خود مقصود نہیں ہوتے ہیں، بلکہ اس کے ذریعہ سامان تک رسائی حاصل کرنے کا قصد کیا جاتا ہے، تو اگر ثمن بھی ایسا سامان بن جائے جو بذات خود مقصود ہو، تو لوگوں کے معاملات بگڑ جائیں گے، اور یہ ایک ایسا معقول سبب ہے جو سکے کے ساتھ خاص ہے، دیگر وزنی چیزوں کی طرف اس کا تعدیہ نہیں)۔

اسی طرح یہ حکومت کی ذمہ داری بنتی ہے کہ جعلسازوں کے خلاف سخت قدم اٹھائے، تاکہ افراط زر پر قابو رہے، ڈشریسی تحریر کرتے ہیں:

”ولا يغفل النظر إن ظهر في سوقهم دراهم مبهرجة مخلوطة بالنحاس، بأن يشتد فيها، ويبحث عمن أحدثها، فإذا ظفر به، أناله من شدة العقوبة، وأمر أن يطاف به الأسواق لينكله، ويشرد به من خلفه“ (المعیار المعرب لابی العباس الونشریسی تحت عنوان: ما یجب علی الوالی أن یفعله إذا ظہر تکثیر التزویر فی النقود ۶/۴۰۷، ط: دار الغرب الاسلامی بیروت)۔

(اور حاکم نظر انداز نہ کرے، اگر لوگوں کے بازار میں کھوٹے سکے ظاہر ہوں، جس میں تانبے کی آمیزش ہو، اس طرح کہ اس معاملہ میں سختی کرے، اور اسے وجود میں لینے والے کے بارے میں تفتیش کرے، اور اگر اسے پالے، تو سخت سزا دے، اور اسے بازار میں گھمانے کا حکم دے، تاکہ اسے عبرت بنادے، اور جو اس کے پیچھے ہیں ان کو بھی تتر بتر کردے)۔

اس تمہید کے بعد سوالات کے جوابات تحریر کئے جاتے ہیں:

۱- کاغذی نوٹوں اور معدنی سکوں کی حیثیت ثمن عرفی، اصطلاحی اور رسمی کی ہے، اور اصل یہ ہے کہ یہ کاغذی نوٹ مثلی ہیں، لہٰذا شرعاً یہ صحیح نہیں ہے کہ دیون یعنی مؤخر مطالبوں مثلاً قرض مہر، پنشن، ادھار خریداری کی رقم اور وقت پر ادا نہ ہونے والی تنخواہوں کی ادائیگی کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کردیا جائے، کیونکہ دیون کی ادائیگی میں مثل کا اعتبار ہے، اور قیمت کا اعتبار نہیں ہے۔

علامہ کاسانی تحریر کرتے ہیں:

”ولو لم تكسد، ولكنها رخصت قيمتها أو غلت، لا ينفسخ البيع بالاجماع، وعلى المشترى أن ينقد مثلها، ولا يلتفت إلى القيمة ههنا، لأن الرخص أو الغلاء لا يوجب بطلان الثمنية“ (بدائع الصنائع: کتاب البیوع، فصل، وأما حکم البیع ۵/۲۴۲، ط: دار الکتب العلمیۃ، بیروت، الطبعۃ الثانیہ ۱۹۸۶ء)۔

(اور اگر ملک سے فلوس کے ساتھ تعامل بند نہ ہو، لیکن اس کی قیمت میں ارزانی یا گرانی

آجائے، تو بالاتفاق بیع فسخ نہ ہوگی، اور مشتری پر لازم ہوگا کہ اس کے مثل فلوس دے دے، اور اس جگہ قیمت کی طرف التفات نہ ہوگا، کیونکہ ارزانی یا گرانی ثمنیت کے بطلان کو ثابت نہیں کرتی ہے)۔

ایک دوسری جگہ تحریر کرتے ہیں: "ولو لم تكسد، ولكنها رخصت أو غلت فعليه رد مثل ما قبض بلا خلاف" (بدائع الصنائع ۵/ ۲۴۲) (اور اگر فلوس کے ساتھ تعامل ملک میں بند نہ ہو، لیکن اس میں ارزانی یا گرانی آجائے تو اس پر بغیر کسی اختلاف کے قبضہ کردہ فلوس کے مثل لوٹانا لازم ہے)۔

عنایہ میں ہے:

"إذا استقرض فلوساً، فكسدت، يجب عليه رد مثلها عند أبي حنيفة لأنه أي استقراض المثلي اعارة كما أن اعارته قرض، وموجب استقراض المثلي رد عينه معنى، وبالنظر الى كونه عارية، يجب رد عينه حقيقة، لكن لما كان قرضا، والانتفاع به انما يكون باتلاف عينه، فات رد عينه حقيقة، فيجب رد عينه معنىً، وهو المثل، ويجعل بمعنى العين حقيقة، لأنه لو لم يجعل كذلك، لزم مبادلة الشئ بجنسه نسيئة، وهو لا يجوز" (العنایہ شرح الہدایہ، کتاب الصرف ۱۰/ ۳۳، من المکتبۃ الشاملۃ)۔

(اگر فلوس قرض لے، پھر ان کے ساتھ تعامل ملک سے بند ہوجائے تو اس پر امام ابوحنیفہ کے نزدیک اسی کے مثل لوٹانا واجب ہے، کیونکہ مثلی کو قرض لینا عاریت ہے، جیسا کہ مثلی کو عاریتاً دینا قرض ہے، اور مثلی کو قرض لینے کا تقاضا معنوی اعتبار سے بعینہ اسی کو لوٹانا ہے، لیکن چونکہ وہ قرض ہے، اور اس سے فائدہ اٹھانا اس کی ذات کو ختم کرکے ہوگا، لہذا حقیقت کے اعتبار سے بعینہ اس کو لوٹانا فوت ہوگیا، اس لئے معنوی اعتبار سے اس کی ذات کو لوٹانا واجب ہوگا، اور

وہ مثل ہے، اور اسے حقیقت کے اعتبار سے اس شی کے معنی میں قرار دیا جائے گا، کیونکہ اگر ایسا نہیں کیا گیا تو شی کا اپنی جنس کے ساتھ ادھار تبادلہ لازم آئے گا، اور یہ جائز نہیں ہے)۔

اور ''بدائع'' میں ہے:

''ولو استقرض فلوساً، فکسدت، فعلیه مثلها عند أبی حنیفة وعند أبی یوسف ومحمد رحمهما الله – علیه قیمتها، وجه قولهما أن الواجب فی باب القرض، رد مثل المقبوض، وقد عجز عن ذلک؛ لأن المقبوض کان ثمناً، وقد بطلت الثمنیة بالکساد، فعجز عن رد المثل، فیلزمه رد القیمة، کما لو استقرض رطباً، فانقطع عن أیدی الناس أنه یلزمه قیمته، لما قلنا، کذا هذا، ولأبی حنیفة أن رد المثل کان واجبا، والفائت بالکساد، لیس إلا وصف الثمنیة، وهذا وصف لا تعلق لجواز القرض به، ألا تری أنه یجوز استقراضه بعد الکساد ابتداءاً وإن خرج من کونه ثمنا، فلأن یجوز بقاء القرض فیه أولی، لأن البقاء أسهل، وکذلک الجواب فی الدراهم التی یغلب علیها الغش، لأنها فی حکم الفلوس'' (بدائع الصنائع: کتاب القرض ۷/۳۹۵)۔

(اور اگر فلوس قرض لیے، پھر ملک سے ان کا رواج بند ہوگیا، تو اس پر اسی کے مثل فلوس امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک لازم ہیں، اور صاحبین کے نزدیک اس پر ان فلوس کی قیمت لازم ہے، صاحبین کے قول کی دلیل یہ ہے کہ باب قرض میں قبضہ کردہ شی کے مثل لوٹانا واجب ہے، اور وہ مثل لوٹانے سے عاجز ہو چکا ہے، کیونکہ قبضہ کردہ فلوس ثمن تھے اور رواج بند ہونے سے ان کی ثمنیت باطل ہو چکی ہے، چنانچہ وہ مثل لوٹانے سے عاجز ہوگیا، لہذا اس پر قیمت لوٹانا واجب ہے، جیسے پختہ کھجور قرض لے، پھر وہ لوگوں کے ہاتھ سے ناپید ہو جائے، تو اس پر اس کی قیمت لازم ہے، اس دلیل سے جو ابھی ہم نے بیان کی، ایسے ہی یہاں بھی قیمت لازم ہوگی، اور امام ابوحنیفہؒ

کی دلیل یہ ہے کہ مثل کا **لوٹانا** واجب تھا، اور رواج بند ہونے سے صرف ثمنیت کی صفت فوت ہوئی، اور یہ ایسی صفت ہے کہ قرض کے جواز کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے، کیا تم دیکھتے نہیں کہ رواج بند ہونے کے بعد بھی ابتداءً فلوس کا قرض لینا جائز ہے، اگر چہ ثمن ہونے سے نکل جائے، تو ان میں قرض کے باقی رہنے کا جواز بدرجہ اولی ہوگا، کیونکہ ابتداء کے مقابلہ میں بقا آسان ہے، اور یہی جواب ہے ان دراہم کے سلسلہ میں جن پر کھوٹ غالب ہو، کیونکہ وہ فلوس کے حکم میں ہیں)۔

اور ہدایہ میں ہے:

"ولو استقرض فلوساً نافقة، فكسدت عند أبي حنيفة يجب عليه مثلها، لأنه إعارة وموجبه رد العين معنىً، والثمنية فضل فيه، إذ القرض لا يختص به، وعندهما تجب قيمتها؛ لأنه لما بطل وصف الثمنية، تعذر ردها، كما قبض، فيجب رد قيمتها، كما إذا استقرض مثليا، فانقطع، لكن عند أبي يوسف يوم القبض، وعند محمد يوم الكساد، على ما مر من قبل، وأصل الاختلاف فيمن غصب مثلياً فانقطع وقول محمد انظر للجانبين، وقول أبي يوسف أيسر" (الہدایہ شرح بدایۃ المبتدی لابی الحسن علی بن ابی بکر المرشدانی المرغینانی (۵۹۳ھ): کتاب الصرف ۸۵/۳، ط: دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔

(اور اگر رواج پذیر فلوس قرض لیے، پھر ملک سے ان کا رواج بند ہوگیا، تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ان کا مثل اس پر لازم ہے، اس لئے کہ یہ اعارہ ہے اور اس کا تقاضا معنوی اعتبار سے بعینہ اسی شئ کو **لوٹانا** ہے، اور ثمنیت اس میں وصف زائد ہے، کیونکہ قرض ثمن کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، اور صاحبین کے نزدیک ان کی قیمت واجب ہے، کیونکہ جب ثمنیت کا وصف باطل ہوگیا، تو ان کو اس حالت میں **لوٹانا** دشوار ہوگیا، جس حالت میں اس نے قبضہ کیا تھا، لہذا ان کی قیمت کو

لوٹانا واجب ہے، جیسے مثلی سامان قرض لے، اور وہ بازار سے ناپید ہو جائے، لیکن امام ابو یوسف کے نزدیک قبضہ کے دن کی قیمت کا اعتبار ہے، اور امام محمد کے نزدیک رواج بند ہونے کے دن کی قیمت کا اعتبار ہے، جیسا کہ پہلے گزرا، اور اصل اختلاف اس شخص کے بارے میں ہے، جس نے مثلی سامان غصب کیا، پھر وہ بازار سے ناپید ہوگیا، اور امام محمد کے قول میں دونوں فریق کی رعایت ہے، اور امام ابو یوسف کا قول آسان ہے)۔

اور عنایہ میں ہے:

"ولا شک أن قيمة يوم القبض أكثر من قيمة يوم الانقطاع، وهو ضرر بالمستقرض، فكان قول محمد انظر للجانبين، وقول أبي يوسف أيسر، لأن قيمته يوم القبض معلومة للمقرض والمستقرض، وسائر الناس، وقيمة يوم الانقطاع تشتبه على الناس، ويختلفون فيها، فكان قوله أيسر" (العنایہ ۲۷۹/۶-۲۸۰)۔

(اس میں کوئی شک نہیں کہ قبضہ کے دن کی قیمت بازار سے ناپید ہونے کے دن کی قیمت سے زیادہ ہے اور اس میں مدیون کا نقصان ہے، لہذا امام محمد کے قول میں فریقین کی رعایت ہے (قرض خواہ کی رعایت یہ ہے کہ اس کو مثل نہ مل کر قیمت مل رہی ہے اور مدیون کی رعایت اس طرح ہے کہ اسے بازار سے ناپید ہونے یا ملک سے رواج کے بند ہونے کے آخری دن کی قیمت دینی ہوگی، جو کہ کم ہے) اور امام ابو یوسف کا قول آسان ہے، کیونکہ قبضہ کے دن کی قیمت قرض دینے اور لینے والے اور تمام لوگوں کو معلوم ہے، اور بازار سے ناپید ہونے کے دن کی قیمت لوگوں پر مشتبہ ہو جاتی ہے، اور اس کے بارے میں لوگوں کا اختلاف ہو جاتا ہے، لہذا ان کا قول آسان ہوا)۔

علامہ شامی تحریر کرتے ہیں:

"قال في الولوالجية في الفصل الخامس من كتاب البيوع: رجل

اشترى ثوباً بدراهم نقد البلدة، فلم ينقدها، حتى تغيرت، فهذا على وجهين: إن كانت تلك الدراهم لا تروج اليوم في السوق أصلاً، فسد البيع، لأنه لم يهلك، وليس له إلا ذلك، وإن انقطع بحيث لا يقدر عليها، فعليه قيمتها في آخر يوم، انقطع، من الذهب والفضة، هو المختار: ونظير هذا ما نص في كتاب الصرف: إذا اشترى شيئا بالفلوس ثم كسدت قبل القبض، بطل الشراء، يعني فسد، ولو رجعت لا يفسد" (تنبیہ الرقود علی مسائل النقود لابن عابدین ۲/ ۵۸)۔

("الولوالجیہ" کی کتاب البیوع کی پانچویں فصل کی تحریر ہے کہ ایک شخص نے شہر میں رائج درہم کے بدلہ کپڑا خریدا، اور اسے ادا نہیں کیا، یہاں تک کہ اس میں تغیر واقع ہوگیا، تو اس کی دوصورتیں ہیں:

۱- اگر وہ دراہم بازار میں بالکل رائج نہ ہوں، تو بیع فاسد ہوجائے گی، اس لئے کہ ثمن ہلاک ہوگیا۔

۲- اور اگر رائج ہوں لیکن اس کی قیمت میں گراوٹ آگئی ہو، تو بیع فاسد نہ ہوگی، اس لئے کہ ثمن ہلاک نہیں ہوا، اور اسے وہی درہم ملیں گے، اور اگر درہم بازار سے ناپید ہوجائے، اس طرح کہ اس پر اسے قدرت نہ ہو، تو اس پر ناپید ہونے کے آخری دن کی اس کی قیمت سونے اور چاندی سے لازم ہوگی، یہی مختار ہے، اور اس کی نظیر وہ ہے جس کی صراحت "کتاب الصرف" میں کی ہے کہ کسی نے کوئی چیز فلوس کے ذریعہ خریدا، پھر قبضہ سے پہلے ان کا رواج بند ہوگیا، تو بیع باطل یعنی فاسد ہوگئی، اور اگر قیمت میں گراوٹ آجائے، تو بیع فاسد نہ ہوگی)۔

دوسری جگہ تحریر کرتے ہیں:

"في الخلاصة والبزازية: غلت الفلوس أو رخصت، فعند الامام الأول والثاني أولاً، ليس عليه غيرها، وقال الثاني: ثانيا: عليه قيمتها في يوم البيع

والقبض، وعلیه الفتوی، انتهی، أی یوم البیع فی البیع، ویوم القبض فی القبض، کذا فی النهر"(تنبیہ الرقود ۶۴) (خلاصہ اور بزازیہ میں ہے کہ فلوس میں گرانی یا ارزانی آجائے، تو امام ابوحنیفہ اور پہلے قول کے مطابق امام ابو یوسف کے نزدیک اس پر ان فلوس کے علاوہ لازم نہیں، اور امام ابو یوسف کا دوسرا قول یہ ہے کہ اس پر ان فلوس کی بیع اور قبضہ کے دن کی قیمت لازم ہے، اور اسی پر فتوی ہے، خلاصہ اور بزازیہ کی عبارت ختم ہوئی، یعنی بیع کی بیع کے دن کی قیمت کا اعتبار ہے، اور قرض میں قبضہ کے دن کی قیمت کا اعتبار ہے، ایسے ہی "النہر الفائق" میں ہے)۔

اور ایک جگہ تحریر کرتے ہیں:

"اور علامہ شیخ الاسلام محمد بن عبد اللہ التمر تاشی نے ایک رسالہ میں جس کا نام "بذل المجہود فی مسألۃ تغیر النقود" رکھا ہے یہ ذکر کیا ہے کہ جان لو! کہ اگر کسی نے ایسے دراہم سے خریدا، جن پر کھوٹ غالب ہو، یا فلوس کے ذریعہ خریدا اور دونوں میں سے ہر ایک رائج ہوں، یہاں تک کہ بیع جائز ہو، ان کی ثمنیت کی اصطلاح قائم ہونے کی وجہ سے، اور ان کے ثمن کے ساتھ لاحق ہونے کی وجہ سے، اشارہ کی ضرورت نہ ہونے کی بنا پر، اور مشتری نے ان کو بائع کے حوالہ نہیں کیا، پھر ان کا رواج بند ہو گیا، تو بیع باطل ہو جائے گی، اور لوگوں کے ہاتھوں سے ناپید ہونا رواج بند ہونے کی طرح ہے، اور دراہم کا حکم بھی ایسے ہی ہے، چنانچہ اگر دراہم سے خریدے پھر ان کا رواج بند ہو جائے، یا ناپید ہو جائے، تو بیع باطل ہو جائے گی، اور مشتری پر واجب ہوگا کہ مبیع کو لوٹا دے اگر موجود ہو اور اس کا مثل لوٹا دے اگر مبیع ہلاک ہو جائے، اور وہ مثلی ہو، ورنہ قیمت لوٹا دے، اور اگر مبیع پر قبضہ نہ ہو، تو اس بیع کا بالکل کوئی حکم نہیں، اور یہ امام اعظم کے نزدیک ہے، اور صاحبین کا کہنا ہے کہ بیع باطل نہ ہوگی، کیونکہ دشوار رواج بند ہونے کے بعد ثمن کا حوالہ کرنا ہے، اور یہ فساد کو ثابت نہیں کرتا ہے، کیونکہ دوبارہ رواج پذیر ہونے کے ذریعہ دشواری کے زوال

کا امکان ہے، جیسے اگر کسی نے کوئی شی پختہ کھجور کے بدلہ خریدی، پھر وہ نا پید ہوگئی، اور جب بیع باطل نہیں ہوئی، اور ثمن کا حوالہ کرنا دشوار ہوگیا، تو اس کی قیمت واجب ہوگی، لیکن ابو یوسف کے نزدیک بیع کے دن کی قیمت واجب ہوگی، اور امام محمد کے نزدیک رواج بند ہونے کے دن کی قیمت واجب ہوگی، یعنی اس آخری دن کی قیمت جس میں لوگوں نے اس کے ساتھ تعامل کیا، اور ''ذخیرہ'' میں ہے کہ فتوی امام ابو یوسف کے قول پر ہے، اور ''المحیط''، اور ''التتمہ'' اور الحقائق میں ہے کہ لوگوں پر نرمی کی خاطر امام محمد کے قول پر فتوی دیا جائے گا'' (تنبیہ الرقود ۵۸-۵۹)۔

ایک جگہ تحریر کرتے ہیں: ''وقال أبو یوسف: یجب علیه قیمة النقد الذی وقع علیه العقد من النقد الآخر یوم التعامل، وقال محمد: یجب آخر ما انقطع من أیدی الناس قال القاضی: الفتوی فی المهر والقرض علی قول أبی یوسف، وفیما سوی ذلک علی قول أبی حنیفة'' (تنبیہ الرقود ۵۸، نیز دیکھئے: ص ۵۹-۶۰) (اور امام ابو یوسف کا قول ہے کہ اس پر دوسرے سکہ سے معاملہ کے دن کی اس سکہ کی قیمت واجب ہے جس پر عقد ہوا ہے، اور امام محمد کہتے ہیں کہ لوگوں کے ہاتھ سے نا پید ہونے کے آخری دن کی قیمت واجب ہے، قاضی کا کہنا ہے کہ مہر اور قرض میں فتوی ابو یوسف کے قول پر ہے، اور اس کے علاوہ امور میں فتوی امام صاحب کے قول پر ہے)۔

''کفایہ'' میں ہے: ''وفی فتاوی قاضیخان قال محمد: قیمتها فی آخر یوم کانت رائجة، وعلیه الفتوی'' (الکفایہ ۶/ ۲۸۰) (فتاوی قاضی خان میں ہے کہ امام محمد کا قول ہے کہ رواج کے آخری دن کے فلوس کی قیمت واجب ہے، اور اسی پر فتوی ہے)۔

علامہ شامی تحریر کرتے ہیں:

''قال الامام الاسبیجابی فی شرح الطحاوی: ''وأجمعوا أن الفلوس إذا لم تکسد، ولکن غلب قیمتها أو رخصت فعلیه مثل ما قبض من العدد'' (تنبیہ الرقود ۶۲)۔

(امام اسبیجابی نے طحاوی کی شرح میں لکھا ہے کہ فقہاء کا اتفاق ہے کہ فلوس کا رواج اگر بند نہ ہو، لیکن اس کی قیمت میں گرانی یا ارزانی آجائے، تو جس تعداد پر اس نے قبضہ کیا ہے اسی کے مثل اس پر لوٹانا واجب ہے۔

ایک دوسری جگہ تحریر کرتے ہیں:

''اور اس سے معلوم ہوا کہ انقطاع میں دو قول ہیں: (۱) بیع کا فاسد ہونا جیسا کہ کساد کی صورت میں ہے، (۲) اور دوسرا قول یہ ہے کہ ناپید ہونے والے سکہ کی قیمت بازار سے ناپید ہونے کے آخری دن کی قیمت کے لحاظ سے واجب ہوگی، اور یہی مختار ہے، جیسا کہ مضمرات سے گزرا، اور ایسے ہی ارزانی وگرانی کے بارے میں بھی دو قول ہیں: پہلا قول یہ ہے کہ اسے اس کے علاوہ نہیں ملے گا، اور دوسرا قول یہ ہے کہ اسے بیع کے دن کی اس کی قیمت ملے گی، اور اسی پر فتوی ہے، جیسا کہ عنقریب آرہا ہے، علامہ غزی نے سابق عبارت کے بعد تحریر کیا ہے کہ یہ حکم اس حالت میں ہے جب کہ کساد یا انقطاع ہو، رہا جبکہ اس کی قیمت میں گرانی یا کمی آجائے تو بیع اپنی حالت پر رہے گی، اور مشتری کو اختیار نہیں ہوگا، اور اس سے اسی ویلو کے سکہ کا مطالبہ کیا جائے گا، جو بیع کے وقت تھا، اسی طرح ''فتح القدیر'' میں ہے'' (تنبیہ الرقود ر ٦٠، نیز دیکھئے: ص ر ٦٤)۔

ان عبارتوں سے درج ذیل نتائج حاصل ہوتے ہیں:

۱-فقہاء احناف کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ذمہ میں ثابت ہونے والے سونا یا چاندی کے سکے اپنے مثل کے ساتھ ادا کئے جائیں گے، ان میں قیمت کی تبدیلی کا اعتبار نہ ہوگا۔

۲-فلوس اور ان دراہم کے بارے میں جن میں کھوٹ غالب ہو تین حالات میں اختلاف ہے:

الف-کساد (پورے ملک میں اس کا رواج بند ہوجائے، اور اس کے ذریعہ معاملہ متروک ہوجائے)۔

ب- انقطاع (بازار سے ناپید ہوجائے)۔

ج- قیمت میں تغیر ہوجائے۔

۳- امام صاحب کے نزدیک ان تمام حالات میں مثل واجب ہے۔

۴- امام ابو یوسف ان تمام حالات میں حق کے ثابت ہونے کے دن کی قیمت کے وجوب کے قائل ہیں، جبکہ پہلے وہ قیمت کے متغیر ہونے کی حالت میں امام صاحب کی رائے کے موافق تھے۔

۵- امام محمد قیمت متغیر ہونے کی حالت میں امام صاحب کی رائے کے موافق ہیں، لیکن کساد اور انقطاع کی حالت میں کساد یا انقطاع کے آخری دن کی قیمت کے وجوب کے قائل ہیں۔

۶- مفتی بہ قول کے سلسلہ میں اختلاف ہے:

الف- بعض نے امام صاحب کی رائے کے بارے میں لکھا ہے کہ اس پر مذہب کا اجماع ہے۔

ب- بعض نے صاحبین میں سے ایک کی رائے پر فتوی دیا ہے۔

ج- بعض نے کساد اور انقطاع میں فرق کیا ہے۔

د- بعض نے مہر اور قرض کے سلسلہ میں امام ابو یوسف کی رائے کو اختیار کیا ہے، اور دیگر حقوق میں امام صاحب کے قول کو مفتی بہ قرار دیا ہے۔

امام ابو یوسف کے مسلک کے اعتبار سے بھی دیون کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنا صحیح نہیں ہے؛ کیونکہ ماہرین معاشیات افراط زر اور نوٹ کی قیمت کی گراوٹ کا اندازہ سامان کے اعتبار سے لگاتے ہیں، جبکہ امام ابو یوسفؒ اور دیگر فقہاء احناف سونے یا چاندی کے سکے کے لحاظ سے فلوس کی قیمت کی گراوٹ مانتے ہیں، مثلاً ایک درہم تیس فلس میں ہو، اور پچاس فلس میں

ہو جائے، تو اس وقت یہ کہا جائے گا کہ فلوس کی قیمت گر گئی، یہ حضرات خود درہم کی قوت خرید پر نظر نہیں رکھتے ہیں، جبکہ ماہرین معاشیات خود درہم کی قوت خرید پر بھی نظر رکھتے ہیں۔

لہذا امام ابو یوسف کے مسلک کے مطابق ہم کہہ سکتے ہیں کہ چار چونی کی قیمت ایک روپے کے برابر ہو، اور بعد میں اس میں گراوٹ آجائے، اور چھ چونی ایک روپے کے برابر ہو جائے، تو چھ چونی ادا کرنا لازم ہوگا، یعنی بنیادی سکہ کے مقابلہ میں معاون سکہ کی قیمت میں گراوٹ آجائے، تو امام ابو یوسف کے قول پر فتوی دیا جا سکتا ہے۔

ہاں اگر افراط زر کی وہ حالت پیش آئے کہ کاغذی نوٹ بے قیمت ہو جائیں تو امام ابو یوسف کے قول پر فتوی دیا جا سکتا ہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ دیون کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنا اس لئے بھی درست نہیں ہے کہ اشاریہ کی ترتیب کا طریقہ ٹھوس بنیاد پر نہیں ہے، بلکہ سامان، خدمات، اور خرچ کے تخمینی طریقہ پر مبنی ہے۔

نیز عامۃ الناس کے درمیان ادائیگیوں کے لئے ایسا معیار مقرر کرنا جن کی بنیاد دقیق فنی اصولوں پر ہو، شریعت کے مزاج سے بھی ہم آہنگ نہیں، جو تمام لوگوں کے حق میں آسانی کو پسند کرتی ہے۔

اسی کے ساتھ دیون کو قیمتوں کے اشاریہ سے مربوط کرنا اس لئے بھی ناجائز ہے کہ اس سے سود کا دروازہ پوری طرح کھل جائے گا، چنانچہ اگر ایک آدمی نے ہزار روپے قرض لئے، پھر (۳۰٪) کے بقدر افراط زر ہوا، تو اسے تیرہ سو روپے ادا کرنے ہوں گے، اور ظاہر ہے کہ یہ ربا قرض ہو گیا۔

نیز دیون کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنا، اس لئے بھی درست نہیں ہے کہ افراط زر خود سودی نظام کی پیداوار ہے، جبکہ اسلامی شریعت جس اقتصادی نظام کو پروان چڑھانا چاہتی

ہے اسے افراط زر سے پاک ہونا چاہئے۔

نیز دیون کو قیمتوں کے اشاریہ سے مربوط کرنا اس لئے بھی درست نہیں ہے کہ بے چارہ مدیون کا افراط زر میں کوئی دخل نہیں ہے، پھر اس بے چارہ کو نا کردہ گناہ کی سزا کیوں دی جائے۔

امام ابوحنیفہ کی طرح مالکیہ اور شافعیہ بھی نقدین اور فلوس میں فرق کئے بغیر مثل کے لوٹانے کے وجوب کے قائل ہیں، جبکہ ان کا تعامل بند ہوجائے، اور وہ موجود ہوں، اگر مثل معدوم ہوجائے، تو پھر قیمت کی طرف رجوع کیا جائے گا۔

فقہ مالکی کی کتاب ''الشرح الصغیر'' میں ہے:

''وإن بطلت معاملة من دنانير أو دراهم أو فلوس، ترتبت لشخص على غيره من قرض أو بيع، أو تغير التعامل بها بزيادة أو نقص، فالمثل أى فالواجب قضاء المثل على من ترتبت فى ذمته، إن كانت موجودة فى بلد المعاملة، وإن عدمت فى بلد المعاملة، وإن وجدت فى غيرها، فالقيمة يوم الحكم، أى تعتبر يوم الحكم بأن يدفع له قيمتها عرضا، أو يقوّم العرض بعين من المتجددة'' (الشرح الصغیر مع حاشیۃ الصاوی، قضاء القرض بما ہو أفضل صفۃ ۶/ ۲۸۹، من المکتبۃ الشاملہ)۔

(اگر دینار یا درہم یا فلوس کا معاملہ باطل ہوجائے جو کسی شخص کا دوسرے پر مرتب ہورہے ہوں قرض یا بیع کی شکل میں، یا کمی یا زیادتی کے ساتھ ان سے تعامل میں تبدیلی آجائے تو اس شخص پر مثل ادا کرنا واجب ہے، جس کے ذمہ میں وہ مرتب ہورہے ہوں، اگر اس کا مثل معاملہ کے شہر میں موجود ہو، اور اگر معاملہ کے شہر سے معدوم ہوجائے، اگر چہ دوسری جگہ موجود ہو، تو فیصلہ کے دن کی قیمت کا اعتبار ہے، یعنی فیصلہ کے دن کی قیمت کا اعتبار ہوگا، اس طرح کہ اسے سامان کی شکل میں اس کی قیمت دے دے، یا سامان کی قیمت نئے سکہ سے لگائی جائے)۔

دسوقی مالکی تحریر کرتے ہیں:

''يوم الحكم أى الذى هو متأخر عن يوم العدم، وعن يوم الاستحقاق، وانظر على هذا القول، إذا لم يقع تحاكم، والظاهر أن طلبها بمنزلة التحاكم، وحينئذ، فتعتبر القيمة يوم طلبها'' (حاشیۃ الدسوقی علی الشرح الکبیر لمحمد بن احمد بن عرفۃ الدسوقی المالکی (۱۲۳۰ھ)، باب منعقد البیع بما یدل علی الرضا ۳/۴۲۷، ط: دار الکتب العلمیہ بیروت)۔

(فیصلہ کا دن جو معدوم ہونے اور حقدار ہونے کے دن سے مؤخر ہے، اور اس قول کی بنا پر غور کرو اس صورت کے بارے میں، جس میں معاملہ حاکم کے پاس نہ لے جایا جائے، اور ظاہر یہ ہے کہ قیمت کا طلب کرنا مقدمہ لے جانے کے درجہ میں ہے، چنانچہ اس وقت اس کے مطالبہ کے دن کی قیمت کا اعتبار ہوگا)۔

مالکی مذہب میں سونے چاندی کے علاوہ سے بھی قیمت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، جبکہ سحنون کا قول ہے کہ قیمت سونے اور چاندی ہی سے معلوم کی جائے گی (البیان والتحصیل لابی الولید ابن رشد (الجد) القرطبی (۵۲۰ھ) ۷/۲۱۴، ط: دار الغرب الاسلامی، بیروت، ۱۹۸۴ء)۔

اور امام نووی شافعی تحریر کرتے ہیں:

''ولو أقرضه نقداً، فأبطل السلطان المعاملة به، فليس له إلا النقد الذى أقرضه'' (روضۃ الطالبین وعمدۃ المفتین للنووی (۶۷۶ھ) ۴/۳۷، باب القرض، ط: المکتب الاسلامی، بیروت، الطبعۃ الثالثۃ ۱۹۹۱ء)۔

(اور اگر کسی کو چاندی یا سونے کے سکے قرض میں دے، پھر بادشاہ اس کے ذریعہ معاملہ کو باطل کردے، تو اسے وہی سکہ ملے گا جو اس نے قرض دیا تھا)۔

اور شیرازی شافعی تحریر کرتے ہیں:

''ويجب على المستقرض رد المثل فيما له مثل، لأن مقتضى القرض رد المثل، ولهذا يقال: الدنيا قروض ومكافأة فوجب أن يرد المثل، وفيما لا

مثل له وجهان: أحدهما: يجب عليه القيمة، لأن ما ضمن بالمثل، إذا كان له مثل، ضمن بالقيمة، اذا لم يكن له مثل كالمتلفات، والثاني: يجب عليه مثله في الخلقة والصورة" (المہذب مع شرحہ المجموع: باب القرض ۲۴۱/۱۳، ط: دار الفکر بیروت، ۲۰۰۵ء)۔

(اور قرض لینے والے پر واجب ہے کہ مثل لوٹائے، جس چیز کا مثل موجود ہو، کیونکہ قرض کا تقاضا مثل کو لوٹانا ہے، اور اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ دنیا بدلہ ہے، لہٰذا لازم ہوا کہ مثل کو لوٹائے، اور جس چیز کا مثل نہ ہو تو دو صورتیں ہیں:

اول: ان میں سے ایک صورت یہ ہے کہ اس پر قبضہ کے دن کی قیمت واجب ہو، کیونکہ جس چیز کا ضمان مثل کے ذریعہ ہو، جبکہ اس کا مثل ہو، تو اگر اس کا مثل نہ ہو تو قیمت کے ذریعہ اس کا ضمان ہوگا ضائع کردہ اشیاء کی طرح۔

دوم: اور دوسری صورت یہ ہے کہ اس پر خلقت اور صورت کے لحاظ سے اس کا مثل واجب ہوگا)۔

اور حنابلہ کی رائے ہے کہ اگر سلطان ان سکوں کے ساتھ تعامل کو ناجائز قرار دے اور لوگ ان کے ترک پر متفق ہو جائیں تو پھر ان سکوں کی قیمت لوٹانا ہوگا، نہ کہ مثل، خواہ وہ سکے موجود ہوں یا نہ ہوں، لیکن اگر ان سکوں میں ارزانی یا گرانی آجائے، تو پھر وہی سکے لوٹائے جائیں گے۔

ابن قدامہ تحریر کرتے ہیں:

"المستقرض يرد المثل في المثليات، سواء رخص سعره أو غلا،أو كان بحاله، ولو كان ما أقرضه موجوداً بعينه، فرده من غير عيب يحدث فيه، لزم قبوله، سواء تغير سعره، أو لم يتغير، وإن حدث به عيب، لم يلزمه قبوله، وإن كان القرض فلوسا، أو مكسرة، فحرمها السلطان وتركت المعاملة بها،

كان للمقرض قيمتها ولو يلزمه قبولها، سواء كانت قائمة في يده، أو استهلكها، لأنها تعيبت في ملكه" (المغنی لابن قدامہ ابی محمد عبد اللہ بن احمد (۶۲۰ھ)، باب القرض، وجوب رد المثل أو العين في القرض ۴/۳۹۶، ط: المکتبۃ التجاریۃ، مکۃ المکرمہ)۔

(قرض لینے والا مثلیات میں مثل لوٹائے گا، خواہ اس کا دام ارزاں ہوجائے یا گراں ہوجائے، یا اپنی سابقہ حالت پر رہے، اور اگر وہ سامان جسے اس نے قرض میں دیا تھا، بعینہ موجود ہو اور اس نے اسے اس عیب کے بغیر لوٹایا جو اس میں پیدا ہو، تو اس پر اس کا قبول کرنا لازم ہے، خواہ اس کا دام بدل گیا ہو یا نہ بدلا ہو، اور اگر اس میں عیب پیدا ہوگیا ہوتو اس پر اس کا قبول کرنا لازم نہیں ہے، اور اگر قرض فلوس ہوں یا کھوٹے درہم ہوں اور سلطان ان کو حرام ٹھہرا دے اور اس کے ذریعہ معاملہ چھوڑ دیا جائے تو قرض خواہ کو قرض کے دن کی اس کی قیمت ملے گی، اور ان سکوں کا قبول کرنا اس پر لازم نہیں، خواہ اس کے قبضہ میں موجود ہوں، یا اس نے اس کو ضائع کردیا ہو، اس لئے کہ وہ اس کی ملکیت میں عیب دار ہوگئے)۔

البتہ استثنائی حالات میں، جیسے ملک کو جنگ کا سامنا ہونے کی وجہ سے یا حکومت کی جانب سے کرنسی کی قیمت اچانک کم کردینے کے سبب اگر کرنسی میں بھاری گراوٹ آجائے، ایسی زبردست گراوٹ جو سودا کرتے وقت عام طور سے فریقین کی نگاہ میں نہیں ہوتی ہے، یا مہر میں طول زمانہ کی وجہ سے گراوٹ فحش درجہ کو پہنچ جائے، یعنی کرنسی کی قیمت، نکاح کے وقت سے، یا بیع میں عقد کے وقت سے، اور قرض میں قبضہ کے وقت سے، ایک تہائی سے بھی کم رہ جائے، ان دلائل کے پیش نظر جو حد کثرت کی تحدید ثلث سے کرتے ہیں، اور قرض خواہ رواداری سے کام نہ لے اور معاملہ عدالت تک پہنچے، تو ایسی صورت میں قاضی کرنسی کی قیمت کا اعتبار کرتے ہوئے نقصان کو فریقین پر نصف نصف کردے، اس لئے کہ عبادہ بن صامتؓ کی روایت میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: "لا ضرر ولا ضرار" (ابن ماجہ حدیث نمبر: ۲۳۴۰، بإسناد حسن)

(دوسرے کو نہ ابتداءً ضرر پہنچانا جائز ہے، نہ بدلہ کے طور پر، یا نہ دوسرے کو اپنے نفع کی خاطر ضرر پہنچانا جائز ہے اور نہ ہی بغیر نفع حاصل کئے ہوئے یونہی بلا وجہ ضرر پہنچانا جائز ہے)۔

اور رہونی مالکی تحریر کرتے ہیں: "**وينبغي أن يقيد ذلك بما اذا لم يكثر ذلك جدا، حتى يصير القابض لها كالقابض لما لا كبير منفعة فيه**" (حاشیہ الرہونی علی الشرح الکبیر ۵/ ۱۲۲)۔

(مناسب ہے کہ اس کو اس صورت کے ساتھ مقید کیا جائے کہ جس میں تغیر بہت زیادہ نہ ہو، تا کہ ان سکوں پر قبضہ کرنے والا ایسا نہ ہوجائے کہ وہ ایسی چیز پر قبضہ کرنے والا ہے جس میں کوئی بڑا فائدہ نہیں ہے)۔

ہنگامی حالات میں جبکہ کرنسی کی قیمت ایک تہائی سے بھی کم رہ جائے ،نقصان کو نصف نصف فریقین پر تقسیم کرنے کی بات ایک ایسا حل ہے جو شریعت اسلامیہ کے اصول سے متفق ہے، کیونکہ شریعت کی بنیاد عدل پر ہے، ابن قیم تحریر کرتے ہیں: "**وحيثما ظهرت دلائل العدل، وسفر وجهه، فثم شرع الله وأمره**" (مجلۃ البحوث الاسلامیہ ۳۲ / ۳۲۵، الرئاسۃ العامۃ لإدارات البحوث العلمیہ مکۃ المکرمہ) (اور جہاں عدل کے آثار ظاہر ہوں، اور اپنا چہرہ بے نقاب کردے، وہیں اللہ کی شریعت اور اس کا حکم ہے)۔

۲-نوٹوں کی شکل میں قرض دیتے وقت یا مہر کے تقرر کے وقت یا ادھار فروختگی کے وقت طرفین واجب الاداء نوٹ کی مالیت سونے یا چاندی میں طے کرلیں، اور بوقت ادائیگی عمل میں آئے تو یہ درست نہیں ہے؛ کیونکہ عقود کی صحت کے لئے لازمی شرط معلومیت ہے اور سوال میں ذکر کردہ قرض لینے والے کو معلوم نہ ہوگا کہ اسے کتنا روپیہ لوٹانا ہے اور نہ ہی قرض خواہ کو معلوم ہوگا کہ اسے کتنا روپیہ ملے گا، اسی طرح نہ ادھار فروخت کرنے والے کو عقد کے وقت معلوم ہوگا کہ اسے کتنا نوٹ ملے گا، اور نہ ادھار خریدنے والے کو معلوم ہوگا کہ اسے کتنے نوٹ ادا کرنے

ہیں، ایسے ہی عقد کے وقت نہ بیوی کو معلوم ہوگا کہ اسے کتنے نوٹ ملیں گے، اور نہ ہی شوہر کو معلوم ہے کہ اسے کتنے نوٹ ادا کرنے ہیں، اور ایسی جہالت کے ساتھ عقد فاسد ہے۔

الدر المختار میں ہے:

"وشرط لصحته معرفة قدر مبيع وثمن" (الدر المختار شرح تنویر الابصار للحصکفی محمد بن علی (۱۰۸۸ھ) ط: دار الکتب العلمیہ، بیروت، الطبعۃ الاولی، ۱۹۹۴ء، کتاب البیوع ۷/۴۸) (بیع کی صحت کے لئے مبیع اور ثمن کی مقدار کا معلوم ہونا شرط ہے)۔

اور رد المحتار میں ہے:

"وخرج أيضا ما لو كان الثمن مجهولاً كالبيع بقيمته، أو برأس ماله، أو بما اشتراه، أو بمثل ما اشتراه فلان، فان علم المشترى بالقدر فى المجلس جاز" (رد المحتار: کتاب البیوع ۷/۴۹) (اور اس صورت کا بھی حکم معلوم ہوگیا کہ ثمن مجہول ہو، جیسے اس سامان کی قیمت کے بدلہ، یا اس کی اصل پونجی کے بدلہ بیع ہو، یا اس ثمن کے بدلہ یا اس ثمن کے مثل کے بدلہ جس کے ساتھ فلاں نے خریدا ہے، اگر مجلس میں مشتری کو مقدار معلوم ہو جائے، تو پھر بیع جائز ہے)۔

اور حدیث شریف میں ہے، جو ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا:

"أتيت النبى ﷺ فقتل: إنى أبيع الإبل بالنقيع فأبيع بالدنانير وآخذ الدراهم، وأبيع بالدراهم وآخذ الدنانير فقال: "لا بأس أن تأخذ بسعر يومها، مالم تفترقا، وبينكما شئ" (ابوداؤد: البیوع، باب فی اقتضاء الذہب من الورق حدیث نمبر: ۳۳۵۴، حاکم ۲/۴۴، صححہ ووافقہ الذہبی، احمد، حدیث نمبر ۶۲۳۹، وقال شعیب الارناؤط: اسنادہ ضعیف لتفرد سماک برفعہ)۔

(میں نبی کریم ﷺ کے پاس آیا، تو میں نے کہا کہ میں مقام "نقیع" میں اونٹ بیچتا ہوں، چنانچہ دینار کے بدلہ بیچتا ہوں اور درہم اس کے بدلہ لے لیتا ہوں، اور درہم کے بدلہ بیچتا

ہوں اور اس کے بدلہ دینار لے لیتا ہوں، تو آپ نے فرمایا: کوئی حرج نہیں کہ تم اسے اس دن کے دام کے بدلہ لو، جب تک تم دونوں اس حال میں جدا نہ ہو کہ تمہارے درمیان کچھ باقی رہے)۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دین کو اس کے مثل کے ساتھ ادا کیا جائے گا، نہ کہ قیمت کے ساتھ، اور اگر مثل دشوار ہو، تو پھر ادائیگی کے دن عقد صرف کے دام کے لحاظ سے ادائیگی کا حکم دیا جائے گا، اور دین کے ذمہ میں ثبوت کے دن کے دام کا اعتبار نہ ہوگا، ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ ثمن کو کسی چیز کی مالیت سے مربوط کرنا درست نہیں ہے، نیز اموال ربویہ کے تبادلہ میں مجلس میں قبضہ شرط ہے، جو اس صورت میں مفقود ہے۔

الدر المختار میں ہے:

"وإن وجد أحدهما أی القدر وحده أو الجنس، حل الفضل وحرم النساء، ولو مع التساوی" (الدر المختار، کتاب البیوع، باب الربا ۷/ ۴۰۴)۔

(اور اگر دونوں علتوں میں سے ایک پائی جائے یعنی صرف کیلی یا وزنی ہونا، یا صرف ہم جنس ہونا پایا جائے، تو زیادتی حلال ہے، اور ادھار حرام ہے، اگرچہ برابری کے ساتھ ہو)۔

البتہ متبادل یہ ہے کہ اگر افراط زر کا خطرہ ہو، تو (۱) سونے یا چاندی ہی میں دین کا عقد یا مہر کا تقرر کرے، (۲) مثلی سامان میں دین کا عقد کرے، (۳) کم تغیر والی کرنسی میں عقد کرے جیسے ڈالر وغیرہ۔

خلاصہ بحث:

۱- دیون کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنا درست نہیں ہے۔

۲- اگر کاغذی نوٹ بے قیمت ہو جائیں تو امام ابو یوسف کے قول پر فتوی دیا جائے گا۔

۳- ہنگامی حالات میں اگر کرنسی کی قیمت ایک تہائی سے بھی کم رہ جائے، اور فریقین

نظر انداز نہ کریں اور معاملہ عدالت میں آئے ،تو قاضی نقصان کو نصف نصف کر کے فریقین پر تقسیم کر دے۔

۴- واجب الادا نوٹ کی مالیت کو سونے یا چاندی یا ڈالر وغیرہ سے مربوط کرنا درست نہیں ہے۔

۵- افراط زر کے اندیشہ کے وقت فریقین معاملہ سونے یا چاندی یا کم تغیر والی کرنسی جیسے ڈالر وغیرہ میں کریں۔

موجودہ کرنسی نوٹ کی شرعی حیثیت

مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی ☆

یہ بات تقریباً طے ہوچکی ہے کہ ''کاغذی نوٹ'' ثمن ملفد ہے، اس لئے کہ ثمن کی تعریف فقہاء ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''الثمن ما یثبت فی الذمة بدلة من البیاعات من الدراهم والدنانیر''

(احکام القرآن للجصاص: ۲/ ۱۲)۔

(خرید وفروخت میں جو کچھ بدل کے طور پر ذمہ میں ثابت ہو خواہ درہم ہو یا دینار وہ ثمن کہلاتا ہے)۔

علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں:

''الثمن ما یثبت فی الذمة عند المقابلة وهو النقدان والمثلیات'' (شامی: ۴/ ۱۸۵، باب المرابحہ والتولیہ، مطلب فی بیان الثمن والمبیع، مطبوعہ رشیدیہ پاکستان)۔

(تبادلہ کے وقت ذمہ میں جو ثابت ہو وہ ثمن ہے، اور وہ نقدین (سونا و چاندی) اور مثلی اشیاء ہیں)۔

فقہاء نے ثمن کی تین قسمیں بیان کی ہیں:

۱- ثمن خلقی: جو ہر حال میں ذریعہ تبادلہ ہوتا ہے اور جس کو ثمن کے لئے ہی بنایا گیا ہے

☆ مدرسہ حسینیہ کائم کلم کیرالہ۔

جیسے سونا وچاندی۔

۲- ثمن اصطلاحی: جو عرف کی وجہ کر ثمن کی حیثیت اختیار کر لیا ہو جیسے فلوس و سکے۔

۳- مثلی وعددی اشیاء: جو کبھی تو ثمن ہو اور کبھی نہ ہو۔

"الأموال ثلاثة: الأول: ثمن بكل حال وهو النقدان، والمراد بالثمن هنا ما يثبت ديناً في الذمة، والثاني: مبيع بكل حال كالثياب والدواب. والثالث: ثمن من وجه مبيع من وجه كالمثليات أى غير النقدين وهى المكيل والموزون و العددى المتقارب، وأما الفلوس فإن رائجة فكثمن وإلا فكسلع، يستفاد من البحر أنها قسم رابع حيث قال: و ثمن بالاصطلاح وهو سلعة فى الأصل" (الدر مع الرد: ۴؍۱۷۴، کتاب الصرف، مطلب فی بیان ما یکون مبیعا و ما یکون ثمنا، مطبوعہ رشیدیہ پاکستان)۔

(اموال کی تین قسمیں ہیں:

۱- ہر حال میں ثمن ہو اور وہ نقدین ہیں۔ یہاں ثمن سے مراد یہ ہے کہ جو ذمہ میں بطور دین ثابت ہو۔

۲- ہر حال میں مبیع ہو جیسے ملبوسات وحیوانات۔

۳- من وجہ ثمن ہو اور من وجہ مبیع، جیسے مثلیات، یعنی نقدین کے ماسوا، اور یہ مکیل و موزون اور عددی متقارب ہیں۔

البتہ "فلوس" اگر رائج ہیں تو ثمن ہیں ورنہ سامان، بحر سے معلوم ہو رہا ہے کہ یہ چوتھی قسم ہے، کیوں کہ انہوں نے کہا ہے: اور عرف کی وجہ کر ثمن ہے ورنہ تو وہ سامان ہے)۔

موجودہ کرنسی نوٹ کے سلسلہ میں غور طلب امر یہ ہے کہ ثمن کی انواع ثلاثہ میں سے یہ کس قسم میں داخل ہے، یا کس قسم کے ساتھ لاحق کیا جا سکتا ہے۔

اکثر فقہاء کا رجحان یہ معلوم ہوتا ہے کہ "موجودہ کرنسی نوٹ" ثمن اصطلاحی کے

زمرے میں داخل ہے، لہٰذا وہ تمام احکام جو کسی زمانے میں "فلوس رائج" کے لئے ہوا کرتے تھے وہ احکام موجودہ "کرنسی نوٹ" پر بھی چسپاں کئے جا رہے ہیں۔

اس کے بالمقابل ایک خیال یہ ہے کہ بعض فروق کے ساتھ "نقد" یعنی "ثمن خلقی" کے حکم میں ہے، یہ بات زیادہ قرین قیاس اور ہم آہنگ روح شریعت معلوم ہوتی ہے؛ اس لیے کہ نقد (یعنی ثمن خلقی) جن اسباب وخواص کی وجہ کر نقد بنتا ہے وہ تمام اسباب وخاصیات کا حامل فی زمانناموجودہ سکے ہی ہیں۔ بعض ماہرین اقتصادیات نے ان عناصر کی تنقیح کی ہے اور خلاصہ کے طور پر بیان کیا ہے، علامہ یوسف قرضاوی "النظم النقدية والمصرفية" کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں:

"النقود هی کل مایستعمل مقیاساً للقیم، وواسطة للتبادل، وأداة للادخار فأی شیئ یؤدی هذه الوظیفة یعتبر نقوداً" (فقہ الزکاۃ للقرضاوی ۱/۲۷۶، مطبوعہ: دارالاشاعت، بیروت)۔

(نقد ہر وہ شئی ہے جو قیمتوں کے لئے پیمانہ ہو، ذریعہ تبادلہ اور ذخیرہ اندوزی کا سامان ہو، پس جو شئی بھی اس ضرورت کو پورا کرے گی وہ نقد ہے)۔

اسی طرح الحضارۃ الاسلامیہ کے مصنف رقم طراز ہیں:

"النقد ما یستخدم وسیطاً للتبادل ومقیاساً للقیم، ومخزوناً للثروة، ومعیاراً للمدفوعات الآجلة من الدیون" (الحضارۃ الاسلامیۃ ۲/۳۳۰ مطبوعہ: دارالکتاب، بیروت)۔

(نقد ہر وہ چیز ہے جو ذریعہ تبادلہ ہو، قیمتوں کے لئے پیمانہ ہو، ثروت ودولت کے لئے ذخیرہ کیا جانا ممکن ہو، اور مؤخر مطالبات کے لئے معیار ہو)۔

حاصل یہ ہے کہ نقد میں چار بنیادی عناصر پائے جاتے ہیں:

۱- نقد ذریعہ تبادلہ ہوتا ہے۔

۲- قیمتوں کے لئے معیار ہوتا ہے۔

۳- قابل مخزون ہوتا ہے۔

۴- مؤخر حقوق ومطالبات کے لیے معیار ہوتا ہے۔

ان چاروں عناصر کو جامع تو حقیقت میں سونا و چاندی ہی ہیں؛ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر کوئی دوسری شئی بھی ان چاروں اساس کو پورا کر رہی ہے تو کیا اس کا حکم بھی نقد کا ہوگا یا نہیں، بات بالکل واضح ہے کہ اس کا حکم بھی وہی ہونا چاہئے۔

موجودہ ''کرنسی نوٹ'' میں اگر غور کیا جائے تو موجودہ دور میں پورے طور پر اس سے تقاضائے اربعہ پورے ہورہے ہیں تو اب اس کے نقد ہونے میں شبہ ہی کیا رہ جاتا ہے۔

مؤخر مطالبات کی ادائیگی:

موجودہ ''کرنسی نوٹ'' کو نقد مان لینے کے بعد یہ سوال بہت اہم رہ جاتا ہے کہ مؤخر مطالبات جیسے: مہر، پنشن اور قرض وغیرہ کی ادائیگی کی کیا شکل ہو، جب کہ روز بروز ظاہر میں ''روپیہ'' کی ''قوت خرید'' گھٹتی جارہی ہے، سو روپے سے ایک سال قبل جو سامان پانچ کلو خرید سکتے تھے، آج ڈھائی کلو بھی خریدنا مشکل ہے، تو اگر قرض دینے والے کو صرف سو روپے ہی دلوائے جائیں تو اس کا بہت ہی نقصان ہوگا، جب کہ شریعت کا ایک اہم ضابطہ ہے: الضرر یزال (نقصان کا ازالہ کیا جائے گا)، ''لا تظلمون ولا تظلمون'' (نہ تم ظلم کرو، اور نہ تم پر ظلم کیا جائے)۔

لیکن قرض لینے والے کو اگر پابند کیا جائے کہ ایک سال قبل کے سو روپے قرض آج دو سو روپے سے ادا کرے تو اس سے ربا کا دروازہ چوپٹ کھلتا نظر آتا ہے۔

ایسے دورخے پہلو کو حل کرنے کے لئے اسلام کے مزاج و مذاق اور معاملات کی حقیقت وروح کو سامنے رکھنا ضروری ہوگا۔

جہاں تک اسلام کے مزاج و مذاق کا تعلق ہے تو اسلام نہیں چاہتا کہ کسی کو ضرر پہنچے، ہاں اگر دو ضرر کا خطرہ ہو تو اسلام کی تعلیم یہ ہوتی ہے کہ چھوٹا خطرہ برداشت کرلیا جائے تا کہ بڑا خطرہ ٹل جائے، اسی کو فقہاء کی زبان میں: "**الضرر الأشد یزال بالضرر الأخف**" (قواعد الفقہ/۸۸) (بڑا نقصان چھوٹے نقصان سے ختم کیا جائے گا) سے تعبیر کیا جاتا ہے، شریعت نے مختلف مواقع پر اس کی رعایت کی ہے۔

البتہ معاملات کے سلسلے میں ذہن نشین رہے کہ:

۱- معاملہ دیون کا ہے جو مثلیات میں صحیح ہے، قیمی اشیاء میں صحیح نہیں۔

۲- دیون کی ادائیگی میں مثلیت، کمیت (یعنی: وزن، کیل اور عدد) میں ضروری ہے قیمت میں نہیں۔

۳- ''مثلیت'' میں برابری محض سود سے بچنے کے لئے ہے اور یہ وزن، کیل اور عدد میں ہی ممکن ہے۔

۴- قوت خرید کی کمی بیشی میں اعتبار حکومت کے اعلان کا ہے نہ کہ عوام الناس کے عرف کا۔

۵- کیا روپے پیسے کی قیمت گھٹتی بڑھتی ہے یا سامان کی، محاورہ میں دونوں طرح کی بات رائج ہے، لیکن واقعاتی طور پر اور خود حکومت کے یہاں بھی سامان کی قیمت گھٹتی بڑھتی ہے، مثلاً آج سے کچھ سالوں پہلے ایک ہزار روپے میں چار ہزار لیٹر پٹرول خریدا جاسکتا تھا، جب کہ ایک موبائل خریدنا ممکن نہیں، لیکن آج ایک موبائل خرید سکتے ہیں جب کہ پٹرول صرف پانچ سو لیٹر ہی خریدا جاسکتا ہے، یہاں یہی تو کہا جائے گا کہ پٹرول کی قیمت زیادہ ہوگئی، اور موبائل کی قیمت گھٹ گئی۔ حکومت بھی اس کو قبول کرنے پر مجبور ہے؛ کیوں کہ اس کا رویہ ایسا ہی ہے، آپ جس بینک میں بھی پیسے جمع کریں خواہ دس سال کے بعد ہی نکالیں حکومت آپ کو اتنے ہی پیسے ادا

کرے گی جتنے آپ نے جمع کیے ہیں، جو زائد پیسے بظاہر ملتے نظر آتے ہیں وہ سود کی رقم ہے، آپ کی اپنی رقم نہیں، جب صورت حال یہ ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ سکوں سے مؤخر مطالبات بلا کم وکاست ادا کرنے میں دائن کا نقصان ضرور ہے لیکن بڑے ضرر کو دور کرنے کے لئے یہ اختیار کرنا ضروری ہے؛ اس لیے کہ معاملہ دیون میں مثلیت، کمیت میں معتبر ہے ورنہ سود لازم آئے گا، اور اگر مالیت وقیمت میں مساوات کو تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کر بھی لیں تو حکومت کے نزدیک مسلم عرف معتبر ہوگا، اور حکومت کے یہاں عرف یہی ہے کہ قیمت میں مساوات کا لحاظ نہیں اس لیے بھی قیمت میں مساوات ضروری نہیں ہوگی۔

قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ قرضوں کی ادائیگی کو منسلک کرنے پر ایک فقہی عبارت سے تائید اور اس کی تحقیق:

شامی وغیرہ میں امام ابو یوسف کی طرف منسوب کر کے ایک مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ فلوس کی قیمت ادا کرنے سے پہلے اگر گھٹ جائے تو بیع کی صورت میں بیع کے دن کی قیمت، اور قرض کی صورت میں قرض پر قبضے کے دن کی قیمت کا اعتبار ہوگا، اس کی کمیت یا عدد کا اعتبار نہیں، نیز قضاء وافتاء کے لئے یہی مناسب ہے، اور اسی پر فتویٰ بھی ہے، عبارت حسب ذیل ہے:

"وفی البزازية عن المنتقي: غلت الفلوس أو رخصت فعند الامام الأول والثانی أولاً ليس عليه غيرها، وقال الثانی ثانياً: عليه قيمتها من الدراهم يوم البيع والقبض وعليه الفتوى"۔

"وهكذا فيي الذخيرة والخلاصة عن المنتقي ونقله فی البحر وأقره، فحيث صرح بأن الفتوى عليه فی كثير من المعتبرات فيجب عليه أن يعول عليه إفتاء وقضاء ولم أر من جعل الفتوى على قول الإمام" (شامی: ۴؍ ۲۷ کتاب البیوع، مطلب مہم فی أحکام النقود إذا کسدت أو انقطعت أو غلت أو رخصت، مطبوعہ: رشیدیہ پاکستان)۔

(بزازیہ میں منتقی سے منقول ہے کہ (کسی چیز کو بیچنے کے بعد) فلوس کی قیمت زیادہ ہو یا کم ہو جائے تو امام اول (حضرت امام ابوحنیفہ) اور ثانی (حضرت امام ابو یوسف) کا پہلا قول یہ ہے کہ مشتری پر ان مقررہ فلوس کے علاوہ کچھ واجب نہیں، اور امام ثانی کا دوسرا قول یہ ہے کہ مشتری کے ذمہ فلوس کی وہ قیمت واجب الادا ہے جو بیع اور قبضہ کے دن تھی، اور اسی پر فتوی ہے۔

ذخیرہ اور خلاصہ میں بھی اسی طرح منتقی سے نقل ہے اور اسی بات کو بحر میں بھی نقل کیا ہے اور توثیق کی ہے، اس طرح بات واضح ہوگئی کہ فتوی بہت سے اہم معاملات میں اسی پر ہے لہذا فتوی دینے اور فیصلہ کرنے میں اس قول پر اعتماد ضروری ہے، مجھے نہیں معلوم کہ کسی نے امام ابوحنیفہ کے قول پر فتوی دیا ہو)۔

اس عبارت سے بہت حد تک اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ اگر قرض دینے کے دن اور واپسی کے دن کی قیمتوں میں تفاوت ہو تو لینے کے دن کی قیمت کا اعتبار کیا جائے گا اور اسی پر اعتماد کرنا ضروری ہے۔

لیکن اس سے استدلال اس لیے صحیح نہیں کہ ان فقہاء کے زمانے میں یہ ''فلوس'' سونے وچاندی کے دنانیر ودراہم سے ایسے ہی مربوط تھے جیسے آج ''کاغذ کے ایک روپے'' سے دو پچاس پیسے، فقہاء کے کلام سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، مثال کے طور پر:

۱－"عن فوائد الإمام أبی حفص الکبیر: استقرض منه دانق فلوس حال کونها عشرة بدانق فصارت ستة بدانق أو رخص وصار عشرون بدانق یأخذ منه عدد ما أعطی ولا یزید ولا ینقص، قلت: هذا مبنی علی قول الإمام الخ"

(شامی ۴/۲۷، کتاب البیوع، مطلب مہم فی احکام النقود إذا کسدت الخ، مطبوعہ رشیدیہ پاکستان)۔

(امام ابوحفص کبیر سے منقول ہے: ایک دانق فلوس جس کا دس، ایک دانق کے برابر ہے، پھر چھ فلوس ایک دانق کے مساوی ہو گئے یا اس کی قیمت گھٹ گئی، اور بیس فلوس ایک دانق

کے مساوی ہو گئے، تو امام ابو حنیفہ کے اصول کے مطابق عدد کی جتنی مقدار دیا ہے اسی قدر وصول کرے گا، کم یا زائد نہیں کرے گا)۔

۲- "ولو اشترى شيئاً بنصف درهم فلوس صح، وعليه فلوس تباع بنصف درهم" (فتاوی عالمگیری ۳/ ۲۲۴، کتاب الصرف، بیع الفلوس، مطبوعۃ بیروت)۔

(اور اگر کوئی چیز خریدے نصف درہم فلوس میں تو بیع صحیح ہے، اور اس پر وہ فلوس واجب ہے جو نصف درہم میں بیچے جاتے ہیں)۔

۳- "إذا اشترى بدانق فلس أو بقيراط فلس فهذا جائز استحساناً...... قال شمس الأئمة الحلواني: هذا إذا كان الدانق والقيراط معلومين فيما بين الناس لا يختلفان في معاملاتهم وإن كانا مختلفين يأخذ بعضهم عشرة وبعضهم تسعة لا يجوز العقد لمكان المنازعة" (فتاوی عالمگیری ۳/ ۲۲۴، کتاب الصرف بیع الفلوس، مطبوعۃ بیروت)۔

(جب (کوئی چیز) خریدے ایک دانق فلس یا ایک قیراط فلس میں تو یہ استحساناً جائز ہے، علامہ حلوانی فرماتے ہیں: یہ اس وقت ہے جب کہ دانق اور قیراط لوگوں کے مابین معلوم ہوں لین دین میں مختلف نہ ہوں، اگر دونوں مختلف ہوں بعض تو ایک دانق یا قیراط دس فلس میں اور بعض نو فلس میں لیتا ہو تو منازعت کی وجہ کر جائز نہیں ہے)۔

اس کے علاوہ بھی بہت سے شواہد ملتے ہیں جن میں فلوس کو درہم و دینار سے مربوط کیا گیا ہے، گویا کہ فلوس رائجہ فقہاء کے زمانہ تک بطور "ریزگاری" استعمال ہوتے تھے، یہ ایسے ہی ہے جیسے آج ہر روپیہ، دو پچاس پیسے کا مجموعہ ہوتا ہے، جب کہ آج سے کچھ عرصہ قبل تک چار پچیس پیسے یا دس، دس پیسوں کا مجموعہ تھا، اب ظاہر ہے کہ ایک آدمی نے ایک روپیہ قرض اس وقت لیا ہے جب کہ ایک روپیہ چار پچیس پیسے کا مجموعہ تھا، لیکن اب پچیس پیسے چلنا بند ہو گیا تو دو پچاس

پیسے دینے سے قرض ادا ہوگا نہ کہ چار پچیس پیسے دینے سے، امام ابو یوسفؒ غالباً یہی کہنا چاہتے ہیں؛ جب کہ امام ابو حنیفہؒ فلوس رائجہ کو غالباً درہم و دینار سے مربوط نہیں مانتے ہیں اس لئے کیت میں برابری کے قائل ہیں۔

موجودہ ''کرنسی نوٹ'' کی حیثیت بالکل جداگانہ ہے، اس کی اپنی مستقل حیثیت ہے کسی اور اصل سے مربوط نہیں لہذا جو حکم اصل درہم و دینار کا ہے وہی اس کا بھی ہونا چاہئے، علامہ قرضاوی بھی واتفاقی حیثیت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''فالحق أن هذا أمر مستحدث ليس له نظير في عصر الأئمة المجتهدين رضي الله عنهم حتى يقاس عليه ويلحق به'' (فقہ الزکاۃ ۱/ ۲۷۳ بیروت)۔

(صحیح یہ ہے کہ (موجودہ کرنسی نوٹ) نئی ایجاد ہے، اس کی نظیر ائمہ مجتہدین کے دور میں نہیں تھی کہ اس پر قیاس کر کے اس کے ساتھ لاحق کیا جائے)۔

اس لیے احقر کی رائے میں مؤخر مطالبات کی ادائیگی میں کیت میں برابری ہی معتبر ہے، اس میں کمی بیشی کرنا باب ربا کو مفتوح کرنا ہے۔ اس میں قرض دینے والے کا ظاہر میں نقصان ضرور ہے لیکن اس کے مقابلہ میں قرض دینے کا ثواب اور اس سے محرومی نیز سود میں ابتلاء کا عقاب زیادہ اشد ہے؛ اس لیے اتنا گوارا کرنے میں جب کہ عرف عام وخاص بھی یہی ہو، کچھ حرج نہیں ہے۔

مؤخر مطالبات میں بوقت وجوب سونا و چاندی سے مقدار واجب کو متعین کرنا:

قرض دیتے وقت یا مہر متعین کرتے وقت ہی اگر سونے و چاندی کی وہ مقدار متعین کر لی جائے جو ان نوٹوں کی مالیت کے مساوی ہو یعنی قرض و مہر تو کاغذی نوٹ ہو اور کاغذی نوٹ کی قیمت سونے یا چاندی سے متعین کرلیا جائے تو یہ گوناگوں خرابیوں کا مجموعہ ہوگا۔

مہر واجرت وغیرہ جن میں مبادلۃ الدیون نہیں ہوتا ان میں احسن طریقہ تو یہی ہے کہ سونے وچاندی سے مہر یا اجرت متعین کیا جائے، لیکن جن معاملات میں مبادلہ ہوتا ہے جیسے قرض وغیرہ، ان میں سونا وچاندی اس دین کی قیمت ہوں گے، یا مہر واجرت کاغذی نوٹوں سے متعین کرنے کے بعد سونے وچاندی سے مالیت کو متعین کرنے کی صورت میں بھی سونا یا چاندی کاغذی نوٹوں کی قیمت ہوگی، تو ان صورتوں میں مندرجہ ذیل خرابیاں لازم آئیں گی:

۱- نوٹوں کی مالیت کا تعین سونے وچاندی سے کرنا، دقیق فنی اصول پر مبنی ہے جو سیدھی سادی امت کے مزاج واحوال کے مناسب نہیں، حضور ﷺ نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا: **"نحن أمة أمية لا نكتب ولا نحسب"** (بخاری شریف ۱/ ۲۵۶ کتاب الصوم باب: قول النبی ﷺ لانکتب ولانحسب)۔

ہم امی لوگ ہیں، حساب وکتاب سے واقف نہیں، یعنی ایسے حساب وکتاب جو دقیق ہوں، غلطیوں کا احتمال ہو اس سے واقف نہیں، لہذا نوٹوں کی سونے وچاندی سے مالیت متعین کرنے میں امت کو بڑی الجھن میں پھنسانا ہے۔

۲- پھر ہر دیار بلکہ ہر روز کی قیمتوں میں اتار وچڑھاؤ تیزی سے ہو رہا ہے، اگر اس کو بنایا جائے تو منازعت کا سبب بھی ہوگا۔

۳- مذکورہ بالا صورت میں بیع الکالی بالکالی لازم آئے گی؛ اس لیے کہ سونا وچاندی بھی دین ہے، اور کاغذی نوٹ بھی دین ہے۔ اس کی ممانعت تو صحیح حدیثوں میں وارد ہے۔

۴- نیز یہ ربا النسیئہ ہے کہ نقدین پر مجلس میں تقابض نہیں ہوا، قبل از یں تصرف ہوگیا، جس کی حرمت میں کوئی اشتباہ نہیں، اس لئے اس طرح قیمتوں کے تعین میں فساد کی وجہ کر گنجائش معلوم نہیں ہوتی ہے۔

اس موضوع پر اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے علاوہ مختلف اکیڈمیوں اور تنظیموں نے

سمینار منعقد کئے ہیں، ۱۴۰۷ھ میں ایک سمینار اسلامی ترقیاتی بینک جدہ اور عالمی ادارہ برائے اسلامی اقتصادیات اسلام آباد نے مشترک طور پر منعقد کیا تھا، اس سمینار میں علماء ومفتیان کے علاوہ ماہرین اقتصادیات بھی جمع ہوئے اور سب نے متفقہ طور پر جو قرارداد پاس کیا وہ بھی مذکورہ نظریہ کی تائید کے لئے کافی ہے:

’’سمینار میں حاضر تمام علماء نے اس بات کی توثیق کی ہے کہ سود اور قرض کی احادیث میں جو مثلیت اور برابری ضروری قرار دی گئی ہے وہ شرعی جنس اور قدر یعنی وزن، ناپ اور عدد میں برابری مراد ہے، قیمت میں برابری مراد نہیں، اور یہ بات احادیث کے ذریعہ پوری طرح واضح ہوجاتی ہے جو احادیث اموال ربویہ کے تبادلہ کے وقت عمدہ اور گھٹیا ہونے کے وصف کو غیر معتبر قرار دیتی ہیں، اور اس پر امت کا اجماع ہے اور اسی پر عمل جاری ہے۔

ذمہ میں ثابت شدہ دیون چاہے وہ کسی بھی قسم کے ہوں ان کو قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ منسلک کر دینا جائز نہیں بایں طور کہ عاقدین عقد بیع یا عقد قرض کے وقت اس کرنسی کو جس کے ذریعہ عقد بیع یا عقد قرض کر رہے ہیں کسی سامان کے ساتھ منسلک کر کے یہ شرط ٹھہرائیں کہ مدیون ادائیگی کے وقت اس سامان کی قیمت موجودہ کرنسی میں ادا کرے گا‘‘ (یہ جائز نہیں ہے)۔

(بحوالہ: فقہی مقالات: مولانا محمد تقی عثمانی ۱/ ۳۷، مطبوعہ: زمزم دیوبند)۔

تلخیص مقالہ:

۱- موجودہ کرنسی نوٹ ثمن خلقی یعنی سونا وچاندی کے حکم میں ہے۔

۲- موجودہ کرنسی نوٹ نئی ایجاد ہے، فقہاء کے زمانے میں جو فلوس رائج تھے وہ درہم ودینار سے مربوط تھے، موجودہ کرنسی مستقل حیثیت کی حامل ہے، کسی اصل سے مربوط نہیں۔

۳- قرض ودین کی ادائیگی میں مثلیت، کمیت میں معتبر ہے، قیمت میں نہیں۔

۴- مؤخر مطالبات کی ادائیگی میں وہ مقدار ضروری ہے جو عندالوجوب لازم ہوتی ہے، اس میں کمی بیشی کرنا جائز نہیں۔

۵- ذمہ میں ثابت شدہ دیون کو قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ منسلک کرنا گوناگوں خرابیوں کی وجہ کر جائز نہیں۔ واللہ اعلم۔

کرنسی کے مسائل

مولانا محمد حذیفہ محمود ☆

۱-مؤخر مطالبوں کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنا:

دیون یعنی مؤخر مطالبوں کو اشیاء کی قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنا درست نہیں ہے، کیوں کہ نہ تو قیمتوں کے اشاریہ کی یقینی واطمینان بخش ترتیب اور اس کے ذریعہ ادائیگیوں میں انضباط ممکن اور آسان ہے اور نہ ہی فنی دقیق اصولوں پر مبنی ہونے کی وجہ سے عوامی تنازعہ سے بچا جا سکتا ہے، اس کے علاوہ اس سے سود کا دروازہ بھی کھل جائے گا۔

تفصیل یہ ہے کہ شریعت اسلامیہ میں قرضوں کو واجب الاداء مقدار کے مثل (برابر) ادا کرنا ضروری ہے، اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے، اور دلائل شریعت میں غور کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قرضوں کی ادائیگی میں جو برابری شریعت میں مطلوب ہے اس میں دو باتوں کا لحاظ ضروری ہے:

ایک یہ کہ برابری اور مثلیت مقدار اور کمیت میں ہو۔ قیمت اور مالیت کے اعتبار سے برابری مطلوب نہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے اس کو ربا الفضل کی احادیث میں پوری تشریح کے ساتھ واضح فرما دیا ہے۔

حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں ہمارے

☆ دار العلوم اولاواڑہ، گجرات۔

پاس ہر قسم کی ملی جلی کھجوریں آیا کرتی تھیں، ہم (گھٹیا کھجور کے) دو صاع کو (بڑھیا کھجور کے) ایک صاع کے بدلے میں بیچ دیتے تھے، جب حضور اکرم ﷺ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ دو صاع کھجور کو ایک صاع کھجور کے بدلے میں مت بیچو اور نہ دو صاع گندم کو ایک صاع گندم کے بدلے میں بیچو اور ایک درہم کو دو درہم کے عوض مت بیچو (رواہ مسلم، باب الربا ۲/ ۲۷ رقم الحدیث/ ۴۰۶۱)۔

یہ بات حضور ﷺ کو معلوم تھی کہ جو کھجور دو صاع کے بدلے میں بیچی جائیگی وہ اس کھجور کے مقابلہ میں زیادہ قیمتی ہوگی جو ایک صاع کے عوض بیچی جائے گی، لیکن اس کے باوجود حضور اکرم ﷺ اس پر راضی نہ ہوئے بلکہ مقدار اور ناپ میں مماثلت اور برابری کا حکم دیا اور قیمت کے فرق کا اعتبار نہیں کیا۔

حضرت ابو سعید خدریؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ایک شخص کو خیبر کا عامل (جو زکوۃ وغیرہ وصول کرے) بنا کر بھیجا، وہ عامل حضور ﷺ کے پاس جنیب کھجور (عمدہ قسم کی کھجور) لے کر آیا۔ حضور ﷺ نے سوال کیا کہ کیا خیبر کی تمام کھجور ایسی ہوتی ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ نہیں اے اللہ کے رسول! ہم (اس عمدہ کھجور کے) ایک صاع کو (گھٹیا کھجور کے) دو صاع کے بدلے میں لو اور دو صاع کھجور کو تین صاع کھجور کے بدلے میں لے لیتے ہیں، حضور ﷺ نے فرمایا: ایسا مت کرو بلکہ مختلف قسم کی ملی جلی کھجوروں کو پہلے دراہم کے عوض فروخت کرو پھر ان دراہم سے جنیب کھجور خرید لیا کرو (صحیح بخاری، باب اذا اراد بیع تمر بتمر خیر منہ، کتاب البیوع ۱/ ۲۹۳، رقم: ۲۲۰۱ - ۲۲۰۲)۔

یہ روایت اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اموال ربویہ میں جو تماثل اور برابری مطلوب ہے وہ مقدار میں تماثل ہے، قیمت میں تماثل اور برابری مطلوب نہیں، کیوں کہ جنیب کھجور جمع کھجور (مخلوط کھجور) کے مقابلہ میں بہت اعلی درجہ کی قیمتی اور عمدہ کھجور تھی اس کے باوجود

حضور ﷺ نے وزن میں برابری کو ضروری قرار دیا اور عمدہ اور گھٹیا ہونے کا بالکل اعتبار نہیں کیا۔

حضرت عبادہ بن صامتؓ سے روایت ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: سونے کو سونے کے بدلے میں، چاندی کو چاندی کے بدلے میں، گیہوں کو گیہوں کے بدلے میں، جو کو جو کے بدلے میں، کھجور کو کھجور کے بدلے میں اور نمک کو نمک کے بدلے میں ہاتھ در ہاتھ بیچو۔ ہاں! اگر ان اشیاء کی بیع میں جنس مختلف ہو جائے تو پھر جس طرح چاہو (کمی زیادتی کے ساتھ) بیچو، بشرطیکہ ہاتھ در ہاتھ ہو (نقد ہو، ادھار نہ ہو) (رواہ مسلم ۲/ ۲۵، باب الربا، رقم الحدیث: ۴۰۳۹)۔

مندرجہ بالا حدیث اور اس جیسی دیگر احادیث اس بات کو واضح طور پر بیان کر رہی ہیں کہ شریعت میں جو تماثل اور برابری معتبر ہے، اموال ربویہ میں قیمت کے تفاوت کا بالکل اعتبار نہیں، یہ احکام اس صورت میں ہیں جب بیع نقد ہو رہی ہو، اور اگر معاملہ قرض کا ہو جس میں اصل سود جاری ہوتا ہے اور جس میں ہر قسم کی زیادتی بلکہ زیادتی کے شبہ سے بھی بچنا ضروری ہے تو پھر اس میں قیمت کے تفاوت کا لحاظ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

دوسری بات: جس کا لحاظ قرضوں کی ادائیگی میں مطلوب برابری کے لئے ضروری ہے وہ یہ ہے کہ مثلیت اور برابری یقینی ہو، تخمینی نہ ہو۔ قرآن وسنت کی روشنی میں یہ تمام فقہاء کے نزدیک مسلم ہے کہ قرض کی واپسی کے وقت مقدار میں یقینی مثلیت اور قطعی برابری شرط ہے، اٹکل اور اندازے سے واپس کرنا جائز نہیں؛ حتی کہ اگر ایک شخص نے ایک صاع گندم بطور قرض لئے اور یہ شرط ٹھہرائی کہ قرض دار بغیر ناپ کے صرف اندازہ اور تخمین سے ایک صاع واپس کرے گا۔ تو قرض کا یہ معاملہ جائز نہیں؛ اس لئے کہ گیہوں اموال ربویہ میں سے ہے اور اموال ربویہ میں اندازہ اور تخمین سے واپس کرنا جائز نہیں۔ اسی وجہ سے حضور اکرم ﷺ نے بیع مزابنہ کو حرام قرار دیا ہے، بیع مزابنہ یہ ہے کہ درخت پر لگی ہوئی کھجور کو ٹوٹی ہوئی کھجور کے بدلے بیچا جائے اور

اس کی حرمت کی وجہ یہی ہے کہ جو کھجور ٹوٹی ہوئی ہے اس کی مقدار وزن کے ذریعہ معلوم کی جاسکتی ہے اور جو کھجور درخت پر لگی ہوئی ہے اس کی مقدار معلوم کرنے کا طریقہ انداز اور تخمین کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے، اس وجہ سے حضور اقدس ﷺ نے اس بیع کو علی الاطلاق حرام قرار دیدیا، حالانکہ بعض اوقات اندازہ بالکل صحیح یا صحیح کے قریب ہوتا ہے، لہذا اموال ربویہ میں سے بعض کو بعض سے تبادلہ کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ دونوں میں تبادلہ عملی طور پر مقدار میں برابری کے ذریعہ ہو، اندازہ اور تخمین کے ذریعہ برابری کافی نہیں ہے۔

غرض یہ کہ قرضوں کی ادائیگی میں دو باتوں کا لحاظ ضروری ہے، ایک یہ کہ وہ مقدار میں برابر ہو، دوسری یہ کہ وہ برابری یقینی ہو، اندازہ اور تخمین کافی نہیں، اور قرضوں کو قیمتوں کے اشاریہ سے منسلک کرنے میں دونوں باتوں کا لحاظ نہیں ہوتا، دونوں کے خلاف ہوتا ہے؛ چنانچہ قرضوں کو قیمتوں کے اشاریہ سے منسلک کرنے کا مطلب ومقصد یہ ہے کہ قرض دار قرض خواہ کو مقدار میں قرض کے برابر روپیہ ادا نہ کرے، بلکہ قیمتوں کے اشاریہ میں اشیاء کی قیمتوں میں جس تناسب سے اضافہ ہوا ہے اسی تناسب سے قرض میں اضافہ کرکے واپس کرے، گویا کہ قیمت اور مالیت کا اعتبار کرکے قرض ادا کرے جب کہ اوپر احادیث کی روشنی میں یہ جائز نہیں۔ نیز محققین نے لکھا ہے کہ اشاریہ کے لئے جو حسابی طریقہ اپنایا جاتا ہے جس کے ذریعہ کرنسی کی حقیقی قیمت کی تعیین ہوتی ہے وہ طریقہ در اصل اٹکل، اندازہ اور تخمین پر مبنی ہوتا ہے، اور اگر کسی جگہ پر یہ حساب باریک بینی اور پوری احتیاط سے بھی کیا جائے تو بھی اس کے نتیجہ کو زیادہ سے زیادہ تقریبی تو کہہ سکتے ہیں، یقینی اور واقعی تو پھر بھی نہیں کہہ سکتے؛ جب کہ اوپر واضح ہو چکا ہے کہ قرضوں کی واپسی میں اٹکل اور اندازہ کافی نہیں ہے۔

پس جب اشاریہ سے مربوط کرنے میں نہ مقدار کے اعتبار سے مثلیت کا لحاظ ہوتا ہے اور نہ ہی مثلیت یقینی ہوتی ہے بلکہ ایک تخمینہ ہوتا ہے جس کا انضباط بھی مشکل ہے اور ادا قرض

کے لئے دونوں باتوں کا ہونا ضروری ہے تو پھر ظاہر ہے کہ قرضوں کو اشاریہ سے وابستہ کرنا جائز نہ ہوگا۔ دیون کو اتنی ہی مقدار میں دینا ضروری ہوگا جتنی مقدار میں وہ ذمہ میں واجب ہوا تھا۔ اور جب کرنسی اور نوٹ کو اصطلاحی ثمن مان لیا گیا ہے جیسا کہ اکیڈمی کا بھی فیصلہ ہے تو دیون مؤخرہ میں ادائیگی کے وقت مالیت کے تناسب سے اضافہ غلط ہونا واضح ہے، اس سے فساد کا ہونا، ربا کا دروازہ کھلنا غالب اور یقینی ہے جو سد ذرائع کے اصول کے پیش نظر ممنوع ہے۔ اور یہ بھی واضح ہے کہ اشاریہ کی ترتیب کے لئے کوئی معیار مرتب کرنا آسان نہیں ہے، ملکوں، شہروں اور طبقوں کا اشاریہ ایک دوسرے سے مختلف ہوسکتا ہے، بلکہ ہر فرد کا اشاریہ دوسرے سے مختلف ہوسکتا ہے، اس لئے جہاں ادائیگیوں میں انضباط مشکل یا غیر ممکن ہے وہیں یہ چیز باہمی تنازعہ کا موجب بھی بن سکتی ہے۔

خلاصۂ کلام:

یہ ہے کہ مذکورہ بالا توضیحات کے پیش نظر دیون کو اشیاء کی قیمتوں کے اشاریہ سے مربوط کرنا درست نہیں ہے۔ حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب نے اس سلسلہ میں مفصل گفتگو کرتے ہوئے بعض سمیناروں کا اتفاق بھی اس بارے میں نقل کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''جب یہ مسئلہ پاکستان کی ''اسلامی نظریاتی کونسل'' کے سامنے بھی پیش ہوا تو کونسل کے تمام ارکان بشمول علماء و معاشیین سب نے اس بات پر اتفاق کیا کہ ''قرضوں کا قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ ربط'' کے نظریہ کی شریعت اسلامیہ میں کوئی گنجائش اور وجہ جواز نہیں ہے'' (فقہی مقالات ۱/۴۷)۔

آگے لکھتے ہیں:

''اسی طرح خاص اسی موضوع پر ہونے والے سمینار میں بھی بحث کی گئی جس کو اسلامی ترقیاتی بنک، جدہ، اور عالمی ادارہ برائے اسلامی اقتصادیات، اسلام آباد نے مشترک طور پر

شعبان ۱۴۰۷ھ میں منعقد کیا تھا، اس سیمینار میں مختلف ممالک کے بہت سے علماء اور ماہرین معاشیات نے شرکت کی تھی، وہ قرارداد جس پر تمام شرکاء نے اتفاق رائے ظاہر کیا وہ مندرجہ ذیل ہے:

۱- کرنسی نوٹ تمام معاملات (مثلاً اس میں سود جاری ہونے اور زکوۃ واجب ہونے، بیع سلم، مضاربت اور شرکت وغیرہ کے رأس المال بننے) میں نقدین یعنی دراہم اور دنانیر کی طرح ہیں اور امام ابو یوسف کا یہ قول کہ اگر سکوں کی قیمت زیادہ ہوجائے یا کم ہوجائے تو اس صورت میں قرض کی واپسی میں ادائیگی کے وقت نقدین کے تناسب سے سکوں کی قیمت واپس کرنا ضروری ہے، ان کا یہ قول کرنسی نوٹوں میں جاری نہیں ہوگا، اس لئے کہ یہ کرنسی نوٹ نقدین کے قائم مقام ہے، اور ان نقدین کی قیمت بڑھنے اور کم ہونے کا معتبر نہ ہونا متفق علیہ ہے۔

۲- سیمینار میں حاضر تمام علماء نے اس بات کی توثیق کی کہ سود اور قرض کی احادیث میں جو مثلیت اور برابری ضروری قرار دی گئی ہے وہ شرعی جنس اور قدر یعنی وزن، ناپ اور عدد میں برابری مراد ہے، قیمت میں برابری مراد نہیں، اور یہ بات ان احادیث کے ذریعہ پوری طرح واضح ہوجاتی ہے جو احادیث اموال ربویہ کے تبادلہ کے وقت عمدہ اور گھٹیا ہونے کے وصف کو غیر معتبر قرار دیتی ہے اور اسی پر امت کا اجماع ہے اور اسی پر عمل جاری ہے۔

۳- ذمہ میں ثابت شدہ دیون چاہے وہ کسی بھی قسم کے ہوں، ان کو قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ منسلک کردینا جائز نہیں؛ بایں طور کہ عاقدین عقد بیع یا عقد قرض کے وقت اس کرنسی کو جس کے ذریعہ عقد بیع یا عقد قرض کررہے ہیں، کسی سامان کے ساتھ منسلک کرکے یہ شرط ٹھہرائیں کہ مدیون ادائیگی کے وقت اس سامان کی قیمت موجودہ کرنسی میں ادا کرے گا'' (فقہی مقالات ۱/ ۷۲-۷۳)۔

انٹرنیشنل اسلامک فقہ اکیڈمی جدہ کا فیصلہ بھی یہی ہے، لکھا ہے:

''کسی بھی کرنسی کے ذریعہ واجب دیون کی ادائیگی میں مثل کا اعتبار ہوگا، قیمت کا نہیں؛ کیوں کہ دیون کی ادائیگی اپنے مثل میں ہوتی ہے۔ لہذا ذمہ میں واجب دیون کو خواہ کسی طرح بھی واجب ہوئے ہوں قیمتوں کے اشاریہ (price index) سے مربوط کرنا جائز نہیں ہے'' (جدہ کے فیصلے، ۱۵۷)۔

دوبارہ اس مسئلہ پر غور کرنے کے بعد بھی یہی فیصلہ کیا گیا، چنانچہ آگے لکھا ہے:

''کسی بھی کرنسی سے لازم ہونے والے قرض کی ادائیگی میں مثل کا اعتبار ہوگا، قیمت کا نہیں؛ کیوں کہ قرض کی ادائیگی اپنے مثل سے ہی ہوتی ہے، لہذا جائز نہیں ہوگا کہ ذمہ میں ثابت شدہ قرضوں کو چاہے جیسے ہوں نرخ کے معیار سے مربوط کیا جائے'' (جدہ اکیڈمی کے فیصلے، ۳۴۴)۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے لکھا ہے:

''اشیاء صرف کی قیمتوں کے اشاریہ سے نوٹ کو وابستہ کرنے میں ایک تو بڑی دقت ہے، دوسرے یہ اشاریہ محض تخمین پر مبنی ہوگا اور مختلف اشیاء کی قیمتوں کے اوسط سے اشاریہ مرتب کرنا پڑے گا، حالاں کہ افراد و اشخاص کی نسبت سے ان اشیاء صرف کے تناسب اور ان کی ضرورت میں فرق واقع ہوتا رہتا ہے'' (جدید فقہی مسائل ۴/۴۲)۔

مولانا عتیق احمد بستوی قاسمی صاحب لکھتے ہیں:

''اولاً تو اس لئے کہ اشاریہ دقیق فنی اصولوں پر مبنی ہوتا ہے، لہذا اس پر احکام شرعیہ کا دائر کرنا شریعت اسلامیہ کے مزاج کے خلاف معلوم ہوتا ہے، ثانیاً اس لئے کہ اشاریہ کی ترتیب کے لئے کوئی معیار مرتب کرنا انتہائی دشوار کام ہے، ملکوں، شہروں اور طبقوں کا اشاریہ ایک دوسرے سے مختلف ہوسکتا ہے، بلکہ ہر فرد کا اشاریہ دوسرے سے مختلف ہوسکتا ہے، اس لئے اشاریہ کو بنیاد بنانے میں احکام منضبط نہیں ہوسکیں گے'' (از جدید فقہی تحقیقات: کرنسی نوٹ ۴/۶۹)۔

۲- واجب الادا قرضوں کی سونے یا چاندی کی قیمت کے مساوی نوٹوں کے ذریعہ ادائیگی:

اس کی دو صورتیں ہیں:

الف- ایک: یہ کہ مہر کے تقرر کے وقت یا ادھار فروختگی کے وقت نوٹوں کی مالیت سونے چاندی میں معلوم کر کے عقد اصلاً سونے یا چاندی کے عوض ہو اور پھر بوقت ادائیگی اسی قدر سونا یا چاندی یا اس کی قیمت کے مساوی نوٹ کی ادائیگی ہو، یہ صورت جائز معلوم ہوتی ہے (واللہ اعلم) لیکن قرض لینے کی صورت میں قرض کی واپسی اسی شئی سے ہو جس میں قرض لیا گیا ہے، اس لئے کہ مقروض کہ ذمہ وہی لازم ہوتا ہے جس پر عملاً اس نے قبضہ کیا تھا۔

مگر اس میں خاص کر چھوٹی رقم کے معاملات میں نوٹوں کی مالیت سونے چاندی یا کسی دوسری چیز میں طے کرنا اور معلوم کرنا آسان نہیں، دشوار کام ہے، البتہ ایسے علاقوں میں یہ دشواری نہیں ہے جہاں ملکی کرنسی کے علاوہ کوئی اور زیادہ مضبوط کرنسی کا رواج ہے، مثلاً براعظم افریقہ کے بعض علاقے: زمبابوے، زامبیا وغیرہ، وہاں کی اصل کرنسی کوچا (kowcha) ہے، اس کے علاوہ ڈالر کا بھی وہاں رواج ہے، وہاں اگر یہ کیا جائے کہ کوچا کی مالیت کے برابر ڈالر میں عقد ہو اور پھر بوقت ادائیگی اسی قدر ڈالر کے مساوی کوچا کی ادائیگی ہو، چاہے وہ عقد کے دن کے کوچا کی مقدار کی بہ نسبت کم ہو یا زیادہ، تو یہ درست ہونا چاہئے، اور اس میں کوئی دشواری بھی نہیں ہے۔ جب کہ ہمارے یہاں اس طرح دوسری کرنسی سے یا سونا چاندی سے کرنے میں دشواری پوشیدہ نہیں ہے۔

ب- دوسری صورت یہ ہے کہ عقد اصلاً نوٹ کے عوض ہو، اسی کو ثمن بنایا جائے، اور پھر نوٹ کی مالیت سونے چاندی میں طے کر کے بوقت ادائیگی اسی قدر سونے چاندی کی قیمت کے مساوی نوٹوں کی ادائیگی ہو، یہ صورت درست معلوم نہیں ہوتی، سود کا چور دروازہ معلوم ہوتی ہے، اور پھر معمولی رقم کی مالیت سونے چاندی میں طے کی جائے اس کا دشوار ہونا بھی ظاہر ہے،

نیز جب نوٹ ثمن عرفی ہے، اس کو اصطلاحی ثمن مان لیا گیا ہے، عملاً ثمنیت میں اس کو وہی پوزیشن حاصل ہوچکی ہے جو کسی زمانہ میں سونے چاندی کی کرنسیوں کی تھی، اس لئے کمی بیشی کیسے درست ہوسکتی ہے؟

انٹرنیشنل اسلامک فقہ اکیڈمی جدہ کے فیصلوں میں ہے:

''شرعاً یہ معاملہ جائز نہیں ہوگا کہ عقد کرتے وقت ادھار قرضوں کو مندرجہ ذیل اشیاء میں سے کسی شئی سے مربوط کیا جائے:

الف-حسابی کرنسی سے مربوط کرنا۔

ب-اخراجات معیشت کے اشاریہ یا دوسرے اشاریوں سے مربوط کرنا۔

ج-سونے چاندی سے مربوط کرنا۔

د-کسی متعین سامان کی قیمت سے مربوط کرنا۔

ھ-قومی پیداوار کے اوسط سے مربوط کرنا۔

و-کسی دوسری کرنسی سے مربوط کرنا۔

ز-شرح سود سے مربوط کرنا۔

ح-مختلف اشیاء کے مجموعہ کی اوسط قیمت سے مربوط کرنا۔

اس لئے کہ ایسے ربط میں بہت زیادہ غرر اور جہالت فاحشہ ہے؛ کیوں کہ کسی فریق کو یہ نہیں معلوم کہ اسے کیا ملے گا یا اس پر کیا ذمہ آئیگا، جس کے نتیجہ میں عقد کی صحت کے لئے مطلوب شرط یعنی معلوم ہونا فوت ہوجائے گا، اور اگر یہ اشیاء، جن سے قرض کو مربوط کیا جائے گا اوپر کو چڑھیں تو اس سے جو اصلاً ذمہ میں واجب ہے اور جسے ادا کرنا ہے دونوں میں عدم تماثل لازم آجائے گا اور یہ معاہدہ میں مشروط ہونے کی وجہ سے ربا ہوجائے گا'' (جدہ کے شرعی فیصلے / ۳۴۵-۳۴۶)۔

مذکورہ بالا مسائل میں امام ابو یوسفؒ کے قول سے استدلال محل نظر ہے، علامہ شامی نے لکھا ہے: "وفی المنتقی: إذا غلت الفلوس قبل القبض أو رخصت قال أبو یوسف: قولی وقول أبی حنیفة فی ذلک سواء ولیس له غیرها ثم رجع أبویوسف وقال: علیه قیمتها من الدراهم یوم وقع البیع ویوم وقع القبض" (تنبیہ الرقود علی مسائل النقود، رسائل ابن عابدین ۲/ ۵۵)۔

وجہ نظر یہ ہے کہ امام ابو یوسفؒ کا مذکورہ بالا قول ایسے فلوس کے بارے میں ہے جس کا کسی دوسرے ثمن کے ساتھ دائمی ربط اور تعلق ہو کہ وہ فلوس اس ثمن کے لئے بطور اجزاء اور ریزگاری کے استعمال ہوتے ہوں، جیسا کہ علامہ شامی کی ایک عبارت سے واضح ہوتا ہے، لکھا ہے: "ویدل علیه أیضا تعبیرهم بالغلاء والرخص فإنه إنما یظهر إذا کانت غالبة الغش تقوم بغیرها" (تنبیہ الرقود، رسائل ابن عابدین ۲/ ۶۰)، اس عبارت میں "تقوم بغیرها" کے الفاظ سے واضح ہوتا ہے کہ وہ فلوس کے سکے اور غالب الغش دراہم دوسرے یعنی سونے چاندی کی کرنسی سے وابستہ تھے اور سونے چاندی کی بنیاد پر ہی ان کی قیمت مقرر ہوتی تھی اور یہ سکے سونے چاندی کی کرنسی کے لئے بطور ریزگاری اور چینج کے استعمال ہوتے تھے۔ لیکن جہاں تک موجودہ کرنسی نوٹوں کا تعلق ہے ان کا کسی دوسرے ثمن کے ساتھ ربط اور تعلق نہیں ہے اور نہ وہ کرنسی کسی ثمن کے لئے بطور ریزگاری اور اجزاء کے استعمال ہوتی ہے، بلکہ وہ خود مستقل اصطلاحی ثمن ہے۔ اس کے علاوہ فلوس کی صحیح قیمت معلوم کرنا امام ابو یوسف کے قول کے مطابق ممکن ہے؛ اس لئے کہ فلوس ثمن کے ایک معین معیار یعنی درہم کے ساتھ مربوط ہیں، بخلاف موجودہ کرنسی نوٹوں کے کہ موجودہ معاشی اصطلاح کے لحاظ سے ان کی حقیقی قیمت ٹھیک ٹھیک معلوم کرنا ممکن نہیں، بلکہ حقیقی قیمت اندازہ اور تخمینہ کی بنیاد پر فرض کی جائے گی، اس لئے موجودہ کرنسی نوٹوں کو فلوس پر قیاس کرنا درست نہیں ہے۔ اور امام ابو یوسفؒ کے قول سے استدلال بھی صحیح نہیں ہے۔

اسلامی ترقیاتی بنک، جدہ اور عالمی ادارہ برائے اسلامی اقتصادیات، اسلام آباد کے تحت منعقد ہونے والے سمینار کی قراردادوں میں ہے:

”کرنسی نوٹ تمام معاملات (مثلاً اس میں سود جاری ہونے اور زکوۃ واجب ہونے، بیع مسلم اور مضاربت اور شرکت وغیرہ کے رأس المال بننے) میں نقدین یعنی دراہم ودنانیر کی طرح ہیں اور امام ابو یوسفؒ کا یہ قول کہ اگر سکوں کی قیمت زیادہ ہوجائے یا کم ہوجائے تو اس صورت میں قرض کی واپسی میں ادائیگی کے وقت نقدین کے تناسب سے سکوں کی قیمت اور ان نقدین کی قیمت بڑھنے اور کم ہونے کا معتبر نہ ہونا متفق علیہ ہے“ (فقہی مقالات ۱/ ۴۷)۔

موجودہ کرنسی نوٹ کی شرعی حیثیت

مفتی محمد خالد حسین نیموی قاسمی ☆

پہلے زمانے میں زرمبادلہ کے طور پر سونے اور چاندی کے سکوں کا رواج تھا اور ''ثمن حقیقی'' یا ''ثمن خلقی'' کے طور پہ سونے کے سکے ''دینار'' اور چاندی کے سکے ''درہم'' اپنا کردار بخوبی ادا کر رہے تھے۔ اس کے لئے نہ تو کسی قانونی سند کی ضرورت تھی نہ کسی کے اعتبار کی۔ عہد رسالت میں انہی سکوں کا رواج تھا۔ بعد کی صدیوں میں سونے اور چاندی کے سکوں کی جگہ پیتل، تانبا، رانگے، لوہے اور دوسرے دھاتوں کے سکے نے لے لی۔ علماء وفقہاء نے اس صورت حال میں یہ غور کیا، احکام بدلے اور دھات کے ان سکوں کو ''خلقی ثمن'' کا درجہ تو نہیں مل سکا البتہ انہیں ''ثمن رواجی'' کی حیثیت حاصل ہوئی، یہاں تک کہ آہستہ آہستہ ان سکوں کا چلن بھی ختم ہوگیا اور ان کی جگہ کاغذی نوٹوں نے لے لی۔ یہ کرنسی نوٹ کاغذ کا محض ایک ٹکڑا ہوتے ہیں۔ ان کی بذات خود کوئی خاص قیمت نہیں ہوتی لیکن ملک کے ریزرو بینک کی طرف سے روپے کی ادائیگی کی یقین دہانی اور سونے کے ساتھ اس کا مربوط ہونا کرنسی نوٹ کو قانونی اعتبار بخشتا ہے اور اسے لوگوں کا اعتماد حاصل ہوتا ہے۔ بلاشبہ ابتدائی مراحل میں کاغذی نوٹوں کی حیثیت محض سند اور وثیقہ کی تھی، لیکن زمانہ دراز سے کاغذی نوٹ ''مستقل ثمن'' کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ پوری دنیا میں باہمی لین دین کاغذی نوٹوں کے ذریعہ ہی انجام پاتے ہیں۔ ۱۹۷۰ء تک اس بات کی پابندی کی

☆ معتمد جامعہ رشیدیہ جامع مسجد، بیگوسرائے (بہار)۔

جاتی تھی کہ کرنسی نوٹ اتنے ہی جاری کئے جائیں جتنی مالیت کا سونا ملک کے خزانہ میں موجود ہو۔ لیکن ۱۹۷۱ء کے بعد عالمی طور پر یہ التزام بھی ختم ہوگیا۔ اب نوٹ کی جو بھی قیمت ہے وہ محض اس کے قانونی استناد اور عوامی اعتماد کی وجہ سے ہے۔ اس کے ذریعہ تعامل وتبادلہ کرتے وقت یہ خیال بھی نہیں آتا کہ اس کا تعلق سونے یا چاندی سے بھی ہے۔ اسی طرح یہ تصور بھی نہیں ہوتا کہ یہ نوٹ محض ایک وثیقہ اور سند ہے، جس کی ادائیگی بینک کے ذمہ ہے۔ جب کہ اس کی جگہ پر دوسرے وثیقہ جاتی کاغذات مثلاً چیک، ڈرافٹ، پے آرڈر میں آج بھی لوگوں کی نظر میں ان کے وثیقہ اور سند ہونے کی حیثیت برقرار ہے۔ لہذا موجودہ عالمی صورت حال اور بین الاقوامی قوانین کے پیش نظر اس امر میں کسی تردد اور شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی ہے کہ موجودہ کرنسی نوٹ شرعی نقطۂ نظر سے ''ثمن قانونی'' اور ''زر اصطلاحی'' کا درجہ رکھتے ہیں۔ البتہ یہ مکمل طور پر ''ثمن خلقی'' یعنی سونا اور چاندی کی طرح نہیں ہیں۔ ان میں دو طرح کی مشابہتیں پائی جاتی ہیں۔ (۱) سونے اور چاندی کے ساتھ۔ (۲) فلوس اور دھات سے بنے سکوں کے ساتھ۔ پہلی مشابہت کی وجہ سے نوٹوں پر ربا کے احکام جاری ہوں گے، ہر ملک کی کرنسی علاحدہ جنس ہوگی۔ لہذا ایک ملک کی کرنسی کی بیع اسی ملک کی کرنسی سے کمی وبیشی کے ساتھ نہ تو نقد جائز ہوگی نہ ادھار۔ دوسری مشابہت کی وجہ سے بیع صرف کے تمام احکام مثلاً تقابض وغیرہ جاری نہیں ہوں گے۔

مؤخر مطالبوں میں ادائیگی کا معیار کیا ہو؟

جب سونا اور چاندی سے تعامل کا رواج تھا، تو اس وقت وصف خاص ''ثمن خلقی'' ہونے کی وجہ سے یہ دونوں چیزیں محض ذریعہ تبادلہ نہیں بلکہ ایک حد تک اشیاء کی قدر وقیمت کی حفاظت اور دیون (مؤخر مطالبات) مثلاً قرض، مہر، پینشن، بقایہ جات وغیرہ کی ادائیگی کا معیار بھی تھیں۔ بالفرض اگر سونے چاندی کے سکے کی قانونی حیثیت ختم ہوجائے پھر بھی وہ سکے اپنی قدر وقیمت برقرار رکھتے ہیں، لیکن کاغذی نوٹوں کی اپنی ذاتی کوئی قیمت نہیں ہوتی اور عالمی منڈی

میں افراط زر(INFLATION) کی صورت میں تیزی سے ان کی قیمت گر جاتی ہے، جس سے مؤخر مطالبوں کے مستحقین کا زبردست مالی نقصان ہوتا ہے۔ ایسے حالات میں صاحب حق کو خسارہ سے کیسے بچایا جائے اور اسے حق تلفی سے کیسے محفوظ رکھا جائے۔ اسلام کے عدل کا تقاضہ ہے کہ مقاصد شریعت کی روشنی میں اس کا حل پیش کیا جائے۔ افراط کی صورت میں چاہے روپے کی قیمت گرے یا اشیاء کی گرانی بڑھے نقصان بہرحال صاحب حق کا ہے۔

عدد اشاریہ معیار نہیں بن سکتا:

اس نقصان کے تدارک کے لئے بعض دانشوروں نے یہ رائے دی ہے کہ کرنسی نوٹ میں قدر وقیمت کے تعین کے لئے ماہرین اقتصادیات کے مقرر کردہ عدد اشاریہ کو پیمانہ بنایا جائے۔ اور قرض دیتے وقت اور واپسی کے وقت روپے کی قدر میں جو فرق ہو اس کی تکمیل قرض لینے والے کے ذمہ کیا جائے۔ لیکن سچائی یہ ہے کہ عدد اشاریہ کو ادائیگی کا پیمانہ بنانا عملی طور پر ممکن نہیں ہے۔ اس لئے کہ اشاریہ دقیق فنی اصولوں پر مبنی ہوتا ہے، خود ماہرین اقتصادیات کی نظر میں بھی اس کی مکمل عملی تطبیق ممکن نہیں ہے۔ ماہر اقتصادیات بین ہورم اور ایچ لیوی کی رائے ہے کہ: ''عدد اشاریہ کا استعمال جملہ مالیاتی امور میں مکمل طریقے پر نا قابل عمل ہے'' (بحوالہ بحوث فی قضایا فقہیہ معاصرہ ۱۹۰ از مفتی تقی عثمانی)۔

اسی وجہ سے اب تک عالمی طور پر کسی بھی ملک میں مالیاتی امور کو مکمل طور پر عدد اشاریہ سے مربوط نہیں کیا جا سکا ہے۔ خاص طور پر بینک میں جو رقم رکھی جاتی ہے مدتوں بعد آج بھی اتنی ہی رقم کی واپسی ہوتی ہے، سودی نظام کی وجہ سے صرف اس رقم کی سود میں اضافہ ہوتا ہے، شریعت اسلامیہ میں عامۃ الناس کے لئے ایسے امور کو ناپسندیدہ قرار دیا ہے جس کی بنیاد دقیق اصول اور ظن وتخمین ہو، چنانچہ چاند کے ثبوت کے مسئلے کو فلکیات کے دقیق اصول پر مبنی نہیں قرار دیا گیا بلکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "إنا أمة أمية لا نكتب و لا نحسب و نعد الشهر

ھکذا و ھکذا و ھکذا"، اسی طرح رسول کریم ﷺ نے بیع مزابنہ سے منع فرمایا ظن وتخمین پر مبنی ہونے کی وجہ سے۔خلاصہ یہ کہ اشاریہ کے ذریعہ واجبات کی ادائیگی کا تصور بالکل بنانا **قابل عمل** اور بے شمار نزاعات کا سبب ہے،ضروری نہیں کہ ہر وقت افراط زر کا منظر نامہ موجودرہے۔ بالفرض اگر تفریط زر(DEFLATION) کی صورت حال پیدا ہوگئی اور کرنسی نوٹ کی قیمت بڑھنے لگی اور اشیاء کی قیمتیں گھٹنے لگیں،تو کیا مؤثر مطالبات کی ادائیگی واجب الاداء روپیوں سے کم روپیوں کے ذریعہ کی جائے گی؟ کون شخص اس صورت حال کے لئے تیار ہوگا؟ دوسری پریشانی واجبات کی ادائیگی اشاریہ سے وابستہ کرنے میں یہ ہے کہ اشاریہ محض ظن اور تخمین پر مبنی ہوتا ہے اور مختلف افراد واشخاص کے اعتبار سے ان اشیائے صرف کے تناسب اور ان کی ضرورت میں فرق واقع ہوتا رہتا ہے۔الحاصل واجبات کو اشاریہ سے مربوط کرنے کا تخیل سراپا دردسر ہے، اور اس سے بے شمار جھگڑے پیدا ہوسکتے ہیں اور جھگڑے کا باعث بننے والے امور شریعت کی نگاہ میں پسندیدہ نہیں ہیں،سیکڑوں ایسے معاملات ہیں جو"مفضی الی النزاع" ہونے کی وجہ سے ناجائز قرار دیئے گئے ہیں۔

اس سے سود کا دروازہ کھلے گا:

اگر بالفرض واجبات اور مؤثر مطالبات کو اشاریہ سے مربوط کیا جاتا ہے تو سودخوروں اور سودی لین دین کرنے والوں کی چاندی ہوجائے گی۔ وہ بھی یہ کہہ کر سود لینا شروع کردیں گے کہ ہم یہ زائد رقم مدت اور وقت کے بدلے میں نہیں لیتے بلکہ اشیاء کی بڑھتی ہوئی گرانی اور روپے کی قدر میں کمی کی وجہ سے لے رہے ہیں۔اس طرح کی توجیہ بینکوں کو دیئے جانے والے سود بلکہ ہر سود میں کی جاسکتی ہے یا آزادانہ طور پر لوگ کرنے لگیں گے۔ اسی خطرے کو بھانپتے ہوئے گذشتہ زمانے کے فقہائے کرام نے کھوٹے سکوں کے تفاضل کو بھی جائز قرار نہیں دیا، علامہ مرغینانی فرماتے ہیں:

''ومشائخنا لم يفتوا بجواز ذلک فی العدالی والغطارفة لأنها أعز الأموال فی ديارنا فلو أبيح التفاضل فيه ينفتح باب الربوا'' (ھدایہ ۳/۹۳)۔

(ہمارے مشائخ نے عدالی اور غطارفہ اصطلاحی سکوں میں بھی تفاضل کے جواز کا فتویٰ نہیں دیا ہے، اس کے لئے ہمارے دیار میں یہ بیش قیمت مال شمار ہوتے ہیں، اگر تفاضل کو ان سکوں میں مباح کردیا گیا تو سود کا دروازہ کھل جائے گا)۔

اس کی تشریح کرتے ہوئے علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں:

''فإن الناس يعتادون التفاضل فی الأموال النفيسة فيندرجون إلى ذلک فی النقود الخالصة، فمنع ذلک حسما لمادة الفساد'' (فتح القدیر ۷/۱۴۵)۔

(لوگ اس وقت نفیس اموال میں تفاضل کے عادی ہوجائیں گے اور بتدریج خالص نقود میں بھی تفاضل تک پہنچ جائیں گے، اس لئے مادہ فساد کو ختم کرنے کے لئے اس سے روکا گیا)۔

حاصل یہ ہے کہ یہ اکابر بھی اس بات کو بھی ملحوظ رکھ رہے ہیں کہ خود یہ اگرچہ سودی معاملہ نہیں ہے لیکن یہ اس سود کی ترویج کا سبب بن سکتا ہے جس کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے: ''أحل الله البيع وحرم الربوا'' (سورہ بقرہ) اور جس کے حلال سمجھنے والوں کے لئے منجانب اللہ اعلان جنگ کیا گیا ہے: ''فأذنوا بحرب من الله ورسوله'' (البقرہ)۔ ربوا اور اس تفاضل میں اس طرح فرق کیا جاسکتا ہے کہ ''ربا'' مدت کی اجرت ہوتی ہے اور زیادتی پہلے سے متعین شدہ ہوتی ہے جو یہاں مفقود ہے۔ اس کے باوجود تفاضل کو ناجائز قرار دینا اس معاملہ کی سنگینی کو بتاتا ہے۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ دین میں جو مثلیت مطلوب ہے وہ مقدار اور کمیت میں مثلیت ہے قیمت اور مالیت میں نہیں، مثلاً اگر کسی شخص نے ایک کیلو دال اس وقت قرض لیا جب کہ اس کی قیمت بیس روپے فی کیلو تھی۔ واپسی کے وقت اگر دال کی قیمت پچاس روپے فی کیلو ہوجائے تو بھی واپسی ایک ہی کیلو کی ہوگی، قیمت کی کمی زیادتی ''ہدر'' اور بے کار ہوگی۔

ادھار معاملے میں سونے یا چاندی کا تعین:

سب سے بہتر شکل یہ ہے کہ ادھار معاملوں میں خود سونے یا چاندی کی ایک مقدار معین کی جائے۔ مثلاً مہر دین میں بہت سے علاقوں میں سونے یا چاندی کی ایک مقدار متعین کرنے کا ایک رواج ہے۔ حقوق نسواں کے تحفظ کے لئے یہ ایک بہترین قدم ہے۔ ضرورت ہے کہ اس رواج کو عام کیا جائے۔ اسی طرح دوسرے مطالبات میں بھی سونے یا چاندی کی مقدار متعین کی جائے تا کہ فریقین کے حقوق کا تحفظ ہو سکے۔ مہر دین میں تو یہ بات آسانی کے ساتھ چلے گی، لیکن قرض دیتے وقت یا ادھار فروختگی کے وقت کیا شکل اختیار کی جائے یہ محل بحث ہے۔ اس لئے کہ قرض کا مقصد اور فروختگی کا مقصد عام طور پر رقم کا حصول ہوتا ہے اور ہر شخص کے پاس سونا اور چاندی کی مطلوبہ مقدار موجود ہو کوئی ضروری نہیں۔ اور بازار سے پہلے سونا اور چاندی خریدا ہو جائے پھر قرض لینے والا اپنی ضرورت کے لئے فروخت کرے اس میں طول عمل ہے جو قرض جیسے کار خیر کے بند ہونے کا سبب ہو سکتا ہے۔ اس کا حل یہ ہے کہ مؤثر مطالبات میں معاملہ طے کرتے وقت فریقین یہ بات باہم طے کریں کہ موجودہ وقت میں طے کردہ نوٹوں کی سونے یا چاندی کے اعتبار سے جو مالیت ہے اسی قدر سونے یا چاندی کی قیمت کے مساوی نوٹوں کی ادائیگی وقت مقرر پر کی جائے گی۔ اس حل کی تائید فی الجملہ امام ابو یوسفؒ کے اس قول سے ہوتی ہے جسے علامہ ابن عابدینؒ نے اپنے رسالہ ''تنبیہ الرقود علی مسائل النقود'' میں نقل کیا ہے:

''وفی البزازية معزيا إلى المنتقى غلت الفلوس أو رخصت فعند الإمام والثانی أولا ليس عليه غيرها وقال الثانی ثانيا عليه قيمتها من الدراهم يوم البيع والقبض وعليه الفتوى فحيث صرح بأن الفتوى عليه فی كثير من المعتبرات فيجب أن يعول عليه افتاءً وقضاءً'' (۲/ ۶۰ مطبوعہ دیوبند)۔

(منتقی کے حوالہ سے بزازیہ میں ہے کہ فلوس مہنگے ہو گئے ہوں یا سستے دونوں صورتوں

میں امام اعظمؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک ان کے پہلے قول میں فلوس ہی ذمہ میں واجب ہوں گے؛ لیکن امام ابو یوسفؒ کے قول ثانی میں فلوس کی قیمت دراہم میں واجب ہوگی۔ قیمت کا اعتبار بیع کے دن یا قرض لینے کی صورت میں فلوس پر قبضہ کے دن ہوگا۔ اسی قول پر فتوی ہے۔ صاحب بحر نے صراحت کی ہے کہ بہت سی کتب معتبرہ میں اسی پر فتوی ہے۔ اسی لئے فتوی یا قضا میں اسی پر اعتماد کیا جائے)۔

حالانکہ اس قول کی دوسری توجیہات بھی کی گئی ہیں (دیکھئے بحوث فی قضایا فقہیہ) لیکن بہر حال مذکورہ صورت کی گنجائش بھی نکلتی ہے، اس کے علاوہ اس کی تائید دارالعلوم دیوبند کے سابق مفتی اعظم حضرت الاستاذ مفتی نظام الدین صاحبؒ کے مندرجہ ذیل فتوی سے بھی ہوتی ہیں جو انہوں نے قرض کی رقم کے ڈی ویلویشن کے سوال پر لکھا ہے کہ: "اس قرض میں لئے ہوئے نوٹوں کی قرض لینے کے زمانے میں جتنی چاندی ملتی یا جتنا سونا ملتا اتنی چاندی میں یا اتنے سونے میں جتنے نوٹ آج بوقت ادائیں اتنے ہی نوٹ دینے ہوں گے۔ پس نقدین میں سے جو زیادہ رائج ہوگا اس کا اعتبار ہوگا اور نوٹ اس کے تابع ہوں گے" (نظام الفتاوی ۱/۲ ۳۳)۔ یہ تفصیلات اس وقت ہوں گی جب قرض دیتے وقت یا معاملہ کرتے وقت رقم کی مالیت آئندہ اندیشہ کے پیش نظر سونے یا چاندی میں طے کرلے ورنہ نہیں۔ اس لئے کہ صاحب دین کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے حق کو کلی یا جزوی طور پر معاف کردے یا کم کردے۔

خلاصۂ بحث:

۱-موجودہ کرنسی نوٹ "ثمن عرفی" یا "ثمن قانونی" کا درجہ رکھتا ہے۔

۲-اس کی حیثیت ابتدائی مراحل میں سند اور وثیقہ کی تھی۔ لیکن اب یہ محض وثیقہ نہیں ہے۔

۳-ہر ملک کی کرنسی الگ الگ جنس ہے اور ایک ملک کی کرنسی ایک ہی جنس ہے۔ اس میں تفاضل کی صورت میں "ربا" کے احکام جاری ہوں گے۔ البتہ بیع صرف کے دیگر احکام مثلاً

تقابض وغیرہ جاری نہ ہوں گے۔

۴-مؤخر مطالبات کو اشاریہ سے وابستہ کرنا شرعی طور پر درست نہیں ہے۔اس لئے کہ وہ بے شمار نزاعات کا باعث ہے اور اس کی بنیاد ظن وتخمین پر ہے۔

۵-مؤخر مطالبات کو اشاریہ سے وابستہ کرنا بلاشبہ سود کے دروازے کو کھولنا ہوگا۔

۶-مہر دین میں خود سونے اور چاندی کی ایک مقدار مقرر کی جائے اور ادائیگی کے وقت بازار میں جو نرخ ہو اس کے بقدر رقم وصول کی جائے۔

۷-قرض اور ادھار لین دین کے وقت واجب الاداء نوٹ کی مالیت سونے یا چاندی میں طے کر کے ادائیگی کے وقت اسی کے مساوی رقم ادا کرنے کی گنجائش مقاصد شریعت اور عدل اسلامی کے پیش نظر نکل سکتی ہے۔واللہ اعلم۔

مؤخر مطالبات کی ادائیگی بذریعہ کرنسی

مولانا خورشید احمد اعظمی ☆

موجودہ کرنسی (کاغذی نوٹ) کا استعمال ،عصر حاضر میں کثرت وعموم کے ساتھ، کسی تردد اور پس وپیش کے بغیر رائج ہے، خرید وفروخت اور دیگر لین دین کے معاملات میں اسی کا تعامل ہے، اسی کے ذریعہ اشیاء کے نرخ اور قیمتیں مقرر کی جاتی ہیں، اور بطور پونجی وسرمایہ اسی کا ادخار بھی کیا جاتا ہے؛ اس لئے یہ کاغذی نوٹ، اگرچہ فی نفسہ اپنی کوئی خاص قیمت نہیں رکھتے، مگر ان کو قانونی حیثیت اور حکومت کا اعتماد حاصل ہے، نیز عوام ان کے قبول کرنے پر مجبور ہیں۔ نہ قبول کرنے کی صورت میں قانونی مجرم سمجھے جاتے ہیں، اور عوام نے بلا خوف وخطر انہیں قبول کر بھی لیا ہے؛ اس لئے ان کاغذی نوٹوں کو قانوناً اور عرفاً ثمن کی حیثیت حاصل ہے۔ اگرچہ ماضی میں بھی نیز عصر حاضر میں بھی بعض علماء اور اہل فتاوی ان کاغذی نوٹوں کے سند وحوالہ ہونے کا ہی رجحان رکھتے ہیں۔ مگر راجیز کا رجحان ثمنیت کی طرف ہے، متبحر عالم وفقیہ مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ نے بھی ان کاغذی نوٹوں کو ثمن قرار دیا ہے۔

"وبالجملة صارت هذه الأوراق اليوم كالنقود، ويطلق عليه اسم النقد والعملة في العربية والانكليزية والاردية......... ولا يوجد اليوم أحد يطمع فيما وراء ها من ذهب أو فضة، لا لأنه لا يحتاج إليها بعد شيو ع التعامل

☆ رگھوناتھ پورہ مئو۔

به فحسب، بل لأن معظم الممالک الیوم تصدرها کالأثمان العرفیة ولا یکون وراءها شیئ من الذهب أو الفضة فالذی أری أن القول بثمنیة أصبح قویا" (تکملۃ فتح الملہم ۱/۵۱۹)۔

(خلاصہ کلام یہ کہ یہ کاغذات (نوٹ) آج کل سکوں کی طرح ہوگئے ہیں، اور عربی، انگریزی نیز اردو میں ان پر کرنسی اور سکہ کا اطلاق کیا جاتا ہے......اور آج کل کوئی بھی ان کی پشت پر سونے یا چاندی کی خواہش نہیں رکھتا، اس لئے نہیں کہ وہ صرف ان (کاغذی نوٹوں) کے تعامل کے بعد ان دونوں (سونے، چاندی) کا محتاج نہیں ہے؛ بلکہ اس لئے کہ آج تمام ممالک ان (کاغذی نوٹوں) کو ثمن عرفی کے طور پر جاری کرتے ہیں، اور ان کے پیچھے کوئی سونا چاندی نہیں ہوتا، اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ ان کے ثمن ہونے کا قول قوی ہوچکا ہے)۔

کاغذی نوٹوں کو بالمقابل سونے چاندی کے ان کے ثمن خلقی ہونے کے اعتبار سے دیکھا جائے، تو کہا جاسکتا ہے کہ ان (کاغذی نوٹوں) کی قیمت کم وبیش ہوتی ہے مگر دیگر عروض، اور سامان واجناس کے لحاظ سے یہ کہنا مشکل ہوجاتا ہے؛ کیوں کہ بہت سی اشیاء جن کے لئے کل زیادہ کرنسی ادا کرنی پڑتی تھی، آج وہ اس سے کم کرنسی میں دستیاب ہیں، جس طرح اکثر اشیاء کے لئے بہ نسبت ماضی کے آج زیادہ کرنسی ادا کرنی پڑتی ہے، نیز اشیاء کی شرح گرانی بھی مساوی نہیں ہے، اس لئے یہ کہنا زیادہ مناسب اور سہل ہے کہ اشیاء کی قیمت کم وبیش ہوتی ہے نہ کہ کرنسی کی، اور اس سلسلہ میں ایک روایت سے بھی مدد ملتی ہے، جس میں حضرت عمرؓ نے اونٹوں کے گراں ہونے کا اعتبار کیا ہے:

"کانت قیمة الدیة علی عهد رسول الله ﷺ ثمان مأة دینار أوثمانیة آلاف درهم، ودیة أهل الکتاب یومئذ النصف من دیة المسلمین، قال فکان ذلک کذلک حتی استخلف عمر رضی الله عنه، فقام خطیباً فقال: ألا إن

الإبل قد غلت، قال ففرضها عمر علی أهل الذهب ألف دينار، وعلی أهل الورق اثنی عشر ألفاً.............الخ" (سنن أبی داؤد ۴؍۱۸۴، حدیث نمبر: ۴۵۸۲)۔

(رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں دیت کی قیمت آٹھ سو دینار یا آٹھ ہزار درہم تھی، اور اہل کتاب کی دیت ان دنوں مسلمان کی دیت کے نصف تھی، اور یہ معاملہ ایسا ہی رہا یہاں تک حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے، پھر وہ تقریر کے لئے کھڑے ہوئے اور انہوں نے فرمایا: سنو! اونٹ گراں ہوگئے ہیں، چنانچہ حضرت عمرؓ نے اس کو سونے والوں پر ایک ہزار دینار اور چاندی والوں پر بارہ ہزار (درہم) مقرر کردیا)۔

نیز ایسا بھی نہیں ہے کہ سونے یا چاندی کی ایک متعینہ مقدار میں کل کسی سامان کو ہم جتنا خرید سکتے تھے، آج وہ سامان اسی مقدار میں اتنے ہی سونے یا چاندی میں فراہم ہوں، اور سونے چاندی کے لحاظ سے بھی اشیاء کی قیمتوں میں تفاوت بہ نسبت ماضی کے یکساں نہیں ہے، بعینہ یہی حال کاغذی نوٹوں کا بھی ہے، لہذا:

۱- کاغذی نوٹوں کی اپنی کوئی ذاتی قیمت نہ ہونے کے باوجود چوں کہ ان کی قانونی قیمت اور حیثیت مضبوط ہے، اور عوام کو اس کی قانونی حیثیت پر اعتماد ہے، اور انہوں نے اسے قبول بھی کیا ہے، اس لئے ان کاغذی نوٹوں پر ان کی مذکورہ قیمت کو مستقل مانا جائے، اور مؤخر مطالبات (قرض، مہر، پنشن، ادھار خریداری کی رقم اور وقت پر ادا نہ ہونے والی تنخواہوں کی ادائیگی) کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ نہ کیا جائے۔

- کیوں کہ عامۃ الناس کے درمیان ادائیگیوں کے لئے ایسا معیار مقرر کرنا جن کی بنیاد دقیق فنی اصولوں پر ہو، ان کے لئے زحمت وحرج، اور مستقل باہمی تنازع کا موجب ہوگا۔

- اور اگر مان بھی لیا جائے کہ کرنسی کی قیمت بھی کم وبیش ہوتی ہے، اور اس کی قیمت کا معیار، سونا، چاندی یا کوئی اور شئے ہے، جن کی قیمتیں روز ہی بلکہ صبح وشام بدلتی رہتی ہیں، اور

ادھار خرید وفروخت یا قرض واستقراض وغیرہ امور کثیر الوقوع ہیں، لہذا کسی بھی ایسے معاملہ میں جس کی ادائیگی مؤخر ہو، عقد معاملہ اور ادائیگی دونوں مواقع پر اس کی قیمت معلوم کرنے میں عوام تو کیا خواص کو بھی دقت اور تنگی پیش آئے گی، اور شریعت کا مزاج تیسیر کا ہے نہ کہ تعسیر کا۔

- نیز اس کاغذی نوٹ (کرنسی) کو سند وحوالہ قرار دیا جائے جو سونے یا چاندی کے ایک مخصوص وزن کی نمائندگی کرتے ہیں تو ظاہر ہے کہ ہر دور ہی میں وہ اس کے اسی مخصوص وزن کی نمائندگی کریں گے۔ مثلاً ایک ہزار کا نوٹ جس وقت صادر ہوگیا، اس وقت وہ جتنے سونے کی قیمت رکھتا ہے دس سال کے بعد بھی وہ اتنے ہی وزن سونے کی قیمت رکھے گا۔

- اور اگر اسے سند وحوالہ نہیں، بلکہ مستقل ثمن مانتے ہیں، تو جتنا ذمہ میں واجب ہوا ہے مؤخر ادائیگی کی صورت میں بھی اتنا ہی ادا کرنا ہوگا، اس لئے کہ دیون کی ادائیگی اس کے مثل سے ہی ہوتی ہے۔

"استقرض من الفلوس الرائجة والعدالى فكسدت، فعليه مثلها كاسدة ولا يغرم قيمتها وكذا كل ما يكال ويوزن، لما مر أنه مضمون بمثله، فلا عبرة بغلائه ورخصه" (درمختار مع شامی ۷/ ۳۹۰)۔

(رائج فلوس یا ایسے دراہم جن میں غش غالب ہے کو قرض میں لیا، پھر وہ بند ہو گئے، تو اس پر اسی کے مثل لازم ہوگا ان کے بند ہونے کے باوجود، اور وہ ان کی قیمت کا ضامن نہیں ہوگا، اور ایسے ہی ہر وہ شئے جو ناپی یا تولی جاتی ہے بہ سبب اس کے جو گزر چکا کہ وہ مضمون ہے اپنے مثل کا، لہذا اس کے سستے یا مہنگے ہونے کا اعتبار نہیں ہوگا)۔

اس میں صاحبین اور امام صاحب کا اختلاف ہے، مگر یہ اس صورت میں جب کہ وہ سکے بند ہو چکے ہوں، اور اگر وہ سکے رائج ہیں تو پھر اس کے دیون کی ادائیگی اس کے مثل سے ہی ہوگی، ان کے گراں یا ارزاں ہونے کا اعتبار نہیں ہوگا، علامہ شامیؒ اس کے تحت لکھتے ہیں:

"وإن استقرض دانق فلوس أو نصف درهم فلوس ثم رخصت أو غلت لم يكن عليه إلا مثل عدد الذی أخذه" (شامی ۷/ ۳۹۰)۔

(اور اگر درہم کا معمولی حصہ یا نصف درہم فلوس قرض لیا پھر وہ رخیص یا غالی ہوگئے، تو اس پر نہیں لازم ہوگا مگر اسی عدد کے مثل جو اس نے لیا ہے)۔

نیز آگے لکھتے ہیں:

"وفی الفتاوی الهندية: استقرض حنطة فأعطى مثلها بعد ما تغير سعرها يجبر المقرض على القبول" (شامی ۷/ ۳۹۰)۔

(اور فتاوی ہندیہ میں ہے کہ اگر گیہوں قرض میں لیا، اور اس کا ریٹ بدل جانے کے بعد اتنا ہی واپس کیا تو قرض دینے والا اس کے قبول کرنے پر مجبور کیا جائے گا)۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں:

"كنت أبيع الإبل بالبقيع، فأبيع بالدنانير، فآخذ مكانها الورق، وأبيع بالورق فآخذ مكانها الدنانير فأتيت رسول اللهﷺ، فوجدته خارجا من بيت حفصة، فسألته عن ذلك فقال: "لا بأس به بالقيمة" (سنن الترمذی ۳/ ۳۳۵، حدیث نمبر: ۱۲۴۲)۔

(میں بقیع کے مقام پر اونٹ بیچا کرتا تھا، تو میں دیناروں سے فروخت کرتا، اور ان کی جگہ چاندی یعنی دراہم لے لیتا، اور چاندی کے بدلہ فروخت کرتا اور ان کی جگہ دینار لے لیتا، پھر میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت آپ حضرت حفصہؓ کے مکان سے نکل رہے تھے، تو میں نے آپ سے اس طریقہ کار کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: قیمت کے اعتبار سے اس میں کوئی حرج نہیں)۔

اس روایت سے واضح ہوتا ہے کہ جس ثمن میں معاملہ ہوا ہے، اگر اس کے عوض سونا یا

چاندی لیا ہے تو ثمن کی قیمت کا اعتبار ہوگا یعنی اتنے ثمن میں جتنا سونا یا چاندی آئے گا وہی لیا جائے گا، سونے یا چاندی کے لحاظ سے اس کا تعین نہیں ہوگا لہذا اگر کوئی معاملہ نوٹوں (روپے) میں طے ہوا ہے، یا نوٹ کی شکل میں قرض دیا ہے اور ادیگی نوٹوں کی شکل میں چاہتا ہے تو اتنے ہی نوٹ واجب الادا ہوں گے، اور اگر ان کی ادائیگی سونے یا چاندی میں چاہتا ہے تو اتنے نوٹوں میں جتنے سونے یا چاندی آئیں گے اتنے ہی کا مستحق ہوگا۔ اس کے برعکس نہیں ہوگا کہ قرض دیتے وقت ان نوٹوں کی جتنی چاندی یا سونا آتا، ادائیگی کے وقت اتنی چاندی یا اتنے سونے کی مالیت برابر نوٹ لے، یہ درست نہیں ہوگا۔

اسی زیر بحث مسئلہ میں کہ کسی نے قرض دیا، چند سالوں بعد نوٹوں کی قیمت کم ہوگئی، اب اگر قرض لینے والا اتنے نوٹ واپس کرتا ہے تو یہ دائن پر ظلم معلوم ہوتا ہے، لہذا مہنگائی کے لحاظ سے روپے کی گنتی میں بھی اضافہ ہونا چاہئے۔ مفتی محمد تقی عثانی صاحب، مذکورہ حدیث کے تحت تقریر ترمذی ص ۱۵۰ میں فرماتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ''مندرجہ بالا تجویز شرعی اعتبار سے درست نہیں''۔ اس کی نقل دلیل یہ پیش کی ہے کہ شریعت کا اصول ہے کہ ''الديون تقضى بأمثالها'' کہ دیون کی ادائیگی انہی کے مثل سے ہوگی، اور شریعت کے تمام مسائل میں مماثلت فی المقدار ہوتی ہے نہ کہ مماثلت فی القیمہ۔

اور عقلی دلیل یہ پیش کی ہے کہ قرض دینے والا اگر مقروض کی امداد کرنا چاہتا ہے ''تو پھر یہ سوچ لے کہ یہ قرض دینا ایسا ہے جیسے کوئی شخص اپنے پیسے اٹھا کر صندوق یا الماری میں تالا لگا کر رکھ دے۔ اور پھر اس الماری یا صندوق میں رکھے ہوئے پیسوں پر پانچ سال گزر جائیں۔ تو اس دوران ان پیسوں کی قیمت کم ہو جائے گی، جس کی وجہ سے پیسے رکھنے والے کا نقصان ہو جائے گا تو اس نقصان کی تلافی کون کرے گا؟ ظاہر ہے کہ کوئی بھی نہیں کرے گا، اسی طرح اگر آپ نے کسی کو قرض دیا وہ ایسا ہی ہے جیسے آپ نے صندوق یا الماری میں پیسے اٹھا کر رکھ دیئے'' (درس ترمذی ۴/ ۱۵۰)۔

رہی یہ بات کہ پانچ سال پہلے اتنے نوٹ میں جتنا سامان یا غلہ ملتا تھا۔پانچ سال بعد اتنے نوٹ میں اس سے کم ملتا ہے،جس سے دائن پر ظلم ہونا معلوم ہوتا ہے۔تو شریعت مطہرہ میں صرف مادی فائدہ ہی پیش نظر نہیں ہوتا شریعت نے دائن اور مدیون دونوں کو تعلیم دی ہے، مدیون کو دین کی ادائیگی کی استطاعت ہونے پر جلد سے جلد ادا کردینا چاہئے، ورنہ وہ ظالم ہوگا "مطل الغنی ظلم" (ترمذی ۵۹۱/۳، حدیث: ۱۳۰۸)۔

اور اس ظلم کی سزا وہ عند اللہ بھگتے گا، اور اگر مدیون تنگ دست اور مجبور ہے تو اسے مہلت دینا بڑا کار ثواب ہے۔

"من أنظر معسرا أو وضع له أظله الله يوم القيامه تحت ظل عرشه يوم لا ظل إلا ظله" (ترمذی ۵۹۰/۳ ج ۱۳۰۶، ۱۳۰۷)۔

(جو شخص کسی تنگ دست کو مہلت دے یا اس سے ساقط کردے، معاف کردے، تو اللہ تعالی قیامت کے دن جس دن عرش کے سائے کے علاوہ کوئی سایہ نہ ہوگا، اس کو عرش کا سایہ دیں گے)۔

اور اگر ان مؤخر مطالبات کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کردیا جائے تو یہ مدیون پر بھی تو ظلم لگتا ہے، خاص طور سے وہ لوگ جو تنگ دست ہوں، اور اپنے قرض ادا کرنے کی فکر رکھتے ہوں۔

نیز اس کی وجہ سے سود کا دروازہ کھل جائے گا، اور اس کی قباحت جو لوگوں کے دل و دماغ میں ہے وہ ختم ہوجائے گی، کیوں کہ جو لوگ بینکوں میں اپنے پیسے محفوظ رکھتے ہیں، وہ روپے کی قیمت کے لحاظ سے سود میں ملنے والی رقم کو جائز سمجھنے لگیں گے۔

اس لئے اگر چہ روپے کی قدر کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنا اور اس کے ذریعہ مؤخر مطالبات کی ادائیگی کا انضباط ممکن بھی ہو تو چوں کہ اس میں حرج اور زحمت ہے، سود کے

دروازہ کو کھولنے کا سبب ہے اور عوام کے باہمی تنازع کا باعث ہے، اس لئے مؤخر مطالبات کی ادائیگی کسی بھی قیمت کے اشاریہ سے وابستہ نہ کی جائے، اور مؤخر مطالبات جتنے ذمہ میں ہوں اسی کے مثل ادائیگی کا قول کیا جائے۔

البتہ سرکار اور حکومتیں یا کمپنیاں جو مؤخر مطالبات اپنی طرف سے اضافہ کے ساتھ ادا کریں وہ درست اور جائز ہوگا۔ اسی طرح مدیون شخص اپنی خوشی سے جو اضافہ کر کے ادا کرے وہ بھی درست ہوگا بلکہ شریعت نے اس کی ترغیب بھی دی ہے۔ آپ ﷺ نے ایک اونٹ قرض لیا، اور واپسی اس سے بہتر اونٹ سے کی اور آپ ﷺ نے فرمایا:

''خیارکم أحاسنکم قضاء'' (سنن الترمذی ۳؍ ۵۹۸، حدیث نمبر: ۱۳۱۶-۱۳۱۷)۔

(تم میں بہتر وہ ہیں جو (قرض کی) ادائیگی میں بہتر ہوں)۔

۲- اس صورت میں جب کہ قرض نوٹوں کی شکل میں دیا گیا ہو، یا مہر کی تعیین نوٹوں میں کی گئی ہو، یا ادھار فروختگی کے وقت قیمت نوٹوں میں طے ہو، اور نوٹوں کی قیمت سونے یا چاندی میں طے کر لی جائے، پھر ادائیگی کے وقت اسی کے بقدر سونے یا چاندی کے مساوی نوٹوں کی شکل میں ادائیگی عمل میں لائی جائے تو یہ صورت درست نہیں ہوگی۔ مثلاً کسی نے پندرہ ہزار روپے قرض دئے یا مہر طے کی یا کسی سامان کی فروختگی میں پندرہ ہزار روپے قیمت مقرر کی، جس کی مالیت اس وقت دس گرام سونے کی ہے۔ دو سال کے بعد اس کی ادائیگی عمل میں آرہی ہے۔ اس وقت دس گرام سونے کی قیمت بیس ہزار روپے ہے تو بیس ہزار کی ادائیگی عمل میں لانا شبہ ربا کی وجہ سے درست نہیں ہوگا۔

اس کی جائز صورت یہ ہے کہ قرض دیتے وقت سونا یا چاندی ہی دیا جائے، یا مہر یا قیمت سونے چاندی میں مقرر کی جائے، اور ادائیگی کے وقت اتنے سونے یا چاندی کے مساوی نوٹوں کی شکل میں ادائیگی عمل میں لائی جائے تو یہ درست ہوگا۔

یا نوٹوں کی شکل میں قرض دیا جائے یا مہر وقیمت مقرر کی جائے، اور ادائیگی کے دن اسی کے مساوی چاندی یا سونے کی شکل میں ادائیگی عمل میں لائی جائے تو یہ بھی درست ہوگا، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث میں مذکور ہے۔

''کنت أبیع الإبل بالبقیع، فأبیع بالدنانیر، فآخذ مکانها الورق، و أبیع بالورق فآخذ مکانها الدنانیر فأتیت رسول الله ﷺ فوجدته خارجا من بیت حفصة فسألته عن ذلک فقال لا بأس به بالقیمة'' (سنن الترمذی ۳؍۵۴۳ حدیث نمبر: ۱۲۴۲)۔

موجوہ کرنسی سے متعلق دوسوالوں کے جواب

مولانا عبدالقیوم پالنپوری ☆

کاغذی نوٹوں کی اگرچہ ذاتی کوئی قیمت نہیں، اور افراط زر کی صورت میں اس کی قوت خرید تیزی سے گر جاتی ہے، مگر یہ ثمن عرفی اور مال ہیں، لہذا ان میں بھی جنس کا تبادلہ جنس سے ہوگا تو برابری وتماثل مقدار میں شرعاً معتبر ہوگا، اموال ربویہ میں قیمت کے تفاوت کا بالکل اعتبار نہیں ہوگا۔

(ا) اس سوال میں مذکور (الف) دیون مثلاً قرض، مہر، ادھار خریداری کی قیمتیں (ب) پنشن اور (ج) اجرتوں کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنے کا حکم الگ الگ ہے۔

الف- قرض، مہر اور ادھار خریداری کے ثمن کے روپیوں کو عقد کے وقت ہی قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ معلق کرنا جائز نہیں ہے، اسی طرح عقد کے بعد بھی قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ ان کو وابستہ کرنا جائز نہیں ہے، سود اور حرام ہے، اس لئے کہ اس میں درحقیقت ایک واجب رقم کا اسی جنس کے روپے سے کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ کرنا ہے اور شرعاً جنس کی جنس کے ساتھ تبادلہ میں مقدار میں برابری اور تماثل ضروری ہے، قیمت کے تفاوت کا اعتبار نہیں۔

ب- پنشن یہ شرعاً دَین نہیں ہے بلکہ مستاجر کی طرف سے ملازم پر احسان وتبرع ہے، لہذا اس کو قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ وابستہ کرنا جائز ہے، کیوں کہ اس میں کوئی تبادلہ وبیع کی

☆ جامعہ نذیریہ کاکوسی، گجرات۔

صورت نہیں ہورہی ہے بلکہ پینشن کے نام سے جوبھی رقم ملے گی قیمتوں کے اشاریہ سے یا اس کے بغیر وہ احسان وتبرع ہوگی، حضرت مفتی محمود صاحب گنگوہیؒ ایک سوال (کہ ملازم کا اپنی بقیہ زندگی کی پینشن کا پینشن کے مستاجر ادارہ ہی سے یکمشت رقم سے تبادلہ کرنا اور بیچنا جائز ہے یا نہیں؟) کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں: ملازمت سے سبکدوشی پر تا زیست ملازم کو رقم ماہانہ متعین کرکے بنام حق الخدمت دینا واجب نہیں بلکہ تبرع ہے، جس پر جبر نہیں کیا جاسکتا ہے، بلکہ اس کا دل چاہے دے، نہ چاہے نہ دے، جس طرح ماہانہ رقم دینا تبرع ہے جبر نہیں، اسی طرح یہ بھی اختیار ہے کہ اندازہ کرکے مجموعی رقم یکمشت دے دے، یہ درحقیقت احسان ہی کی ایک صورت ہے۔ اس میں نہ اصالۃ بیع مالا یملک ہے، نہ بیع مالیس عندہ ہے، نہ قمار ہے، نہ ربوا ہے؛ لہذا یہ لین دین شرعاً درست ہے، ونظیرہ بیع العرایا۔ (فتاوی محمودیہ طبع ڈابھیل ۱۶/ ۱۱۵)۔

ج - اجرتوں کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنے میں تفصیل ہے۔ اس کو حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب مدظلہ کی بعینہ عبارت والفاظ میں آئندہ تحریر کررہا ہوں۔

اجرتوں کا قیمتوں کے اشاریہ سے ربط وتعلق:

جہاں تک اجرتوں کے قیمتوں کے اشاریہ سے ربط کا مسئلہ ہے، تو جب تک اجرت قرض نہ بن جائے، اس وقت تک اس کا حکم ''قرضوں کے ربط'' سے مختلف ہوگا۔ البتہ اجرت اگر قرض بن جائے تو اس صورت میں اس کا حکم بھی وہی ہوگا جو ''قرضوں کے ربط'' کا حکم ہے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ ''اجرتوں کا قیمتوں کے اشاریہ سے ربط'' کی تین صورتیں ممکن ہیں:

۱ - پہلی صورت یہ ہے کہ اجرتیں اور تنخواہیں نوٹوں کے ذریعہ طے ہوجائیں کہ اتنی اجرت یا تنخواہ دی جائے گی۔ اور متعاقدین یعنی مالک اور مزدور کے درمیان یہ معاہدہ ہوجائے کہ

یہ تنخواہ ہر سال قیمتوں کے اشاریہ کی زیادتی کے تناسب سے بڑھتی رہے گی، مثلاً حکومت ایک شخص کو تین ہزار روپے ماہوار تنخواہ ملازم رکھے اور یہ معاہدہ کرے کہ یہ تنخواہ ہر سال کے شروع میں قیمتوں کے اشاریہ میں زیادتی کے تناسب سے بڑھتی رہے گی۔ اس صورت میں اس ملازم کو ہر سال کے آخر تک ہر ماہ تین ہزار روپے ہی قبول کرنے پڑیں گے، اور درمیان سال میں قیمتوں کے اشاریہ میں زیادتی کے تناسب کو نہیں دیکھا جائے گا۔ البتہ جب نیا سال شروع ہوگا تو اس وقت قیمتوں کے اشاریہ کو دیکھا جائے گا کہ ایک سال کے اندر اس میں کس تناسب سے زیادتی ہوئی، مثلاً قیمتوں کے اشاریہ میں پانچ فیصد کے تناسب سے زیادتی ہوئی تھی تو اس ملازم کی تنخواہ میں بھی اسی تناسب سے زیادتی کرنی ہوگی۔ لہذا اب نئے سال سے اس کی تنخواہ تین ہزار ایک سو پچاس روپے ہو جائے گی۔

یہ طریقہ بہت سے ممالک مثلاً پاکستان وغیرہ میں رائج ہے۔ اور اس قسم کے ربط کی شریعت میں کوئی ممانعت نہیں، اس لئے کہ اس صورت کا حاصل یہ ہے کہ دونوں فریق اجرتوں اور تنخواہوں میں ہر سال یا ہر چھ ماہ بعد ایک معین تناسب سے زیادتی پر متفق ہو گئے ہیں۔ اور یہ زیادتی کا تناسب اگرچہ عقد کے وقت تو فریقین کے علم میں نہیں ہوتا، مگر وہ پیمانہ معلوم ہے جس کی بنیاد پر تناسب کا تعین ہوگا۔ اس لئے زیادتی کی مقدار میں جو جہالت کا شبہ تھا وہ مرتفع ہو گیا۔ یا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر نئے سال کے شروع میں جس تناسب سے قیمتوں میں زیادتی ہوئی ہوگی، اسی تناسب سے اضافہ شدہ اجرت پر اس عقد اجارہ کی تجدید کی جائے گی۔ اور اس میں کوئی شرعی ممانعت نہیں ہے۔

۲- اجرتوں کے قیمتوں کے اشاریہ سے ربط کی دوسری صورت یہ ہے کہ اجرت کا تعین نوٹوں کی ایک معلوم مقدار پر ہو جائے لیکن عقد میں شرط کر لیں کہ مالک کے ذمہ یہ مقدار معلوم واجب نہیں بلکہ اس کے ذمہ وہ مقدار واجب ہوگی جو قیمتوں کے اشاریہ کی رو سے مہینہ کے آخر

میں اس مقدار معلوم کے مساوی اور برابر ہوگی۔

مثلاً زید نے عمر کو ایک ماہ کے لئے ملازم رکھا اور یہ طے پایا کہ زید عمر کو مہینہ کے آخر میں قیمتوں کے اشاریہ کا لحاظ کرتے ہوئے اتنی رقم اجرت میں دے گا جو موجودہ ایک ہزار روپے کے مساوی ہوگی۔ چنانچہ قیمتوں کے اشاریہ میں ایک ماہ کے اندر دو فیصد (۲٪) کے تناسب سے قیمتیں بڑھ گئیں۔تو اب زید مہینہ کے آخر میں عمر کو ایک ہزار بیس روپے (=/۱۰۲۰ روپے) ادا کرے گا۔ اس لئے کہ یہ ایک ہزار بیس روپے شروع مہینے کے ایک ہزار روپے کے مساوی ہیں۔

لیکن جب مہینے کے آخر میں یہ طے ہوگیا کہ تنخواہ ایک ہزار بیس روپے ہے۔تو اب یہ تنخواہ ہمیشہ کے لئے ایک ہزار اور بیس روپے ہی رہے گی زیادہ نہ ہوگی۔لہذا اگر مالک مہینے کے آخر میں یہ تنخواہ ادا نہیں کر سکا حتی کہ ایک مہینہ اور گزر گیا، یا ایک سال گزر گیا اور اس نے تنخواہ ادا نہیں کی، تب بھی مالک کے ذمہ ایک ہزار اور بیس روپے واجب ہوں گے، قیمتوں کے اشاریہ میں زیادتی سے اس میں زیادتی نہیں آئے گی۔مثلاً اگر اس عرصہ میں قیمتوں کے اشاریہ میں دس فیصد کے تناسب سے اضافہ ہوگیا تو وہ ملازم یہ مطالبہ نہیں کر سکے گا کہ چوں کہ قیمتوں کے اشاریہ میں دس فیصد کے تناسب سے اضافہ ہو چکا ہے اس لئے اب مجھے ایک ہزار بیس روپے پر دس فیصد کے حساب سے اضافہ کر کے اجرت دی جائے؛ اس لئے کہ عقد کے وقت ہی آپس کے اتفاق سے اجرت کے بارے میں یہ بات طے ہو چکی تھی کہ مہینے کے آخر میں جتنے روپے موجودہ ایک ہزار کے مساوی ہوں گے وہ دیئے جائیں گے۔ اور صرف اس کی تعیین کے لئے قیمتوں کے اشاریہ کو مدنظر رکھا جائے گا، لیکن جب مہینے کے آخر میں قیمتوں کے اشاریہ کی بنیاد پر ایک مرتبہ اجرت طے ہوگئی تو اب قیمتوں کے اشاریہ کا کام مکمل ہو چکا، اب اس کی ضرورت نہیں رہی اور اب وہ معین اجرت مالک کے ذمہ قرض ہوگئی، جس میں آئندہ نہ تو زیادتی ہو سکتی ہے اور نہ کمی واقع ہو سکتی ہے، قیمتوں کے اشاریہ میں چاہے کتنے بھی تغیرات واقع ہو جائیں۔

جہاں تک اس صورت کی شرعی حیثیت کا تعلق ہے میری رائے میں یہ بھی جائز ہے، بشرطیکہ قیمتوں کا اشاریہ اور اس کے حساب کا طریقہ فریقین کو اچھی طرح معلوم ہو، تا کہ بعد میں لاعلمی کی بنا پر آپس میں جھگڑا نہ ہو جائے؛ اس لئے کہ یہاں دونوں فریق اس بات پر متفق ہیں کہ طے شدہ اجرت ایک ہزار روپے نہیں بلکہ قیمتوں کے اشاریہ کے اعتبار سے مہینے کے آخر میں جتنے روپے موجودہ ایک ہزار روپے کے مساوی ہوں گے وہ مالک پر دینے واجب ہوں گے، جس کو حساب کے ذریعہ نکالنے کا طریقہ دونوں فریق کو معلوم بھی ہے۔ لہٰذا اجرت کی مقدار میں اتنی جہالت جھگڑے کا سبب نہیں بنے گی، اور یہ صورت بالکل اسی طرح ہے جیسے کہ ایک شخص نے کسی کو ملازم رکھا اور اجرت یہ طے کی کہ مہینے کے آخر میں دس گرام سونے کی جو قیمت ہوگی وہ مالک کے ذمہ ادا کرنی واجب ہوگی۔ جب مہینے کے آخر میں دیکھا تو دس گرام سونے کی قیمت دو ہزار روپے تھی تو خود بخود یہ طے ہو گیا کہ اجرت دو ہزار روپے ہے۔ اب اس کے بعد اس اجرت میں نہ تو زیادتی ہوگی اور نہ کمی ہوگی، چاہے سونے کی قیمت اس کے بعد زیادہ ہو جائے یا کم ہو جائے، اس سے اجرت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

۳- اجرتوں کے قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ ربط کا تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اجرت تو روپے کی معین مقدار کے ذریعہ طے ہو جائے اور فریقین کے درمیان یہ شرط ہو جائے کہ وہ اجرت مالک کے ذمہ واجب ہوگی جو عقد اجارہ میں طے ہوئی ہے۔ لیکن مالک جس دن یہ اجرت ادا کرے گا اس دن قیمتوں کے اشاریہ میں جس تناسب سے اضافہ ہوا ہوگا، اسی تناسب سے وہ اجرت میں بھی اضافہ کر کے ادا کرے گا۔

مثلاً ایک شخص نے کسی کو ایک ہزار روپے پر ملازم رکھا اور دونوں کے درمیان یہ طے ہو گیا کہ اجرت ایک ہزار روپے ہے۔ لیکن مالک پر یہ ضروری ہوگا جس دن وہ یہ اجرت ادا کرے گا، اس دن قیمتوں کے اشاریہ میں جس تناسب سے اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ ہوا ہوگا،

اسی تناسب سے وہ بھی ایک ہزار روپے میں اضافہ کر دے گا۔ لہذا مالک نے اگر یہ اجرت مہینے کے آخری دن میں ادا کی اور اس روز قیمتوں کے اشاریہ میں دو فیصد کے تناسب سے اضافہ ہو چکا تھا، تو اب مالک بھی دو فیصد کے تناسب سے اضافہ کر کے ایک ہزار اور بیس روپے ادا کرے گا۔ اور اگر مالک نے یہ اجرت ایک سال کے بعد ادا کی اور اس وقت تک قیمتوں کے اشاریہ میں دس فیصد کے تناسب سے اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ ہو چکا تھا تو اب مالک بھی دس فیصد کے تناسب سے اضافہ کر کے گیارہ سو روپے ادا کرے گا۔

میری رائے میں اس کا شرعی حکم "قرضوں کے قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ ربط" کی طرح ہے، جو کہ شرعاً جائز نہیں، جیسا کہ ہم تفصیل سے پیچھے بیان کر چکے ہیں۔

تیسری صورت اور دوسری صورت کے درمیان فرق یہ ہے کہ دوسری صورت میں اشاریہ سے صرف متفقہ اجرت کی تعیین کا کام لیا گیا، اور اشاریہ کی بنیاد پر جب ایک مرتبہ اجرت متعین ہوگئی تو اشاریہ کا کام ختم ہو چکا۔ اب ہمیشہ کے لئے یہی متعین اجرت مالک کے ذمہ واجب رہے گی، اس پر زیادتی نہ ہوگی، چاہے مالک جب بھی ادا کرے۔

بخلاف اس تیسری صورت کے کہ اس صورت میں اجرت ایک ہزار روپے متعین تھی جو ادا نہ کرنے کی بنا پر مالک کے ذمہ قرض بن گئی تھی اور پھر اس قرض کو اشاریہ کے ساتھ ملا دیا گیا تھا۔ لہذا اس تیسری صورت کا بھی وہی عدم جواز کا حکم ہوگیا جو قرضوں کے اشاریہ کے ساتھ ربط کا حکم ہے۔

اس تیسری صورت کے بارے میں ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اجرت کی تعیین میں اشاریہ اپنا فرض پورا کر رہا ہے کہ جس وقت آپ چاہیں نرخ نامہ کے ذریعہ اجرت متعین کر کے ادا کر دیں۔ اس لئے کہ اجرت کی تعیین عقد اجارہ کے وقت ہی طے ہو جانا ضروری ہے۔ یا دوسرے کسی خاص وقت کے اندر اندر اس کی اس طرح تعیین ضروری ہے کہ اس تعیین کے بعد اجرت میں نہ تو زیادتی

ہو سکے اور نہ کمی ہو سکے۔ لہذا اگر اجرت کو کسی دوسری چیز کے ساتھ اس طرح ہمیشہ کے لئے معلق کردیا جائے کہ اس دوسری چیز کی زیادتی سے اس اجرت میں بھی زیادتی ہوجائے اور اس چیز میں کمی سے اجرت میں بھی کمی واقع ہوجائے، اس صورت میں تو اجرت مجہول ہی رہے گی اور کسی معلوم مقدار پر اس کی تعیین کسی وقت بھی نہ ہو سکے گی، اور ایسی جہالت عقد اجارہ کو فاسد کردیتی ہے۔ واللہ اعلم (فقہی مقالات از حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب مدظلہ ص/ ۵۲ تا ۸۷ مع حذف)۔

موجودہ کرنسی اور اس کی شرعی حیثیت

مولانا رضوان الحسن مظاہری ☆

الحمد لله و کفی و سلام علی عبادہ الذین اصطفی، أما بعد۔

کسی سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ موجودہ دور بڑی تیز رفتاری کے ساتھ انقلابات سے دو چار ہے، سائنس کی ترقی، نئی ایجاروں اور نئی تدبیروں کو جنم دے رہی ہے اور ان سے نئے مسائل ابھر رہے ہیں۔ان حالات وانقلابات نے دین کے ان احکام ومسائل کو بھی متاثر کیا ہے جو مجتہد فیہا ہیں منقول ومنصوص نہیں ہیں؟ اور یہ ہر زمانے میں ہوتا رہا ہے۔علماء اور فقہاء نے کبھی ان سے صرف نظر نہیں کیا ہے البتہ جب تک مسائل منقح نہیں ہوجائے حکم لگایا نہیں جاتا، اس کی مثالوں میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال ہو یا ہوائی جہازوں پر نمازوں کی ادائیگی جیسے مسائل پیش کئے جا سکتے ہیں؟ ایک دور تھا کہ لاؤڈ اسپیکر پر نماز کو ناجائز کہتے رہے مگر پوری سائنسی تحقیق کے بعد علماء نے اس کو جائز ہونے کا فتوی دیا، اسی طرح ہوائی جہاز پر نماز پڑھنے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی مگر بعد میں اس کی بھی اجازت دے دی گئی۔اور یہ عیب نہیں ہے بلکہ عرف وعادت کی تبدیلی سے احکام ومسائل ہر دور میں بدلتے رہے ہیں۔متقدمین تعلیم قرآن اور درس حدیث وتفسیر وفقہ پر اجرت کو مطلق ناجائز کہتے تھے، اسی طرح امامت ومؤذنی کی اجرت کے عدم جواز کا فتوی دیتے تھے مگر متاخرین نے اپنے دور میں حالات سے مجبور ہوکر ان کے جواز کا فتوی دیا اور ملت نے اس

☆ مدرسہ اعجاز العلوم احمد نگر مہاراشٹر۔

کو قبول کیا اور اس سے فائدہ اٹھایا؛ چنانچہ فقہاء نے صراحت کی ہے:

''العادة والعرف رجع إليه مسائل كثيرة حتى جعلوا ذلك أصلاً فقالوا: تترك الحقيقة بدلالة الاستعمال والعادة ثم ذكر في الاشباه'' (رسم المفتی ر ۹۵) (عادت اور عرف ایسی چیز ہے جس کی طرف بہت سارے مسائل میں رجوع کیا جاتا ہے؛ اس لئے اس کو ایک قاعدہ کلیہ بنادیا اور کہا کہ استعمال وعادت کی وجہ سے حقیقت ترک کردی جائے گی)۔

مذکورہ عبارت کو دیکھ کر فقہاء نے اس کو ایک قاعدہ کلیہ تسلیم کرلیا ہے اور کہا کہ استعمال وعادت کی وجہ سے بسا اوقات حقیقت ترک کردی جائے گی؛ چنانچہ اسی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے علماء اور فقہاء کے لئے عرف وزمانہ سے واقف ہونا ضروری اور لازمی قرار دیا گیا۔ رسم المفتی میں یہ عبارت موجود ہے:

''وقد قالوا ومن جهل بأهل زمانه فهو جاهل'' (رسم المفتی ر ۹۸) (جو اپنے زمانہ کے احوال سے واقف نہ ہو وہ جاہل ہے)۔

صاحب مبسوط نے لکھا ہے: ''الثابت بالعرف كالثابت بالنص'' (مبسوط ر ۵۵)۔

(عرف وعادت سے جو ثابت ہوتا ہے اس کا تقریباً وہی درجہ ہوتا ہے جو نص سے ثابت ہو)۔

علامہ شامی نے تحریر کیا ہے: ''قد تغيرت أحكامها لتغير الزمان، اما للضرورة، واما للعرف واما لقرائن الأحوال'' (شامی ر ۹۶)۔

(بہت سے احکام زمانے کے انقلاب سے بدل گئے ایسا یا تو ضرورت کی وجہ سے ہوا یا پھر عرف وعادت کی وجہ سے ہوا یا احوال زمانہ کے قرائن کو مدنظر رکھتے ہوئے (فقہ اسلامی)۔

فقہاء کرام کی ان تمام تشریحات سے یہ بات صاف طور پر واضح ہوجاتی ہے کہ حالات

وعرف کے بدلنے کا مسائل پر اثر ہوتا ہے، اورعرف وعادت اور حالات کے پیش نظر احکام میں تبدیلی عیب نہیں، بلکہ بہتر ہے، ناجائز نہیں جائز ہے، اسلام رہتی دنیا کے لئے آیا ہے اور تمام دنیا اور کائنات کے لئے آیا ہے، پھر یہ کیوں کر کہا جاسکتا ہے کہ عرف وعادت اور حالات پر نظر نہ رکھی جائے یا ضرورت کا لحاظ و پاس نہ ہو؟

کرنسی نوٹوں کا مسئلہ بھی حالات اورعرف وعادت سے بے نیاز نہیں رہ سکتا ہے اور سو سال پہلے جو حکم تھا ہر حال میں وہی باقی نہ رہے گا بلکہ اس میں تبدیلی ہوگی، نیز اسلامی عدل ومساوات کی وجہ سے تبدیلی ہونی بھی چاہئے، کیوں کہ ایک دور تھا کہ چاندی اور سونے کے سکے ڈھلتے اور بازار میں چلتے تھے اور کرنسی ونوٹوں کا نام ونشان تک نہیں تھا، پھر حالات میں تبدیلی آئی، سونے اور چاندی کی کمی ہوئی اور اس کی تلافی دوسری دھاتوں کے سکوں سے کی گئی۔ یہ سکے بھی بہت دنوں تک رائج رہے، یہی وجہ ہے کہ فقہ کی تمام کتابوں میں سونے اور چاندی اور دوسری دھاتوں سے تیار کئے ہوئے (درہم ودینار) سکوں کے مسائل بکثرت پائے جاتے ہیں، آج بھی انہی مسائل کو پڑھایا جاتا ہے۔ پھر ایک دور وہ بھی آیا کہ ہر ملک کی حکومت نے سکوں کی جگہ میں کرنسی نوٹوں کو رائج کیا، کئی قسم کے نوٹ چھاپے گئے (سو، پچاس، پانچ سو، ہزار وغیرہ)، اس کے بعد حکومتیں سونے اور چاندی کے سکوں کو اپنے خزانے میں جمع کراتی گئیں، اس کے بعد دوسری دھاتوں کے سکے بھی آہستہ آہستہ کم ہوتے گئے، اب حال یہ ہے کہ جہاں دیکھئے کاغذ ہی کاغذ کے نوٹ نظر آتے ہیں؟ خواہ وہ ہندوستان ہو یا یورپ، عرب ہو یا امریکہ، یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک میں ہر ایک نوٹ پر یہ عبارت لکھی ہوتی ہے:

I PROMISE TO PAY THE BEARER THE SUM OF RUPEES.

کہ میں حامل ہذا کو اتنا روپیہ ادا کرنے کا وچن دیتا ہوں۔

اسی بنیاد اور دلیل پر ہمارے اکابر نے روز اول ہی سے نوٹ کو اصلاً ثمن اور نقد قرار

نہیں دیا؛ بلکہ وہ ایک قابل اعتماد وثیقہ اور سند زر مانا ہے۔

اس اعتبار سے حکومت اس کے ذریعہ ہماری امین ہے، اور اس وثیقہ اور سند زر سے ہمارا تمول قابل اعتبار ہے اور ہماری ضروریات ہر وقت پوری ہوتی رہتی ہیں اور ہم اس پر عملاً وقلباً مطمئن ہیں۔ چونکہ نوٹ ایک نئی چیز وجود میں آئی پہلے اس طرح کے نوٹوں کا وجود نہ تھا، اس لئے فقہاء کرام کی کتب متداولہ فقہیہ میں اس کا جزئیہ صراحت کے ساتھ تو نہیں ملتا۔ ضرورت ہے کہ ان اصول وضوابط میں غور وفکر کیا جائے اور ان پر گہری نگاہ ڈالی جائے تو نئے مسائل کا حل تلاش کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے، چوں کہ ہر شخص کا طریقۂ تخریج واستنباط جدا ہوتا ہے اس لئے اس طرح کے جدید مسائل میں اختلاف رائے ہوجانا ایک لازمی امر ہے؟ اسی بنیاد پر نوٹ کی شرعی حیثیت متعین کرنے میں علماء کرام کا اختلاف ہوگیا۔

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارنپوری، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب سابق مفتی اعظم مظاہر علوم سہارنپور وغیرہم نے نوٹ کو حوالہ وثیقہ اور سرکاری سند زر مانا ہے (فقہ اسلامی)۔

ان حضرات کے دلائل کا خلاصہ یہ ہے:

۱- اگر نوٹ کے سرکاری سند اور وثیقہ ہونے سے صرف نظر کرلیا جائے تو اسے کوئی بھی ایک روپیہ میں بھی نہ خریدے گا۔

۲- حکومت نے نوٹ کو اپنی طرف سے جاری کیا ہے اور اس کے حامل سے حکومت نے معاہدہ کیا ہے، اور اس کی ادائیگی کا ہر وقت ذمہ لیا ہے، حکومت نے اس کو سکہ قرار نہیں دیا جیسا کہ نوٹ پر لکھی ہوئی عبارت سے واضح ہوتا ہے۔

۳- یہ ایک رقعہ ہے جو غیر نامی ہے، اس لئے اس پر لکھی ہوئی رقم کو ہر وقت سرکار سے

وصول کیا جا سکتا ہے۔ نیز یہ حضرات درمختار وشامی کی حسب ذیل عبارت بھی اپنے استدلال میں پیش کرتے ہیں:

"ففي الدر المختار بيع البراءة التي يكتبها المدبون على العمال لا يصيح، قلت وعبارة الصيرفية هكذا مثل عن بيع الخط قال لا يجوز فإنه لا يخلو إما أن يباع ما فيه أو عين الخط لا وجه للأول لأنه بيع ما ليس عنده ولأوجه الثاني، لأن هذا القدر من الكاغذ ليس متقوماً"۔

لیکن اب صورت حال یہ ہے کہ سونے اور چاندی کی کرنسی (سکے، درہم، دینار) بازار سے بالکل ناپید ہو چکی ہے اور قانونی عرفی طور پر نوٹ اس کثرت سے رائج ہو گیا ہے کہ سارا لین دین اسی سے ہو رہا ہے۔

یہ تو ایک حقیقت ہے کہ کاغذی نوٹوں کی اپنی ذاتی کوئی قیمت نہیں ہوتی اور افراط زر کی صورت میں اس کی قوت خرید تیزی سے گر جاتی ہے، مگر جب ان نوٹوں کو اصل سونے یا چاندی کا بدل قرار دے کر اصل مان لیا گیا تو یہ نوٹ اپنے مبدل منہ کا حکم فی الجملہ اختیار کر لیا اور ان پر وہی حکم جاری ہونے لگا جو سونے اور چاندی پر ہوتا تھا (فقہ اسلامی)۔

نیز اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ عصر حاضر کے تمام علماء کرام اور صاحب فتوی حضرات، ان نوٹوں کی اسی سند ووثیقہ کی حیثیت پر نظر رکھتے ہوئے اس کی مالیت اور قوت خرید کا اعتبار کر کے مختلف زمانے میں نصاب زکوۃ کی تعیین نوٹوں کے مختلف مقدار سے کرتے آئے ہیں اور اب بھی کر رہے ہیں، مثلاً کبھی صرف پچاس ساٹھ نوٹوں کے مالک کو بھی مالک نصاب مانا گیا تھا تو کبھی دوسو اور تین سو نوٹوں کے مالک پر بھی زکوۃ واجب سمجھا گیا، لیکن آج جبکہ چاندی اور سونے کا نرخ بہت زیادہ گراں ہو گیا ہے، اب کئی ہزار نوٹوں کے مالک کو مالک نصاب قرار دیا جاتا ہے آخر ایسا کیوں؟ اسی طرح ہندوستانی کئی نوٹوں کا تبادلہ ایک سعودی ریال

سے بلانکیر شائع ہے، اسی طرح مختلف ممالک کے کاغذی نوٹوں ریال، ڈالر، پونڈ کا ایک دوسرے سے تبادلہ عددی طور پر کمی بیشی کے ساتھ عام طور پر رائج ہے اور شاید کسی مفتی کی نظر میں یہ تبادلہ غلط اور خلاف شرع بھی نہیں آخر کیوں؟

ظاہر ہے کہ ان مختلف ممالک کے مختلف ریال، ڈالر، پونڈ اور روپے کی اسی مالیت اور قوت خرید کے باہمی تفاوت کے سبب مقدار اور گنتی کی کمی بیشی کی جاتی ہے جس کے نتیجے میں حقیقتاً مماثلت ومساوات پیدا ہوجاتی ہے اور ہم اسے جائز کہتے ہیں ربوا کا شبہ بھی نہیں ہوتا ہے (مجلۂ فقہ اسلامی)۔

جب ہم ان مختلف ممالک کے نوٹوں کو اس ملک کی طرف سے اس کی مستند مالیت اور قوت خرید کا لحاظ رکھتے ہیں، اور جب زکوۃ کے وجوب وعدم وجوب میں نوٹوں کی اسی سندی اور قانونی مالیت پر نظر کرتے ہیں تو یہ کیسی عجیب بات ہوگی کہ محتاج انسانوں کے مؤخر مطالبہ کی ادائیگی میں اس سے صرف نظر کرلیا جائے، جب کہ یہ ایک حقیقت اور مشاہدہ ہے کہ ان نوٹوں کی مالیت اور قوت خرید میں ایک خاص مدت گزرنے پر نمایاں کمی آجاتی ہے تو پھر کیا مؤخر مطالبوں کی ادائیگی ان کم قدر وقیمت کے نوٹوں کے ذریعہ کیسے اسلامی عدل وانصاف کے تقاضہ کو پورا کرسکتی ہے؟

چنانچہ اب دیون اور قرض ومہر کے لئے بہترین شکل اور آسان صورت یہ ہوسکتی ہے کہ سارے معاملات میں تو اس نوٹ کو عین ثمن خلقی کے درجہ میں رکھا جائے اور اس کی حیثیت محض ثمنیت کی ملحوظ نظر رہے؛ کیوں کہ نقد اور معجّل معاملات میں ان کی مالیت اور قوت خرید میں کوئی قابل لحاظ تفاوت اکثر نہیں ہوتا ہے، باقی رہا تفاوت یسیرہ تو وہ شرعاً غیر معتبر ہے، صاحب ہدایہ فرماتے ہیں کہ تفاوت یسیرہ جو جھگڑے کی طرف مفضی نہ ہو کوئی حرج نہیں ہے (ہدایہ کتاب البیوع)۔

لیکن جہاں معاملات ادھار اور مؤجل ہو وہاں ان نوٹوں کو سند وثیقہ کی حیثیت ہی کا

لحاظ ہونا چاہئے؛ کیوں کہ ایک خاص مدت کے بعد ان کی قدر ومالیت میں یقینی تفاوت ہوجاتا ہے جو ضرر اور اتلاف حق کو مستلزم ہے، اس لئے قرض دیتے وقت یا دیون وہر مقرر کرتے اور ادھار خریدتے وقت طرفین واجب الادا نوٹ کی حیثیت ومالیت سونے یا چاندی کے اشاریہ میں طے کرلیں اور بوقت ادائیگی اس قدر سونے یا چاندی کے مساوی نوٹوں کی ادائیگی پر معاملہ طے کرلیں مثلاً اس طرح کہ آج دو تولہ چاندی کے عوض یا اس کے برابر دو سو روپیہ قرض دیتا ہوں، اور وصولیابی کے وقت دو تولہ چاندی کے برابر روپیہ لوں گا خواہ وہ کتنے ہی نوٹوں کے برابر ہو، یہ صورت بلاشبہ جائز ہے جس کی صریح تائید ذیل کی عبارت سے ہوتی ہے (مقالہ فقہ اسلامی)۔

''وفی دعوی البزازیة من النوع الخامس عشر عن فوائد الإمام أبی حفص الکبیر استقرض منه دانق فلوس حال کونها عشرة بدانق فصارت ستة بدانق أو رخص وصار عشرون بدانق یأخذ منه عدد ما أعطی ولا یزید ولا ینقص، قلت هذا مبنی علی قول الإمام وهو قول أبی یوسف أولاً وقد علمت أن المفتی به قوله بوجوب قیمتها یوم القرض وهو دانق أی سدس درهم سواءً صار الآن ستة فلوس بدانق أو عشرین بدانق'' (شامی: کتاب البیوع ۴/ ۲۴)۔

''وعند محمد یوم الکساد وهو آخر ما تعامل الناس بها وفی الذخیرة والفتوی علی قول أبی یوسف وأوجب محمد قیمة یوم الکساد وعلیه الفتوی'' (درمختار ۴/ ۲۶۸)۔

ایک دوسرے انداز سے بھی اس مسئلہ پر غور کیا جائے۔ چنانچہ ہمارے فقہاء نے اشیاء کی تقسیم ذوات الامثال اور ذوات القیم سے کی ہے اور دونوں کے جدا جدا احکام کو مفصل لکھا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہ تقسیم اور پھر مثلی وقیمی کی تعریف محض تقریبی ہے کوئی چیز منصوص چیز نہیں، ہمارے فقہاء نے اجتہادی طور پر صرف اسلام کے قانون عدل ومساوات کے تقاضوں کی تکمیل

ہی کے لئے یہ ساری تعریفات وتخریجات پیش کی ہیں۔ کتب فقہ میں ایسی نظیریں ضرور مل جاتی ہیں کہ اصول عام کے تحت جب مثلی کا ضمان اتلاف بشکل مثلی دلانے سے عدل کا تقاضا پورا نہیں ہوتا تو بصورت قیم قیمت کی شکل میں اس کا ضمان دلواتے ہیں۔ حدیث مصراۃ اس کی واضح مثال ہے اور اس کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ مثل اور قیمت کے سوا کسی اور چیز کے دینے دلانے سے بھی تقاضاعدل اگر پورا ہوسکے تو یوں بھی کرنا چاہئے۔ رسول اللہ ﷺ نے اہل مصراۃ کے خریدار کو کھجور دینے کا حکم فرمایا جو تلف شدہ اور پیے ہوئے دودھ کا نہ مثل ہے نہ قیمت، اس کا کیا منشا ہوسکتا ہے، یہ جناب رسالت مآب رسول اللہ ﷺ کی عدالت ہی کا تقاضا تھا کہ بائع کو معمولی خسارہ سے بھی بچالیا جائے۔ بہرحال یہ غور طلب امر ہے کہ یہ کاغذی نوٹ فقہاء کی اس تقسیم کے مطابق مثلی ہے یا قیمی، بعض معاصر علماء نے مثلی اور قیمی کی بعض تعریف کے مطابق اسے قیمی قرار دیئے جانے کا امکان بھی ظاہر کیا ہے، اور اگر اسے تسلیم کرلیا جائے تو مسئلہ اور زیادہ سہل اور طے شدہ ہوجاتا ہے کہ ان نوٹوں کے ذریعہ مطالبات مؤخرہ کی ادائیگی میں قیمت کا اعتبار یقیناً ہونا چاہئے لیکن اسے قیمی قرار دینے میں بعض دشواریاں بھی پیدا ہوسکتی ہیں، فقہ حنفی کے اعتبار سے جیسے قرض واستقراض کا معاملہ ہے، فقہ حنفی کے مطابق دشواری ہوگی، اس لئے کہ مثلی کی جو تعریف فقہ حنفی میں مذکور ہے اس کے مطابق ان نوٹوں کے عددی متقارب ہونے کی بنیاد پر مثلی ہی کہنا مناسب ہے، اور اپنی جگہ یہ بھی طے شدہ اور مسلمہ ضابطہ ہے کہ کسی مثلی کے واجب فی الذمہ ہوجانے کے بعد اسی کے مثل کی ادائیگی سے ذمہ فارغ ہوگا۔

اب غور کیا جائے کہ اگر کسی کے ذمہ دس سال پہلے کسی کے سو نوٹ بطور قرض یا دین واجب الاداء ہوجائیں تو کیا وہ شخص آج کے محض صوری اور عددی طور پر اس دین قرض کو برابر نوٹ ادا کرنے سے فارغ الذمہ قرار دیا جائے گا؟ اور کیا ان دونوں نوٹوں میں مالیت اور قیمت خرید کے اعتبار سے تفاوت فاحش کے باوجود محض عددی اور صوری مساوات کی بنیاد پر ایک کو

دوسرے کا مثل تسلیم کیا جائے گا؟ فقہی تصریحات سے اس کا جواب نفی میں نکلتا ہے، صاحب ہدایہ لکھتے ہیں:

''المماثلة بين الشيئين تكون صورة ومعنى'' (ہدایہ الشرح مع فتح القدیر: باب ربوا)
دوچیزوں میں برابری صورت اور معنی دونوں اعتبار سے ہوتا ہے۔

علامہ کاسانی بدائع الصنائع میں تحریر فرماتے ہیں: "والمثل المطلق هو المثل صورة ومعنى فاما القيمة فمثل من حيث دون الصورة'' (۱۵۰/۷) مثل مطلق کہتے ہیں صورت اور معنی دونوں کے مساوات کو، اور قیمت میں معنی کے اعتبار سے مساوات ہوتا ہے نہ کہ صورت کے اعتبار سے۔

ان عبارتوں سے واضح طور پر ثابت ہورہا ہے کہ قیمت کو بھی دوچیزوں کے درمیان مماثلت مطلوبہ کے تحقق میں داخل ہے، اور اگر دوچیزیں محض صورتاً مماثل ہوں اور قیمتاً متفاوت تو مماثلت مطلوبہ فوت ہوجائے گی۔ علامہ ابن قیمؒ تو اعلام الموقعین (۴۵/۲) میں جنساً صفتاً مالیۃً مقصوداً اور انتفاعاً ہر طرح مساوات کو مماثلت کے لئے ضروری کہتے ہیں۔ المغنی (۳۵۲/۴) میں وسیط سے امام غزالیؒ کا قول نقل کیا ہے: والصحيح أنه المثل الذى تتماثل أجزاء في القيمة والمنفعة (مماثلت کی صحت اور مساوات یہ ہے کہ قیمت اور منفعت دونوں میں برابری ہو)، ظاہر ہے کہ ان تصریحات کی موجودگی میں دونوٹوں میں قدروقیمت اور مالیت کے مابین تفاوت فاحش کے باوجود ایک دوسرے کا مثل کہنا بہت مشکل ہوگا، جس کا صاف مطلب یہی نکلتا ہے کہ نوٹوں کے ذریعہ مطالبات مؤخرہ کی ادائیگی میں قیمت ومالیت کا اعتبار ضرور ہونا چاہئے تاکہ ادا مثل بن کر فارغ الذمہ ہوجائے ورنہ اتلاف حق کی بناپر عند اللہ مؤاخذہ کا خطرہ ہوسکتا ہے۔ فقہاء لکھتے ہیں:

''يجيزون رد العين المستقرضة ما دامت لم تتعيب بعيب ينقض

مالیته، أما إذا تعیب لا یصح ردها'' (جب عین مستقرضہ کی واپسی عیب ہونے سے پہلے جائز ہے بعد میں نہیں) تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ عیب ایک مثلی کو مثلی رہنے نہیں دیتا اور عیب دار چیز سالم من العیب کا مثل نہیں ہوسکتی، اور اس کے ساتھ فقہا کا یہ کلیہ پیش نظر رکھا جائے:

''کل ما أوجب نقصان الثمن في عادة التجار فهو أعیب لأن التضرر بنقصان المالیة وذلک بانتقاص القیمة والمرجع في معرفته عرف أهله'' (ہدایہ ثالث / ۲۳)۔

(جب ہر وہ چیز جو تاجروں کے عرف میں اشیاء کی قیمت کے نقصان کا سبب بن جائے وہ عیب ہے جس کی بنیاد پر ہر مشتری کو بیع واپس کرنے کا حق مل جاتا ہے، اس لئے کہ مالیت کی کمی سے اس کا ضرر اور نقصان ہوتا ہے اور دفع ضرر ہر شخص کا شرعی حق ہے، اور مالیت کی کمی قیمت کے کم ہونے سے ہوا کرتی ہے)، تو کیا نوٹوں کی قیمت میں کمی ہونا صاحب حق کے لئے باعث ضرر نہیں ہوگا، اور اس کے دفع کا حق نہیں ملے گا، یقیناً ملے گا اور ملنا چاہئے: کیوں کہ اس کاغذی نوٹ کو ان سارے عیبوں کے ساتھ ماضی کے ان نوٹوں کا مثل کیسے قرار دیا جاسکتا ہے جو اپنے وقت میں ان عیبوں سے محفوظ تھے، اور پھر سب سے بڑھ کر قوی اور نص صریح تو اس سلسلہ میں حضرت امام ابو یوسفؒ کا مفتی بہ قول موجود ہے کہ اگر دراہم مغشوشہ اور فلوس نافقہ جو ثمن اصطلاحی کے درجہ کی چیز ہے اس کے ذریعہ بیع وشراء کا معاملہ کیا جائے یا قرض دیا جائے اور ابھی بیع میں ثمن کی یا معاملہ استقراض میں اس قرض کی ادائیگی نہ ہوسکی تھی کہ ان دراہم مغشوشہ اور فلوس نافقہ کا چلن بند ہوگیا یا اس کی قدر وقیمت میں کمی آگئی تو اس مشتری اور مستقرض پر ثمن اور قرض میں لیے دراہم وفلوس کی قیمت لازمی ہوگی۔ یعنی بیع وشراء کے دن یا قرض کے مسئلہ میں قبضہ کے دن ان دراہم وفلوس کی جو قیمت اور جتنی قدر ومالیت تھی اتنی ہی قیمتی اور مالیت کی چیز بطور ثمن مشتری پر اور بطور ادائے قرض مستقرض پر ضروری ہوگا۔'' قال الثاني: ثانیا، علیه قیمتها من الدراهم یوم البیع

والقبض وعلیه الفتوی أی یوم البیع فی البیع ویوم القرض فی القرض فلا فرق بین الکساد والرخص والغلاء فی لزوم القیمة'' (شامی ۴/۳۲۵)۔

بہرحال ان مذکورہ بالا تمام فقہی تصریحات ونظائر کی روشنی میں، اورحالات حاضرہ میں معیشت کی تباہ کاری اور اقتصاد کی خستہ حالی اور کرنسی نوٹوں کی ڈیویلویشن کو دیکھ کر اورعرف اور عموم بلوی کو سامنے رکھ کرغور کیا جائے؛ چنانچہ ماضی کے ان فیصلوں میں ضروری اور لازمی طور پر ترمیم کیا جائے جوعصر حاضر کے تقاضوں پر پورے پورے نہ اتر سکیں، اور اسلام کے قانون عدل کا تقاضہ پورا نہ کر سکے۔ اس لئے راقم الحروف کا خیال یہ ہے کہ ان نوٹوں کونقد اور معجّل معاملات میں ثمن عرفی تسلیم کیا جائے، مگر ادھار ومؤجل معاملات میں (مثلاً قرض، دین، مہر، پینشن، ادھارخرید وفرخت وغیرہ) سندوثیقہ سمجھا جائے اوراس وقت یعنی معاملہ کرتے وقت کرنسی نوٹوں کا اشاریہ سونے اور چاندی سے کرلیا جائے تاکہ اسلام کے قانون عدل کا تقاضہ پورا کیا جاسکے اور صاحب معاملہ غبن فاحش کے ضرر سے اورنقصان سے محفوظ رہ سکے۔ واللہ اعلم۔

موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت

مولانا سلمان پالنپوری قاسمی ☆

کاغذی نوٹوں کی اگر چہ ذاتی کوئی قیمت نہیں، اور افراط زر کی صورت میں اس کی قوت خرید تیزی سے گر جاتی ہے، مگر یہ ثمن اصطلاحی اور مال ہیں، نیز موجودہ نوٹ مثلی ہیں، یہ کو فقہاء کی زبان میں کیلی اور وزنی نہیں، لیکن عددی غیر متفاوت ہیں، اس لئے کہ ایک تعداد کے دو نوٹ مثلاً سو روپئے کے دو نوٹ ایک ہی مالیت ہوتی ہے اوران کی قدر میں کوئی تفاوت نہیں ہوتا ہے، جیسا کہ فقہاء نے دراہم ودنانیر کی طرح فلوس کو بھی مثلی شمار کیا ہے، لہذا ان میں بھی جنس کا تبادلہ جنس سے ہوگا تو برابری مقدار میں شرعاً ضروری ہے، اموال ربویہ میں قیمت کے تفاوت کا بالکل اعتبار نہیں ہے۔

موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت کے عنوان کے تحت مذکور سوال میں (الف) دیون مثلاً قرض، مہر اور ادھار خریداری کی قیمتیں (ب) پنشن اور (ج) اجرتوں کو قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ وابستہ کرنے کا حکم الگ الگ ہے۔

دیون کا قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ ربط وتعلق:

الف- قرض، مہر اور ادھار خریداری کے ثمن کے نوٹوں کو بوقت عقد ہی قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ معلق کرنا جائز نہیں ہے، اسی طرح عقد کے بعد بھی قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ

☆ مدرسہ جامعہ خلیلیہ، ماہی، شمالی گجرات۔

ان کو وابستہ کرنا جائز نہیں ہے، اور عدم جواز کے بارے میں حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی تحریر فرماتے ہیں: قرآن وسنت کے دلائل میں غور کرنے اور لوگوں کے معاملات کا مشاہدہ کرنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ قرض کی واپسی (اور ہم جنس کی تبادلہ میں) جو برابری شریعت کی نظر میں مطلوب ہے وہ مقدار اور کمیت میں مطلوب ہے، قیمت اور مالیت میں مطلوب نہیں، جس کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

۱- اگر ایک شخص دوسرے سے ایک کلو گندم بطور قرض لے اور قرض لیتے وقت ایک کلو گندم کی قیمت پانچ روپے تھی اور جب وہ قرض دار اپنا قرض واپس کرنے لگا تو اس وقت ایک کلو گندم کی قیمت دو روپے ہوگئی تھی تو اب بھی وہ صرف ایک کلو گندم واپس کرے گا، زیادہ نہیں کرے گا، باوجود یہ کہ ایک کلو گندم کی قیمت پانچ روپے سے کم ہوکر دو روپے ہوگئی ہے، اور اس مسئلہ میں تمام فقہاء متقدمین ومتاخرین کا اجماع ہے، فقہاء میں کوئی ایک بھی اس مسئلہ میں یہ نہیں کہتا کہ اس صورت میں جب کہ گندم کی مالیت کم ہوگئی ہے صرف ایک کلو گندم واپس کرنا قرض خواہ پر ظلم ہے اس لئے گندم کی قیمت میں جتنی کمی واقع ہوئی ہے اسی نسبت سے اضافہ کرکے قرض خواہ کو واپس کرے، یعنی ایک کلو کے بجائے اب قرض دار ڈھائی کلو گندم واپس کرے، اس لئے کہ ڈھائی کلو گندم کی مالیت اب وہی ہے جو قرض لیتے وقت ایک کلو گندم کی تھی۔

۲- تمام لوگوں کے نزدیک یہ مسلم ہے کہ قرضوں کی واپسی میں برابری کی شرط صرف سود سے بچنے کے لئے ہے اور حضور اقدس ﷺ نے اس مطلوبہ برابری کو ربا الفضل کی احادیث میں پوری تشریح کے ساتھ واضح فرمایا ہے۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ حضور اقدس ﷺ کے زمانے میں ہمارے پاس ہر قسم کی ملی جلی کھجوریں آیا کرتی تھیں۔ ہم (گھٹیا کھجور کے) دو صاع کو (بڑھیا کھجور کے) ایک صاع کے بدلے میں بیچ دیتے تھے، جب حضور ﷺ کو اس کی

اطلاع ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ دوصاع کھجور کو ایک صاع کھجور کے بدلے میں مت بیچو اور نہ دوصاع گندم کو ایک صاع گندم کے بدلے میں بیچو، اور ایک درہم کو دو درہم کے عوض مت بیچو (جامع الاصول لابن اثیر ۱/ ۵۴۶)، یہ بات حضور ﷺ کو معلوم تھی کہ جو کھجور دوصاع کے بدلے میں بیچی جائے گی وہ اس کھجور کے مقابلے میں زیادہ قیمتی ہوگی جو ایک صاع کے عوض بیچی جائے گی، لیکن اس کے باوجود حضور اقدس ﷺ اس پر راضی نہ ہوئے بلکہ مقدار اور ناپ میں مماثلت اور برابری کا حکم دیا اور قیمت کے فرق کا اعتبار نہیں کیا۔

حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب جامع الاصول کے حوالہ سے چند اور احادیث قلم بند فرمانے کے بعد تحریر فرماتے ہیں: مندرجہ بالا تمام احادیث اس بات کو واضح طور پر بیان کررہی ہیں کہ شریعت میں جو تماثل اور برابری معتبر ہے وہ مقدار میں برابری ہے، اموال ربویہ میں قیمت کے تفاوت کا بالکل اعتبار نہیں، یہ احکام اس صورت میں ہیں جب بیع نقد ہورہی ہو، اور اگر معاملہ قرض کا ہو جس میں اصل سود جاری ہوتا ہے اور جس میں ہر قسم کی زیادتی بلکہ زیادتی کے شبہ سے بھی بچنا ضروری ہے تو پھر اس میں قیمت کے تفاوت کا لحاظ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا......۔

قرآن وسنت کی روشنی میں یہ بات تمام فقہاء کے نزدیک مسلم ہے کہ قرض کی واپسی کے وقت مقدار میں یقینی مثلیت اور برابری شرط ہے، اٹکل اور اندازے سے واپسی کرنا جائز نہیں........بہر حال! مندرجہ بالا بحث سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ ''اشاریہ'' اپنے تمام مراحل میں اندازہ اور تخمین پر مبنی ہے، اور اگر کسی جگہ پر حساب بہت باریک بینی اور احتیاط سے بھی کی جائے تو بھی اس کے نتیجے کو زیادہ سے زیادہ تقریبی تو کہہ سکتے ہیں، یقینی اور واقعی پھر بھی نہیں کہہ سکتے، جب کہ اوپر احادیث کی روشنی میں یہ واضح ہو چکا ہے کہ قرضوں کی واپسی میں اٹکل اور اندازہ کی شرط لگانا شرعاً جائز نہیں، لہٰذا قرضوں کی ادائیگی کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کردینا کسی حال میں بھی جائز نہیں ....جب یہ مسئلہ پاکستان کی ''اسلامی نظریاتی کونسل'' کے

سامنے بھی پیش ہوا تو کونسل کے تمام ارکان بشمول علماء ومعاشیین سب نے اس بات پر اتفاق کیا کہ ''قرضوں کے قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ ربط'' کے نظریہ کی شریعت اسلامیہ میں کوئی گنجائش اور وجہ جواز نہیں ہے۔ اسی طرح خاص اسی موضوع پر ہونے والے سیمینار میں بھی بحث کی گئی جس کو اسلامی ترقیاتی بینک اور عالمی ادارہ برائے اسلامی اقتصادیات، اسلام آباد نے مشترک طور پر شعبان ۱۴۰۷ھ میں منعقد کیا تھا، اس سیمینار میں مختلف ممالک کے بہت سے علماء اور ماہرین معاشیات نے شرکت کی تھی۔ وہ قرارداد جس پر تمام شرکاء نے اتفاق رائے ظاہر کیا وہ مندرجہ ذیل ہے:

۱- کرنسی نوٹ تمام معاملات (مثلاً اس میں سود جاری ہونے اور زکوۃ واجب ہونے، بیع سلم اور مضاربت اور شرکت وغیرہ کے رأس المال بننے) میں نقدین یعنی دراہم اور دنانیر کی طرح ہیں۔ اور امام ابو یوسفؒ کا قول کہ اگر سکوں کی قیمت زیادہ ہوجائے یا کم ہوجائے، تو اس صورت میں قرض کی واپسی ادائیگی کے وقت نقدین کے تناسب سے سکوں کی قیمت واپس کرنا ضروری ہے۔ ان کا یہ قول کرنسی نوٹوں میں جاری نہیں ہوگا؛ اس لئے کہ یہ کرنسی نوٹ نقدین کے قائم مقام ہیں اور ان نقدین کی قیمت بڑھنے اور کم ہونے کا معتبر نہ ہونا متفق علیہ ہے۔

۲- سمینار میں حاضر تمام علماء نے اس بات کی توثیق کی ہے کہ سود اور قرض کی احادیث میں جو مثلیت اور برابری ضروری قرار دی گئی ہے وہ شرعی جنس اور قدر یعنی وزن، ناپ اور عدد میں برابری مراد ہے، قیمت میں برابری مراد نہیں۔ اور یہ بات ان احادیث کے ذریعہ پوری طرح واضح ہوجاتی ہے جو احادیث اموال ربویہ کے تبادلہ کے وقت عمدہ اور گھٹیا ہونے کے وصف کو غیر معتبر قرار دیتی ہیں، اسی پر امت کا اجماع ہے اور اسی پر عمل جاری ہے۔

۳- ذمہ میں ثابت شدہ دیون چاہے وہ کسی بھی قسم کے ہوں، ان کو قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ منسلک کردینا جائز نہیں؛ بایں طور کہ عاقدین عقد بیع یا عقد قرض کے وقت اس کرنسی کو جس کے ذریعہ عقد بیع یا عقد قرض کررہے ہیں، کسی سامان کے ساتھ منسلک کرکے یہ شرط ٹھہرائیں

کہ مدیون ادائیگی کے وقت اس سامان کی قیمت موجودہ کرنسی میں ادا کرے گا (فقہی مقالات از مفتی تقی عثمانی ۱/ ۱۵۳تا ۱۵۷ ملخصاً)۔

پنشن کو قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ وابستہ کرنا:

ب- پنشن کو قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ وابستہ کرنا جائز ہے، کیوں کہ پنشن شرعاً دین نہیں ہے، بلکہ مستاجر کی طرف سے ملازم پر تبرع واحسان ہے اور اس میں کوئی تبادلہ وبیع کی صورت نہیں ہورہی ہے، بلکہ پنشن کے نام پر ملازم کو جو بھی رقم ملے گی قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ ہوکر یا اس کے بغیر وہ تبرع واحسان ہوگی، چنانچہ حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ ایک سوال (پنشن کی بیع) کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

''ملازمت سے سبکدوشی پر تازیست ملازم کو رقم ماہانہ متعین کر کے بنام حق الخدمت دینا واجب نہیں، بلکہ تبرع ہے، جس پر جبر نہیں کیا جاسکتا، بلکہ اس کا دل چاہے دے نہ چاہے نہ دے۔ جس طرح ماہانہ رقم دینا تبرع ہے، جبر نہیں، اسی طرح یہ بھی اختیار ہے کہ اندازہ کر کے مجموعی رقم یکمشت دیدے۔ یہ درحقیقت احسان ہی کی ایک صورت ہے، اس میں اس لئے اصالۃً نہ بیع مالایملک ہے، نہ بیع مالیس عندہ ہے، نہ قمار ہے، نہ ربوا، لہذا یہ لین دین شرعاً درست ہے **''ونظیرہ بیع العرایا''** الخ (فتاوی محمودیہ ۱۶/ ۱۵۱، مکتبہ ادارہ صدیق ڈابھیل)۔

اجرتوں کو قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ منسلک کرنا:

ج- اجرتوں کو قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ وابستہ کرنے کے مسئلہ میں تفصیل ہے کہ اجرت جب تک قرض نہ بن جائے تب تک اس کا حکم قرضوں کے اشاریہ سے ربط والے حکم سے مختلف ہوگا، اور جب اجرت قرض بن جائے تو پھر اس کا حکم بھی وہی ہوگا جو قرضوں کے اشاریہ کے ساتھ وابستہ کرنے کا حکم ہے، یعنی ناجائز ہے۔

اجرت جب کہ دین نہ بنی ہو اور اس کو قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ وابستہ کیا جائے تو اس میں تین صورتیں ممکن ہیں، اور ان کا کیا حکم ہے؟ یہ سب تفصیل حضرت مفتی تقی عثمانی کے الفاظ میں حسب ذیل ہے:

اجرتوں کا قیمتوں کے اشاریہ سے ربط و تعلق:

جہاں تک اجرتوں کے قیمتوں کے اشاریہ سے ربط کا مسئلہ ہے، تو جب تک اجرت قرض نہ بن جائے، اس وقت تک اس کا حکم قرضوں کے ربط سے مختلف ہوگا، البتہ اجرت اگر قرض بن جائے تو اس صورت میں اس کا حکم بھی وہی ہوگا جو قرضوں کے ربط کا حکم ہے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ اجرتوں کے قیمتوں کے اشاریہ سے ربط کی تین صورتیں ممکن ہیں:

۱- پہلی صورت یہ ہے کہ اجرتیں اور تنخواہیں نوٹوں کے ذریعہ طے ہو جائیں کہ اتنی اجرت یا تنخواہ دی جائے گی اور متعاقدین یعنی مالک اور مزدور کے درمیان یہ معاہدہ ہو جائے کہ یہ تنخواہ ہر سال قیمتوں کے اشاریہ کی زیادتی کے تناسب سے بڑھتی رہے گی، مثلاً حکومت ایک شخص کو تین ہزار روپے ماہوار تنخواہ پر ملازم رکھے اور یہ معاہدہ کر لے کہ یہ تنخواہ ہر سال کے شروع میں قیمتوں کے اشاریہ میں زیادتی کے تناسب سے بڑھتی رہے گی۔ اس صورت میں اس ملازم کو ہر سال کے آخر تک ہر ماہ تین ہزار روپے ہی قبول کرنے پڑیں گے اور درمیان سال میں قیمتوں کے اشاریہ میں زیادتی کے تناسب کو نہیں دیکھا جائے گا۔ البتہ جب نیا سال شروع ہوگا تو اس وقت قیمتوں کے اشاریہ کو دیکھا جائے گا کہ ایک سال کے اندر اس میں کس تناسب سے زیادتی ہوئی، مثلاً قیمتوں کے اشاریہ میں پانچ فیصد کے تناسب سے زیادتی ہوئی تھی تو اس ملازم کی تنخواہ میں بھی اسی تناسب سے زیادتی کرنی ہوگی۔ لہذا نئے سال میں اس کی تنخواہ تین ہزار ایک سو پچاس روپے ہو جائے گی۔ یہ طریقہ بہت سے ممالک مثلاً پاکستان وغیرہ میں رائج ہے۔ اور اس قسم کے ربط کی شریعت میں کوئی ممانعت نہیں ہے، اس لئے کہ اس صورت کا حاصل یہ ہے کہ

دونوں فریق اجرتوں اور تنخواہوں میں ہر سال یا ہر چھ ماہ بعد ایک معین تناسب سے زیادتی پر متفق ہو گئے ہیں۔ اور یہ زیادتی کا تناسب اگر چہ عقد کے وقت تو فریقین کے علم میں نہیں ہوتا، مگر وہ پیمانہ معلوم ہے جس کی بنیاد پر تناسب کا تعین ہوگا؛ اس لئے زیادتی کی مقدار میں جو جہالت کا شبہ تھا وہ مرتفع ہو گیا۔ یا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر نئے سال کے شروع میں جس تناسب سے قیمتوں میں زیادتی ہوئی ہوگی، اسی تناسب سے اضافہ شدہ اجرت پر اس عقد اجارہ کی تجدید کی جائے گی، اور اس میں کوئی شرعی ممانعت نہیں ہے۔

۲- اجرتوں کے قیمتوں کے اشاریہ سے ربط کی دوسری صورت یہ ہے کہ اجرت کی تعیین نوٹوں کی ایک مقدار پر ہو جائے، لیکن عقد میں شرط کرلیں کہ مالک کے ذمہ یہ مقدار معلوم واجب نہیں بلکہ اس کے ذمہ وہ مقدار واجب ہوگی جو قیمتوں کے اشاریہ کی رو سے مہینہ کے آخر میں اس مقدار معلوم کے مساوی اور برابر ہوگی۔ مثلاً زید نے عمر کو ایک ماہ کے لئے ملازم رکھا اور یہ طے پایا کہ زید عمر کو مہینہ کے آخر میں قیمتوں کے اشاریہ کا لحاظ کرتے ہوئے اتنی رقم اجرت میں دے گا، جو موجودہ ایک ہزار روپئے کے مساوی ہوگی۔ چنانچہ قیمتوں کے اشاریہ میں ایک ماہ کے اندر دو فیصد کے تناسب سے قیمتیں بڑھ گئیں۔ تو اب زید مہینہ کے آخر میں عمر کو ایک ہزار بیس روپے (۱۰۲۰ روپے) ادا کرے گا؛ اس لئے کہ یہ ایک ہزار اور بیس روپے شروع مہینہ کے ایک ہزار روپے کے مساوی ہیں۔ لیکن جب مہینے کے آخر میں یہ طے ہو گیا ہے کہ تنخواہ ایک ہزار اور بیس روپے ہے تو اب یہ تنخواہ ہمیشہ کے لئے ایک ہزار اور بیس روپے ہے۔ تو اب یہ تنخواہ ہمیشہ کے لئے ایک ہزار اور بیس روپے رہے گی زیادہ نہ ہوگی، لہذا اگر مالک مہینے کے آخر میں یہ تنخواہ ادا نہیں کر سکا حتی کہ ایک مہینہ اور گزر گیا یا ایک سال گزر گیا اور اس نے تنخواہ ادا نہیں کی، تب بھی مالک کے ذمہ ایک ہزار اور بیس روپے واجب ہوں گے، قیمتوں کے اشاریہ میں زیادتی سے اس میں زیادتی نہیں آئے گی۔ مثلاً اگر اس میں عرصہ میں قیمتوں کے اشاریہ میں دس فیصد کے تناسب سے اضافہ ہو گیا

تو وہ ملازم یہ مطالبہ نہیں کر سکے گا کہ چونکہ قیمتوں کے اشاریہ میں دس فیصد کے تناسب سے اضافہ ہو چکا ہے اس لئے اب مجھے ایک ہزار بیس روپے پر دس فیصد کے حساب سے اضافہ کر کے اجرت دی جائے؛ اس لئے کہ عقد کے وقت ہی آپس کے اتفاق سے اجرت کے بارے میں یہ بات طے ہو چکی تھی کہ مہینے کے آخر میں جتنے روپے موجودہ ایک ہزار کے مساوی ہوں گے وہ دیئے جائیں گے، اور صرف اس کی تعیین کے لئے قیمتوں کے اشاریہ کو مدنظر رکھا جائے گا، لیکن جب مہینے کے آخر میں قیمتوں کے اشاریہ کی بنیاد پر ایک مرتبہ اجرت طے ہوگئی تو اب قیمتوں کے اشاریہ کا کام مکمل ہو چکا۔ اب اس کی ضرورت نہیں رہی اور اب وہ معین اجرت مالک کے ذمہ قرض ہوگئی، جس میں آئندہ نہ تو زیادتی ہو سکتی ہے اور نہ کمی واقع ہو سکتی ہے۔ قیمتوں کے اشاریہ میں چاہے کتنے بھی تغیرات واقع ہو جائیں۔

جہاں تک اس صورت کی شرعی حیثیت کا تعلق ہے تو میری رائے میں یہ بھی جائز ہے، بشرطیکہ قیمتوں کا اشاریہ اور اس کے حساب کا طریقہ فریقین کو اچھی طرح معلوم ہو تا کہ بعد میں لاعلمی کی بنا پر آپس میں جھگڑا نہ ہو جائے؛ اس لئے کہ یہاں دونوں فریق اس بات پر متفق ہیں کہ طے شدہ اجرت ایک ہزار روپے نہیں بلکہ قیمتوں کے اشاریہ کے اعتبار سے مہینے کے آخر میں جتنے روپے موجودہ ایک ہزار روپے کے مساوی ہوں گے وہ مالک پر دینے واجب ہوں گے، جس کو حساب کے ذریعہ نکالنے کا طریقہ دونوں فریق کو معلوم بھی ہے۔ لہذا اجرت کی مقدار میں اتنی جہالت جھگڑے کا سبب نہیں بنے گی اور یہ صورت بالکل اسی طرح ہے جیسے کہ ایک شخص نے کسی کو ملازم رکھا اور اجرت یہ طے کی کہ مہینے کے آخر میں دس گرام سونے کی جو قیمت ہوگی وہ مالک کے ذمہ ادا کرنی واجب ہوگی۔ جب مہینے کے آخر میں دیکھا تو دس گرام سونے کی قیمت دو ہزار روپے تھی تو خود بخود یہ طے ہو گیا کہ اجرت دو ہزار روپے ہے۔ اب اس کے بعد اس اجرت میں نہ تو زیادتی ہوگی اور نہ کمی ہوگی، چاہے سونے کی قیمت اس بعد زیادہ ہو جائے یا کم ہو جائے، اس سے

اجرت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

۳- اجرتوں کے قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ ربط کا تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اجرت تو روپے کی معین مقدار کے ذریعہ طے ہوجائے اور فریقین کے درمیان یہ شرط ہوجائے کہ وہ اجرت مالک کے ذمہ واجب ہوگی جو عقد اجارہ میں طے ہوئی ہے۔لیکن مالک جس دن یہ اجرت ادا کرے گا، اس دن قیمتوں کے اشاریہ میں جس تناسب سے اضافہ ہوا ہوگا، اسی تناسب سے وہ اجرت میں بھی اضافہ کر کے ادا کرے گا۔مثلاً ایک شخص نے کسی کو ایک ہزار روپے پر ملازم رکھا اور دونوں کے درمیان یہ طے ہوگیا کہ اجرت ایک ہزار روپے ہے۔لیکن مالک پر یہ ضروری ہوگا کہ جس دن وہ یہ اجرت ادا کرے گا، اس دن قیمتوں کے اشاریہ میں جس تناسب سے اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ ہوا ہوگا، اسی تناسب سے وہ بھی ایک ہزار روپے میں اضافہ کر دے گا۔لہذا مالک نے اگر یہ اجرت مہینے کے آخری دن میں ادا کی اور اس روز قیمتوں کے اشاریہ میں دو فیصد کے تناسب سے اضافہ ہو چکا تھا، تو اب مالک بھی دو فیصد کے تناسب سے اضافہ کر کے ایک ہزار اور بیس روپے ادا کرے گا۔اور اگر مالک نے یہ اجرت ایک سال کے بعد ادا کی اور اس وقت تک قیمتوں کے اشاریہ میں دس فیصد کے تناسب سے اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ ہو چکا تھا تو اب مالک بھی دس فیصد کے تناسب سے اضافہ کر کے گیارہ سو روپے ادا کرے گا۔

میری رائے میں اس کا شرعی حکم قرضوں کے قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ ربط کی طرح ہے، جو کہ شرعاً جائز نہیں، جیسا کہ ہم تفصیل سے پیچھے بیان کر چکے ہیں الخ (فقہی مقالات از حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب ۱/ ۴۷ تا ۴۸)۔

۴- نوٹوں کی مالیت کو سونے یا چاندی میں طے کرنا:

قرض میں دیئے جانے والے روپیوں کی مالیت کو سونے یا چاندی میں طے کرنا اور بوقت ادائیگی اس قدر سونے یا چاندی کی قیمت کے مساوی نوٹوں کی ادائیگی پر معاملہ طے کرنا جائز

نہیں ہے، کیوں کہ یہ ربا کی صورت ہے۔ کرنسی نوٹ ایک جنس ہے اور اس کی اسی جنس کی شکل میں ادائیگی برابر کے اصول پر ہی ہونی چاہئے۔ پھر جو صورت پیش کی گئی ہے اسے فقہی نقطۂ نظر سے دیکھئے تو ثمن کا تبادلہ سونے کی مقدار سے نسیئۃً ہے اور پھر سونے کی مقدار کو ثمن کی شکل میں اضافہ کے ساتھ حاصل کرنا ہے، اس لئے اس کے جواز کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ ادھار فروخت کا معاملہ بھی اسی طرح (ناجائز) ہے۔ رہا مہر کا معاملہ تو مہر سونے یا چاندی ہی کی شکل میں کیوں نہیں طے کر لیا جاتا؟ اس تکلف کی آخر کیا ضرورت ہے کہ نوٹوں میں مہر مقرر کیا جائے اور سونے یا چاندی میں اس کی مالیت طے کی جائے اور پھر وصولیابی کے وقت سونے یا چاندی کی قیمت کے مساوی نوٹ حاصل کر لئے جائیں۔ سیدھی بات یہی ہے کہ اس چکر میں پڑے بغیر سونے یا چاندی کی مقدار مہر میں مقرر کی جائے۔ عورت چاہے تو ادائیگی کے وقت اس کی قیمت بازار کے نرخ میں وصول کر سکتی ہے، اس میں نہ شرعاً کوئی حرج واقع ہوتا ہے اور نہ عورت خسارہ میں رہتی ہے، نیز مرد پر بھی کوئی زائد بار نہیں پڑتا۔

خلاصۂ بحث:

قرض، مہر اور ادھار خریداری کے ثمن کے روپیوں کو عقد کے وقت یا عقد کے بعد قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ وابستہ کرنا جائز نہیں ہے، اور پنشن چوں کہ دین نہیں ہے، بلکہ تبرع ہے، لہذا اس کو قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ وابستہ کرنا جائز ہے، اور اجرت اگر دین بن چکی ہو تو اس کا حکم دیون کی طرح ناجائز ہے، اور اگر اجرت دین نہیں بنی ہے تو اس میں تفصیل ہے۔ قرض، مہر اور ادھار خریداری کے ثمن کے نوٹوں کی مالیت سونے یا چاندی میں طے کرنا اور بوقت ادائیگی اسی قدر سونے یا چاندی کی قیمت کے مساوی نوٹوں کی ادائیگی پر معاملہ طے کرنا جائز نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

نوٹوں کی شرعی حیثیت

مولانا عبدالتواب اناوی ☆

الحمدللہ رب العلمین والصلوۃ والسلام علی رسولہ الکریم اما بعد۔

یہ بات اپنی جگہ حقیقت پر مبنی ہے کہ کاغذی نوٹوں کی اپنی ذاتی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ ساتھ ہی ہم نے یہ بھی تسلیم کرلیا ہے کہ وہ زر خلقی تو نہیں، بلکہ مشابہ زر خلقی ہوکر زر اصطلاحی وقانونی کا درجہ رکھتا ہے، اور معاملات کی دنیا میں اس کی حیثیت ثمن کی ہے۔

اور یہ بات بھی اپنی جگہ پر مسلم ہے کہ موجودہ زر اصطلاحی کی حیثیت بین الاقوامی سطح پر گھٹتی بڑھتی رہتی ہے اور مشاہدہ یہی ہے کہ اکثر افراط زر کی وجہ سے کاغذی نوٹوں میں کمی ہی واقع ہوتی ہے اور کبھی کبھار بڑھ بھی جاتی ہے، جیسا کہ اخبار وغیرہ میں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔

اس صورت حال میں ان حضرات کے درمیان جن کے یہاں ہفتہ عشرہ یا ماہ دوماہ کے لئے قرض وغیرہ کے معاملات ہوتے ہیں تو ان کے یہاں کسی نوع کا کوئی احساس پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن وہ حضرات جن کے درمیان دو چار دس سال بلکہ اس سے بھی زیادہ مدت تک کے لئے معاملات ہوتے ہیں، تو عموماً ایسی صورت میں لین دین کے نوٹوں کی قوت خرید میں ایک بڑی حد تک تفاوت نظر آتا ہے۔ اب اس تفاوت کو دیکھ کر بسا اوقات متعاقدین بر بناء عقد تو کچھ نہیں کہتے لیکن دلوں میں اس کا احساس ضرور پیدا ہوتا ہے۔ جس کا اثر عموماً ظاہر یہ ہوتا ہے کہ آدمی کسی کو

☆ جامعہ اسلامیہ بانگر مئو، اناؤ۔

قرض دینے، اپنی رقم کسی پر زیادہ مدت تک کے لئے چھوڑنے، اور اسی طرح بیوی شوہر کے نادار ہونے کے باوجود اپنے حق مہر کے مطالبے کو کچھ لمبے زمانے تک چھوڑے رکھنے کو گوارہ نہیں کرتی۔ اسی طرح اور بہت سی خرابیاں معاشرہ میں پیدا ہوتی ہیں۔

بہرحال شرعی نقطۂ نظر سے ہم آہنگی برقرار رکھتے ہوئے ان غلط احساسات کو کس طرح دور کیا جاسکتا ہے اس پر نظر کی ضرورت ہے۔

شریعت اسلامیہ کا قرض کے بارے میں خواہ قرض کسی بھی نوع کا ہو اور معجل المطالبہ ہو یا مؤخر المطالبہ واضح موقف ہے۔

مثلاً: "**القروض يجب في الشريعة الاسلامية أن تقضى بأمثالها**" یعنی شریعت اسلامیہ میں تمام طرح کے قرضوں کی ادائیگی ان کے مثل سے کرنا واجب ہے (بحوث فی قضایا فقهية معاصرة ۱۷۴/۱ کراچی)۔

"**الديون تقضى بأمثالها**" یعنی تمام دیون اپنے مثل سے ادا کئے جائیں گے (الاشباہ والنظائر الفن الثانی/۱۵۶)۔

(رد المحتار کتاب الایمان باب الیمین فی الصرف والقتل وغیر ذلک، مطلب الدیون تقضی بأمثالها ۸۴۸/۳)۔

اکابر علماء کے یہاں بھی اس باب میں کچھ اسی طرح کے فتاوی نظر آتے ہیں۔

چنانچہ حضرت مولانا مفتی محمود حسنؒ فرماتے ہیں: اب سے ۱۴، ۱۵ برس پہلے جتنے نوٹ قرض لئے تھے اتنے ہی نوٹ واپس کرنے کا حکم ہے (فتاوی محمودیہ ۴۰۶/۱۶، باب القرض)۔

ایک جگہ فرماتے ہیں: اگر سو کا نوٹ لیا تھا تو سو کا نوٹ واپس کردے، بری الذمہ ہوجائے گا، اس کی گرانی سے اس پر اثر نہ ہوگا، جن کو نوٹ قرض دیا ہے ان سے نوٹ ہی واپس لینے کا حق ہے (فتاوی محمودیہ ۴۰۷/۱۶، باب القرض)۔

صاحب تنویر الابصار قرض کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "**هو عقد مخصوص يرد على دفع مال مثلي لآخر ليرد مثله**" (تنویر الابصار مع الدر المختار، باب المرابحہ والتولیۃ فصل فی القرض، شامی ۵/۱۶۱)۔

یعنی قرض ایسا عقد مخصوص ہے جو وارد ہوتا ہے اموال مثلیہ کے دینے پر دوسرے کے لئے کہ وہ اسی کا مثل واپس کرے۔

نوٹ، سکہ، درہم، دنانیر، یہ سب کے سب مثلیات میں سے ہیں اور مثلیات میں مثل ہی واپس کرنا مشروع ہے، لہذا ان کی ادائیگی کو قیمتوں کے ساتھ وابستہ کرنا کئی وجہوں سے درست معلوم نہیں ہوتا۔

(۱) سنن ابو داؤد میں ہے:

"**عن ابن عمر رضي الله تعالى عنهما قال: كنت أبيع الابل بالبقيع، فأبيع بالدنانير وآخذ الدراهم وأبيع بالدراهم و آخذ الدنانير، آخذ هذه من هذه وأعطى هذه من هذه، فأتيت رسول الله ﷺ، و هو في بيت حفصة رضي الله عنها فقلت: يا رسول الله ﷺ رويدك، أسئلك إني أبيع الإبل بالبقيع، فأبيع بالدنانير وآخذ الدراهم وأبيع بالدراهم وآخذ الدنانير، وآخذ هذه من هذه وأعطى هذه من هذه، فقال رسول الله ﷺ: لا بأس أن تأخذ بسعر يومها ما لم تتفرقا و بينكما شيئ**" (سنن ابو داؤد کتاب البیوع، باب فی اقتضاء الذهب من الورق ۲/۱۲۰ ملتان)۔

دیکھئے اگر دیون کو اشیاء کی قیمتوں سے وابستہ کردیا جائے تو مذکورہ حدیث شریف کی مخالفت لازم آئے گی، کیوں کہ آپ ﷺ نے یہاں پر جو بات ارشاد فرمائی ہے وہ صرف معاملہ کے دن سے ہی وابستہ فرمائی ہے اور اسے مزید مجلس اور متعاقدین کی رضامندی سے بھی مقید کیا

ہے اور صورت مسئولہ میں تو حدیث کا مقصود ہی مفقود ہوتا نظر آتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بعض اکابر فقہاء کرام نے معاملۃ الیوم میں بھی اس طرح کی صورتوں کو درست قرار نہیں دیا ہے، بذل المجہود میں مذکورہ حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے صاحب کتاب لکھتے ہیں: ''فذهب أكثر أهل العلم إلى جوازه ومنع من ذلك أبو سلمة بن عبد الرحمن وأبو شبرمة وكان ابن أبي ليلى يكره ذلك إلا بسعر يومه، ولا يعتبر غيره السعر ولم يبالوا كان ذلك بأغلى أو أرخص من سعر اليوم'' (بذل المجہود: کتاب البیوع، باب في اقتضاء الذهب من الورق ۵/ ۲۴۶، امدادیہ-ملتان)۔

اکثر اہل علم حضرات نے سعر یوم پر معاملہ کو جائز قرار دیا ہے، البتہ ابوشبرمہ اور ابوسلمہ بن عبدالرحمن نے اس سے منع فرمایا ہے اور ابن ابی لیلی تو معاملۃ الیوم کے سعر سے ہٹ کر معاملہ کرنے کو مکروہ قرار دیتے تھے، اور معاملۃ الیوم کے سعر کے علاوہ فقہاء کے یہاں کسی بھی سعر کا کوئی اعتبار نہیں ہے؛ خواہ وہ معاملۃ الیوم کے سعر سے بڑھا ہوا ہو یا گھٹا ہوا۔

۲- دیون کو اشیاء کی قیمتوں سے وابستہ کرنے میں نزاع ہے؛ کیوں کہ ایک شئی کی قیمت ایک ہی بازار میں مختلف سمتوں کے اعتبار سے الگ الگ ہوتی ہے، مثلاً ایک ہی شئی کارخانے میں بہت کم قیمت کی ہوتی ہے، فٹ پاتھ پر کچھ اس سے زیادہ، پھر چھوٹی بازار میں اس کی قیمت کچھ اور، بڑی بازار میں کچھ اور، پھر شوروم میں جاکر وہی شئی ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھنے والے شخص کے لئے ناقابل خرید بن جاتی ہے۔

۳- اگر دیون کو اشیاء کی قیمتوں سے جوڑ دیا جائے تو لوگوں کے درمیان سود و ربا کا دروازہ وا ہو جائے گا اور لوگ بلاجھجک سودخوری میں مبتلا ہو جائیں گے، اور پھر وبا سے بچنا بچانا مشکل ترین امر ہوگا۔

البتہ اگر مہر، تنخواہ، قرض اور ادھار فروختگی میں ہر ایک کے مدمقابل کو مثلاً مہر کے

مدمقابل قیمت ملک بضع، تنخواہ کے مدمقابل اجرت عمل، ادھار فروختگی کے مدمقابل ثمن مبیع اور قرض میں واپسی قرض کوسونا یا چاندی میں بمعاملہ ثانی تبدیل کردیا جائے پھر بوقت ادائیگی وہی مبدولہ شئی خواہ سونا ہو یا چاندی یا اس کی بوقت ادا قیمت ادا کی جائے تو درست معلوم ہوتا ہے۔ لیکن پنشن میں چوں کہ اس کا کوئی مدمقابل معلوم نہیں ہوتا ہے اس لئے اس میں یہ صورت بھی متی نظر نہیں آتی۔

رہی بات یہ کہ ایسے اشاریہ جن کے ذریعہ ادائیگیوں میں انضباط ممکن ہوتو چاندی سونا کے علاوہ چوں کہ کوئی دوسری چیز ثمن خلقی نہیں ہے اس لئے اور اس لئے بھی کہ دوسری چیزوں میں تنازع کی اتنی صورتیں ہیں کہ جن سے بچنا مشکل ترین امر ہے، لہذا سونا چاندی کے علاوہ دوسری چیزوں سے اس طرح کا معاملہ مفضی الی النزاع ہی رہے گا۔

اور ایسے معیار مقرر کرنا جن کی بنیاد دقیق فنی اصولوں پر ہو وہ عوام الناس میں مفضی الی النزاع ہوکر حضرات اہل علم اور ارباب افتا کے لئے مواضع تہمت، نیز ابواب ربا کے کھولنے میں معین ومددگار ثابت ہوں گے۔

چوں کہ نوٹ مثلیات میں سے ہیں لہذا ان کی قوت خرید گھٹے یا بڑھے، لین دین میں کسی بھی طرح کی زیادتی ہوگی تو وہ یقیناً ربا ہوگی، اور دیون کی قیمتوں سے اشاریہ قائم کیا جائے یا اسے دقیق فنی اصولوں پر منطبق کیا جائے بہر حال نزاع وفساد کا باعث رہے گا اور عوام الناس کو اس سے سود لینے اور دینے کا ایک جائز راستہ ملے گا؛ کیوں کہ عوام الناس اتنی باریکیوں میں نہ جائیں گے اور نہ ہی ان کے اندر دقیق فنی اصولوں کو سمجھنے اور ان پر عمل کرنے کی صلاحیت ہی ہے، اس لئے وہ سیدھے سیدھے ہر کمی وزیادتی کو جائز سمجھتے ہوئے معاملات کریں گے۔ اس لئے دیون کو نہ قیمتوں سے وابستہ کیا جائے نہ اشاریہ کا قیام ہو اور نہ ہی اسے دقیق فنی اصولوں پر منطبق کیا جائے؛ بلکہ انہیں اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے اور جس طرح معاملات دیون ہو رہے ہیں ہونے

دئے جائیں...............البتہ پنشن یا اس کے علاوہ کوئی دوسری چیز جن کا کوئی مد مقابل نہ ہو مثلاً انعام وغیرہ کے علاوہ مثلاً مہر، قرض وقت پر نہ دی جانے والی تنخواہ، ادھار فروختگی وغیرہ جن کا مد مقابل ہو، پہلے معاملے کے بعد دوسرا معاملہ کما حقہ چاندی یا سونے سے ان کی اپنی اپنی قیمت و کمیت کے اعتبار سے کی جائے تو درست معلوم ہوتا ہے۔

۲-نوٹوں کی شکل میں قرض دیتے وقت یا مہر کے تقرر کے وقت یا ادھار فروختگی کے وقت طرفین واجب الاداء نوٹ کی مالیت سونے یا چاندی میں طے کرلیں اور بوقت ادائیگی اسی قدر سونے یا چاندی کی قیمت کے مساوی نوٹوں کی ادائیگی عمل میں آئے، یہ صورت کئی وجہوں سے درست معلوم نہیں ہوتی۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ قرض وغیرہ میں یہاں لئے دئے جارہے ہیں کاغذی نوٹ اور معاملہ ہو رہا ہے چاندی یا سونے کا، یہ کسی بھی طرح جائز نہیں ہوسکتا، اگر اس کو درست مان لیا جائے تو ربا کا دروازہ کھل جائے گا جس کا بند کرنا محال ہوگا؛ کیوں کہ یہاں پر چاندی اور سونے کا معاملہ موہوم ہوگا اور نوٹوں کا معاملہ معقود ہوا، اور نوٹ مثلی ہیں جن کی ادائیگی مثل سے ہونی چاہئے مگر معاملہ موہوم کی وجہ سے مثل کی ادائیگی زیادتی کے ساتھ ہوگی اس لئے اس کے جواز سے تو کھلم کھلا ربا کا جواز ثابت ہوگا، حالانکہ فقہاء کرام کی تشریحات مثلیات کے سلسلے میں بہت واضح طور پر موجود ہیں۔

"رجل استقرض من آخر مبلغا من الدراهم وتصرف بها ثم غلي سعرها فهل عليه ردها مثلها؟ الجواب نعم، ولا ينظر إلى غلاء الدراهم ورخصها" (تنقیح الفتاوی الحامدیۃ: باب القرض ۱/ ۲۹۴، رشیدیہ)۔

(صاحب تنقیح الفتاوی لکھتے ہیں کہ ایک شخص نے کسی سے ایک متعین مقدار دراہم قرض لیے اور ان کو خرچ کر ڈالا پھر ان کا بھاؤ بڑھ گیا وہ کیا تو شخص جتنے دراہم قرض میں لئے تھے

اتنے ہی واپس کرے؟ جواب: جی ہاں، اس شخص نے جتنے درہم قرض میں لیے تھے اتنے ہی واپس کرے، درہم کے بھاؤ کے بڑھنے یا گھٹنے کی طرف بالکل نظر نہیں کی جائے گی)۔

اسی طرح علامہ کاسانی فرماتے ہیں:

''ولو استقرض فلوسا نافقة وقبضها ولم تكسد لكنها رخصت أو غلت فعليه رد مثله ما قبض بلا خلاف'' (بدائع الصنائع: کتاب البیوع، فصل فی حکم البیع ۷/ ۲۳۲، دارالکتب العلمیہ بیروت)۔

(اگر کسی نے فلوس نافقہ قرض لیے اور ان پر قبضہ کرلیا اور وہ کاسد نہیں ہوئے لیکن ان کا بھاؤ اتر گیا یا چڑھ گیا تو بالاتفاق اسی کا مثل واپس کرنا ہوگا جس پر اس نے قرض لیتے وقت قبضہ کیا تھا)۔

اور فتاوی کاملیہ میں ہے:

''سئلت عن رجل أقرض آخر مقدارا من الريال المحيدى وقت رواجه بثلاثين قرشا ثم رد المستقرض له مثل المقدار الذى استقرضه منه بعد أن نزل إلى عشرين قرشا فامتنع المقرض من قبوله وطلب منه صرفها على سعر ثلاثين قرشا فهل ليس له ذلک ؟ فالجواب أنه ليس له الامتناع من قبول مثل مادفع.........وفي نتيجة الفتاوى ما نصه والمقبوض على وجه القرض مضمون بمثله وفيها نقلا عن جامع الفصولين والواجب فى القرض ردالمثل''

(الفتاوی الکاملیہ/ ۹۴، باب القرض، مطلب الواجب فی القرض ردالمثل۔ مکتبہ حقانیہ پشاور)۔

(ایک ایسے آدمی کے سلسلے میں سوال کیا گیا جس نے ایک آدمی کو مجیدی وقت کے چند ریال قرض دیے اس وقت مجیدی ریال کی قیمت ۳۰ قرش تھی جب قرض لینے والے نے قرض کی واپسی کا ارادہ کیا تو اس کی قیمت گھٹ کر بیس قرش ہی رہ گئی تھی، جب اسے لے کر قرض خواہ کے

پاس گیا تو اس نے اسے لینے سے انکار کردیا بلکہ پورے تیس قرش کا مطالبہ کیا، تو کیا اس کے لئے یہ مطالبہ درست نہیں ہے؟ جواب یہ ہے کہ جو کچھ اس کو دیا جارہا ہے اس کو لینے سے اسے انکار کا حق نہیں ہے اسے اتنا ہی لینا ہوگا، اور تنقیح الفتاوی میں ہے: وہ قبضہ جو قرض کے طور پر ہوا ہے اس کا ضمان اسی کے مثل سے دیا جائے گا۔ اور اسی میں جامع الفصولین سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ قرض میں مثل کا لوٹانا واجب ہے)۔

اب رہی بات یہ کہ قرض میں جو چیز دی گئی ہے وہ مثلی ہے تو اس کا مثل ہونا کس اعتبار سے ہوگا آیا کیفیت اور کمیت کے اعتبار سے یا کیل ووزن کے اعتبار سے، یا پھر قیمت کے اعتبار سے، ظاہر ہے کہ پچھلی توضیحات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ یہ مثل جس کو رد المثل کہا جارہا ہے یہ مقدار و کیفیت اور کمیت کے اعتبار سے ہے نہ کہ قیمت و مالیت کے اعتبار سے۔

چنانچہ بحوث فی قضایا فقہیہ میں ہے:

”والذی یتحقق من النظر فی دلائل القرآن والسنة ومشاهدة معاملات الناس إن المثلیة المطلوبة فی القرض هی المثلیة فی المقدار والکمیة دون المثلیة فی القیمة والمالیة“ (بحوث فی قضایا فقہیہ معاصرہ ۱۷۴، دارالعلوم کراچی)۔

(قرآن وحدیث کے دلائل اور لوگوں کے معاملات پر غور وفکر اور نظر کر لینے کے بعد جو چیز متحقق ہوتی ہے وہ یہی ہے کہ قرض میں جو مطلوب مثل ہے وہ مثل مقدار وکمیت ہے نہ کہ مثل قیمت و مالیت)۔

مذکورہ عبارات دلالت کرتی ہیں کہ دیون جب کہ مثلی ہوں تو بہر صورت مثل ہی کی واپسی ہوگی کمی زیادتی کی گنجائش ہرگز ہرگز نہیں ہوسکتی۔

البتہ صورت مسؤلہ میں عاقدین (خواہ وہ مہر سے متعلق ہو یا ادھار فروختگی سے متعلق یا ان کا تعلق قرض سے ہو) باہم یہ طے نہ کریں کہ واجب الاداء نوٹوں کی مالیت سونے یا چاندی

(متعینہ) میں ادا کی جائے گی، بلکہ اتنے نوٹوں کے بقدر سونا یا چاندی پر عقد کیا جائے۔ مثلاً ایک آدمی ایک لاکھ روپیہ دس سال کی مدت کے لئے قرض چاہ رہا ہے تو اس کو ایک لاکھ روپیہ دے کر یہ نہ کہا جائے کہ آج کی تاریخ میں ایک لاکھ روپیہ کا دس تولہ سونا ہے اور ہم آپ کو گویا دس تولہ سونا دے رہے ہیں لہذا جب آپ واپس کریں گے تو ہم آپ سے دس تولہ سونا یا اس وقت جو دس تولہ سونا کی قیمت ہوگی وہ لیں گے؛ بلکہ براہ راست اس کو ایک لاکھ روپیہ کا جو بھی ہو رہا ہو سونا یا چاندی دے دی جائے اور کہہ دیا جائے کہ آپ کو قرض میں یہ سونا یا چاندی دی جا رہی ہے لہذا واپسی میں بھی آپ یہی مقدار سونا یا چاندی یا اس وقت جو اس متعینہ مقدار سونا یا چاندی کی قیمت ہو اس کو ادا کریں گے۔

اسی طرح مہر اور ادھار فروختگی یا ادھار خریداری میں بھی یہ صورت اختیار کی جا سکتی ہے۔ رہی بات یہ کہ قرض اور ادھار فروختگی میں تو مال موجود ہے وہاں تو آسانی سے یہ صورت ہو سکتی ہے لیکن مہر میں تو بسا اوقات متعاقدین میں سے کسی کے پاس اتنی وسعت نہیں ہوتی بلکہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ روزانہ کے اخراجات آمدنی پر بھاری ہوتے ہیں اس صورت میں یہ صورت کس طرح ممکن ہوگی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایسی صورت میں ہم بلا واسطہ سونا یا چاندی ہی پر کیوں نہ عقد کریں کہ تمام بکھیڑوں سے نجات رہے۔ مذکورہ صورت تو صرف درمیان میں چونکہ نوٹوں کا واسطہ آ گیا اس لئے ہے، ورنہ حق بات تو یہ ہے کہ جس صورت میں بھی بلا واسطہ چاندی یا سونے پر عقد کیا جائے وہاں ان تمام نقطوں اور بحثوں کی ضرورت ہی نہیں ہے، معاملہ بالکل صاف اور ستھرا ہے، قرض کی بابت ایک شخص نے کہا بھائی اتنی چاندی قرض دیدے، اس نے کہیں سے بھی لا کر دے دی، بلا تامل اس کی ادائیگی اسی مقدار چاندی سے ہوگی خواہ کبھی بھی ہو یا اتنی مقدار چاندی کی اس وقت جو قیمت ہوگی وہ ادا کی جائے گی۔

اسی طرح کسی نے کہا کہ میں اپنا یہ سامان اتنی مقدار چاندی یا اتنی مقدار سونے میں

فروخت کرتا ہوں مشتری نے کہا میں نے آپ کا یہ سامان اتنی مقدار چاندی یا اتنی مقدار سونے میں خریدا، معاملہ ہوگیا؛ خواہ نقد ہو یا ادھار جب بھی ادا کرے گا اتنی ہی مقدار چاندی یا سونا یا ان کی اس وقت یعنی بوقت ادا قیمت ادا کرنی ہوگی۔

ان مذکورہ صورتوں میں خواہ قرض ہو یا مہر یا ادھار یا کوئی اور چیز چاہے جب دی جائے کسی نوع کا نہ فساد ہوگا نہ کوئی نزاع اور نہ کسی کے دل میں رنج وشکوہ، اور شرعی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو ہر کسی کے یہاں بلاخلاف یہ صورتیں جائز ہیں کسی کا کوئی اختلاف نہیں۔

لہذا قرض میں دی جانے والی رقم اور اسی طرح مہر میں دی جانے والی رقم اور ادھار فروخت کئے جانے والے سامان کی قیمت اگر بلاواسطہ سونا یا چاندی ہی بنالیا جائے اور اسی پر عقد تمام ہو تو کسی کو بھی کسی نوع کا کوئی اختلاف نہ ہوگا۔ اور باتفاق جملہ ائمہ یہ صورت جائز ہوگی کہ اس کا عوض سونا یا چاندی یا ان کی قیمتیں ادا کی جائیں۔

بصورت دیگر اور سوال نامہ میں درج صورت مسئولہ میں اگر نوٹوں کو بلاعقد ثانی صرف سونا یا چاندی مان لیا جائے اور پھر اسی طے کرنے کے تحت بوقت ادائیگی سونا یا چاندی یا ان کی ادائیگی قیمتوں کے مطابق ہو تو یہ ازاسود ہوگا اور عوام الناس کے درمیان آندھی اور طوفان کی طرح سود وربا پھیل جائے گا، جس کا انسداد مشکل ہی نہیں ناممکن ثابت ہوگا۔

لہذا معاملہ کو صحت کی طرف لانے کے لئے ضروری ہوگا کہ عقد ثانی اس طرح کیا جائے کہ ان نوٹوں کو حقیقۃً سونا یا چاندی میں تبدیل کردیا جائے اور پھر ان پر دوبارہ، عقد ثانی کیا جائے، اور اس طرح مستقرض، شوہر اور مشتری کے ذمہ بجائے نوٹ کے سونا یا چاندی، لازم آئے پھر سونا یا چاندی یا ان کی مروجہ قیمتیں ادا کرنے میں کسی نوع کی کوئی قباحت باقی نہ رہے۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کرنسی کی شرعی حیثیت

مولانا نعیم اختر قاسمی ☆

یہ بات تو روز روشن کی طرح واضح ہے کہ کرنسی کی قوت خرید امتداد زمانہ کے ساتھ ہمارے جیسے ملک میں متاثر ہوتی رہتی ہے۔ خواہ ایسا ہونا افراط زر کے نتیجہ میں ہو جسے ہم روپیہ کی قدر میں کمی ہونے سے تعبیر کریں۔ یا بازار میں طلب ورسد کے توازن میں فرق پیدا ہونے کی وجہ سے ہو جسے ہم گرانی اور اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ کا نام دیں۔ بات ایک ہے یعنی کرنسی کی قوت خرید میں کمی واقع ہونا۔

البتہ یہ بات غور طلب ہے کہ ثمن کی قوت خرید میں کمی واقع ہونا یہ کوئی نو پیش آمدہ مسئلہ ہے یا زمانہ قدیم میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں؟ تاریخ بتاتی ہے کہ اشیاء کی قیمتوں میں اتار چڑھاؤ ہر دور میں ہوتا رہا ہے اور ایسا ہونا فطری ہے، بازار کبھی ایک حالت پر رہ ہی نہیں سکتا؛ کیوں کہ بازار دراصل طلب اور رسد کے مجموعہ ہی کا نام ہے جب طلب اور رسد کے درمیان توازن بگڑے گا تو اس کا اثر اشیاء کی قیمتوں پر یا بلفظ دیگر ثمن کی قوت خرید پر پڑے گا، اسی وجہ سے تو حدیث میں تلقی جلب (بخاری ۱/ ۲۸۹ - کتاب البیوع، نسائی ۲/ ۱۸۹)، بیع الحاضر للبادی (بخاری ۱/ ۲۸۹ - کتاب البیوع)، اور ذخیرہ اندوزی (لا یحتکر الا خاطئ: ابوداود ۲/ ۴۸۸)، وغیرہ سے منع کیا گیا ہے؛ کیوں کہ اس کے نتیجہ میں اشیاء کی قیمتوں میں گرانی آتی ہے جس میں خلق اللہ کو مشقت اور

☆ مدرسہ مصباح العلوم، کوپا گنج، مئو، یوپی۔

پریشانی ہوتی ہے۔

لیکن بایں ہمہ قرض کے معاملہ میں اسلامی نقطۂ نظر سے مساوات اور برابری کو ضروری قرار دیا گیا ہے، یعنی جو چیز جس نوعیت کی جتنی مقدار میں قرض لی گئی ہو اتنی ہی مقدار میں اس کا مثل ادا کرنا ضروری ہے، کمی بیشی سود ہے اور ادائیگی کے وقت سامان کی قیمتوں میں اتار چڑھاؤ اور ثمن کی قوت خرید میں کمی بیشی کو شرعاً وعرفاً نظر انداز کیا گیا ہے۔ کرنسی بھی چوں کہ ایک مثلی چیز ہے جس میں قرض جاری ہوتا ہے اس لئے اس کے اندر بھی اگر قرض ادا کیا جائے تو اس کے برابر نوٹوں کا ادا کرنا ضروری ہے۔ اس کی قوت خرید کے متاثر ہونے کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔

البتہ ایک اہم مسئلہ یہ پیش آتا ہے کہ پہلے دور میں ثمن کی قوت خرید میں کمی واقع ہونے کا سبب عموماً بازار میں طلب ورسد کے توازن کا متاثر ہونا تھا جب کہ موجودہ دور میں چونکہ مارکیٹ میں ثمن کے طور پر کاغذی نوٹوں کا چلن ہے، اس کی قوت خرید کے گرنے کا ایک بڑا اور اہم سبب افراط زر بھی ہے۔ یعنی نوٹوں کا زیادہ ہوجانا۔ بعض مرتبہ کسی ترقیاتی منصوبہ کی تکمیل کے لئے سرکاری خزانہ اس کی اجازت نہیں دیتا تو حکومت نوٹوں کی ایک بڑی مقدار چھاپ کر اپنے منصوبہ کو عملی جامہ پہناتی ہے۔ یہی افراط زر ہے۔ اس کا اثر مارکیٹ پر یہ پڑتا ہے کہ نوٹوں کی قوت خرید گر جاتی ہے اور اشیاء کی قیمتیں زیادہ ہوتی معلوم پڑتی ہیں۔ ایسا اس لئے ہوتا ہے؛ کیوں کہ یہ نوٹ دراصل قومی پیداوار کے ایک حصہ کی نمائندگی کرتے ہیں، لہذا جس قدر نوٹ زیادہ ہوتے جائیں گے قومی پیداوار کے حصوں میں اضافہ ہوتا جائے گا اور جو چیز جتنے زیادہ حصوں میں منقسم ہوگی اس کا حجم اتنا ہی چھوٹا ہوگا۔ نتیجتاً ایک کلوگرام کوئی سامان مثلاً اگر پہلے دس روپیہ کا ملتا تھا تو افراط زر کے بعد اب ایک کلوگرام ملنے کے بجائے اس سے کم ملے گا۔ ایک کلو گرام حاصل کرنے کے لئے دس روپے سے زیادہ ادا کرنا پڑیں گے۔ معلوم ہوا کہ افراط زر کے نتیجہ میں کرنسی کی قوت خرید بڑی حد تک متاثر ہوتی ہے بلکہ اس وجہ سے کرنسی کی قوت خرید میں

گراوٹ کی رفتار کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے۔ بیس پچیس سال پہلے ایک سو روپے میں جتنی مقدار میں سامان ملتا تھا آج اتنے کا آدھی مقدار تو کیا چوتھائی مقدار بھی حاصل ہونا مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو ممالک معاشی اعتبار سے مستحکم ہوتے ہیں اور جہاں افراط زر نہیں ہوتا وہاں کی کرنسی کی قوت خرید بڑی حد تک محفوظ رہتی ہے اور بین الاقوامی تجارتی معاملات میں اشیاء کی قیمتوں کا معیار اسی سے متعین کیا جاتا ہے، مثلاً امریکی ڈالر۔

اب اگر لوگ عام معاملات اور قلیل المیعاد قرضوں میں روپیہ کی قوت خرید میں ہونے والی کمی زیادتی کو گوارہ کر لیتے ہیں تو ضروری نہیں کہ طویل المیعاد قرضوں اور مؤخر مطالبات میں بھی اس بڑے نقصان کو گوارہ کرلیں کیوں کہ اس میں قرض خواہ کا ایک ایسا بدیہی نقصان ہے جس سے صرف نظر کرنا اولاً تو اسلام کے تقاضہ عدل کے خلاف، آیت قرآنی: ''هل جزاء الإحسان إلا الإحسان'' کے مغائر، اور حدیث نبوی: ''لا ضرر ولا ضرار'' (موطا مالک ص ۲۴۲- باب مالا یجوز من عتق المکاتب) کے منافی ہے۔ دوسرے اس کی وجہ سے طویل المیعاد قرضوں کا سرے سے دروازہ ہی بند ہو جائے گا جب کہ ترقیاتی سارے پروجیکٹ طویل المیعاد قرضوں ہی کی مرہون منت ہیں۔

چنانچہ قرض خواہ سے اسی ضرر کو دور کرنے کے لئے ماہرین معاشیات نے یہ تدبیر بتائی کہ طویل المیعاد قرضوں کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کردیا جائے۔

مگر جب شرعی نقطۂ نظر سے ہم اس کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ صورت دو وجہوں سے درست نہیں معلوم ہوتی:

پہلی وجہ یہ ہے کہ قیمتوں کا اشاریہ معلوم کرنے کے لئے دقیق فنی اصولوں اور پیچیدہ حساب وکتاب کا سہارا لینا پڑتا ہے جسے ماہرین معاشیات ہی صحیح طور پر سمجھ سکتے ہیں، عام آدمی کی سمجھ سے یہ اصول بالاتر ہیں، اور شریعت کسی ایسی چیز کو مدار نہیں بناتی جسے صرف مخصوص لوگ ہی

سمجھ سکتے ہوں۔آپ ﷺ کے ارشاد:''إنا أمة أمية لا نكتب ولا نحسب'' (بخاری ۱/ ۲۵۶ کتاب الصوم) کا یہی مفہوم ہے۔

دوسری اور اہم وجہ اس کے عدم جواز کی یہ ہے کہ اصول ربویہ میں جو برابری مقصود ہے اس کا قطعی اور یقینی ہونا ضروری ہے، اٹکل اور اندازہ سے برابری کرنا درست نہیں، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے بیع مزابنہ سے منع فرمایا ہے (بخاری ۱/ ۲۹۱ کتاب البیوع)، جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ درخت پر لگی ہوئی کھجور کی مقدار کا اندازہ کرکے اسے ٹوٹی ہوئی کھجور کے بدلہ بیچا جائے۔''هو بيع التمر على النخيل بتمر مجذوذ مثل كيله خرصا'' (ہدایہ ۳/ ۱۳ باب البیع الفاسد)۔

اس کی حرمت کی وجہ یہی ہے کہ ٹوٹی ہوئی کھجور کی مقدار تو وزن کے ذریعہ معلوم کی جا سکتی ہے مگر درخت پر لگی ہوئی کھجور کا اندازہ کرنے کا طریقہ تخمین اور اٹکل کے علاوہ کچھ نہیں۔ایسی صورت میں ربا کا شبہہ بہرحال باقی رہتا ہے؛ اسی لئے آپ ﷺ نے بیع مزابنہ کو علی الاطلاق ناجائز قرار دیا۔اب اس اصول کی روشنی میں جب ہم قیمتوں کے اشاریہ کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قیمتوں کا اشاریہ اپنے تمام مراحل میں ظن اور تخمین پر مبنی ہے، اگر کسی جگہ پر حساب بہت باریک بینی اور پوری احتیاط سے بھی کیا جائے تو بھی اس کے نتیجہ کو زیادہ سے زیادہ تقریبی کہہ سکتے یقینی اور واقعی نہیں کہہ سکتے؛ جب کہ مذکورہ حدیث کی رو سے واقعی مماثلت ضروری ہے۔لہذا قرض وغیرہ کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنے میں اگر ربا نہیں تو شبہ ربا ضرور ہے، جو ناجائز ہونے کے لئے کافی ہے۔

مسئلہ کے حل کی صورت:

اس مسئلہ کے حل کی ایک آسان صورت تو وہی ہے جو سوالنامہ میں بیان کی گئی اور جس میں شرعاً کوئی قباحت بھی نظر نہیں آئی اور وہ اسلام کے قانون عدل کے مغائر بھی نہیں معلوم ہوتی

کہ فریقین باہمی رضامندی سے کسی بھی مثلی چیز کو معیار متعین کر کے معاملہ کر سکتے ہیں۔ مثلاً زید ایک لاکھ روپئے قرض بکر کو یہ کہہ کر دے کہ آج جس قدر سونا ایک لاکھ روپے کا ملتا ہے ادائیگی کے وقت اسی قدر سونے کے بقدر نوٹ ادا کرنے ہوں گے۔ اگر قرض دار بکر اس کو قبول کرتا ہے تو اس کے جائز ہونے میں شبہ نہیں ہونا چاہئے۔ شامی کا ایک جزئیہ اسی مسئلہ سے متعلق ہے:

"وفي دعوى البزازية من النوع الخامس عشر عن فوائد الإمام أبي حفص الكبير: استقرض منه دانق فلوس حال كونها عشر بدانق فصارت ستة بدانق أو رخص وصار عشرون بدانق يأخذ منه عدد ما أعطى ولا يزيد ولا ينقص. قلت هذا مبني على قول الإمام وهو قول أبي يوسف أولا، وقد علمت أن المفتي به قوله ثانيا بوجوب قيمتها يوم القرض وهو دانق أي سدس درهم سواء صار الآن ستة فلوس بدانق أو عشرين بدانق" (ردالمحتار ۴/ ۲۴: کتاب البیوع)۔

(فتاوی بزازیہ میں ہے .... کہ اگر کسی سے ایک دانق (سدس درہم) کے بقدر فلوس قرض لیا جب کہ ایک دانق کے بدلہ دس فلوس ملتے تھے۔ پھر ایک دانق کے بدلہ چھ فلوس ملنے لگے۔ یا سستے ہو کر بیس فلوس ملنے لگے۔ تو بغیر کمی زیادتی کئے ہوئے جتنے فلوس دیئے تھے اتنے ہی واپس لے گا۔ میں کہتا ہوں کہ ایسا امام صاحب کے قول پر ہوگا جو کہ امام ابو یوسف کا پہلا قول ہے۔ اور تم جانتے ہو کہ مفتی بہ قول ان کا دوسرا قول یعنی قرض کے دن ان فلوس کی جو قیمت تھی یعنی دانق (سدس درہم) وہ واجب ہوگی؛ خواہ اب ایک دانق میں چھ فلوس ملیں یا ایک دانق میں بیس فلوس ملیں)۔

کیا یہ صورت باب ربا کو کھولے گی؟

یہ شبہ کرنا کہ یہ صورت باب ربا کو کھولنے کا ذریعہ بنے گی صحیح نہیں؛ کیوں کہ اس کا

مقصد فریقین کو ہونے والے نقصان سے بچانا ہے، حدیث میں بھی بعض مرتبہ اسی قسم کے ضرر سے بچاؤ کے لئے اس قسم کی صورت اختیار کرنے کی اجازت دی گئی۔ صحیحین کی روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک شخص کو خیبر کا عامل بنا کر بھیجا جب وہ واپس آیا تو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں کچھ عمدہ قسم کی کھجور پیش کی، آپ ﷺ نے دریافت کیا کہ کیا خیبر کی تمام کھجوریں ایسی ہی ہوتی ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم اس عمدہ کھجور کے ایک صاع کو گھٹیا کھجور کے دو صاع کے بدلے میں اور دو صاع کو تین صاع کے بدلے میں تبدیل کر لیتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایسا مت کرو بلکہ ہلکی کھجور کو پہلے دراہم کے عوض فروخت کر دو پھر ان دراہم سے عمدہ کھجور خرید لیا کرو۔

مذکورہ بالا حدیث میں غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اگر ردی کھجور کا تبادلہ عمدہ کھجور سے کرنا ہو تو چوں کہ اموال ربویہ میں مساوات ضروری ہے اور جید وردی کا اعتبار ساقط ہے تو برابری کی صورت میں ظاہر ہے کہ عمدہ کھجور دینے والا خسارہ میں رہے گا، اس کو خسارہ سے بچانے کی آپ ﷺ نے ایک تدبیر بتادی۔ تو اگر بتقاضائے عدل حدیث میں ایک تدبیر اختیار کرنے کی اجازت دی جارہی ہے اور وہ باب ربا کو کھولنے کا سبب نہیں بن رہی ہے تو مؤخر مطالبات کے معاملات میں بھی مذکورہ تدبیر اختیار کرنا باب ربا کو کھولنے کا ذریعہ نہیں بننا چاہئے۔

دوسری صورت: اس مسئلہ کے حل کی ایک اور صورت جیسا کہ مولانا عبید اللہ اسعدی صاحب نے بیان کی ہے یہ ہے کہ قرض دینے والا کسی غلہ وغیرہ کی قیمت طے کر کے اس کے حق میں بیع سلم یعنی ادھار خرید کا معاملہ کر کے طے شدہ مقدار کی قیمت دے دے اور ادائیگی کے موقع پر خواہ اصل سامان لے لے یا اسے قبضہ میں لے کر قرض لینے والے کے ہاتھ ہی بیچ ڈالے، یا اصل کی جگہ نقد یا جو چاہے بقدر مالیت لے لے۔ مالکیہ کے نزدیک سلم میں قبضہ سے پہلے خریدے ہوئے سامان کے اندر تصرف درست ہے (مجلہ فقہ اسلامی: کرنسی کی شرعی حیثیت/ ۸۶)۔

خلاصہ جوابات:

لہذا ان معروضات کی روشنی میں کرنسی نوٹوں کی حیثیت کے تعلق سے دونوں سوالوں کے جواب حسب ذیل ہوں گے:

۱- مؤخر مطالبات وغیرہ کی ادائیگی کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنا درست نہیں، کیوں کہ وہ ظن اور تخمین پر مبنی ہوتا ہے جب کہ اموال ربویہ میں تبادلہ میں قطعی مساوات ضروری ہے۔

۲- نوٹوں کی شکل میں معاملہ کرتے وقت طرفین اگر واجب الاداء نوٹ کی مالیت سونے چاندی وغیرہ میں طے کرلیں اور بوقت ادائیگی اسی قدر سونے یا چاندی کے مساوی نوٹوں کی ادائیگی عمل میں آئے تو یہ صورت درست ہے۔ واللہ اعلم۔

نوٹوں کی حیثیت-شریعت کی نظر میں

مفتی عبدالرحیم قاسمی ☆

۱-دیون اور اجرتوں وغیرہ کو قیمتوں کے اشاریہ سے جوڑنا:

حضرت مفتی تقی عثمانی دامت فیوضہم تحریر فرماتے ہیں: یہ بات طے شدہ ہے کہ اب نوٹ سونے کی نمائندگی نہیں کرتے، یہ خود ثمن عرفی ہیں اور فلوس کی طرح ہیں، ثمن عرفی اور فلوس کی اپنی ذاتی قدر کا اعتبار ہوتا ہے، ان کو ادائیگی میں سونے سے وابستہ نہیں کیا جاسکتا، یہاں بعض لوگ حضرت امام ابو یوسف کے مذہب سے استدلال کرتے ہیں، ان کا مذہب یہ ہے کہ ادائیگی سے پہلے فلوس کی قیمت بڑھ گئی یا کم ہوگئی تو ادائیگی قیمت کے اعتبار سے ہوگی۔لیکن یہ استدلال صحیح معلوم نہیں ہوتا، اس لئے کہ نوٹ اور فلوس میں فرق ہے، فلوس سونے چاندی سے مربوط ہوتے ہیں، فلوس کی قیمت سونے چاندی کی بنیاد پر ہی طے ہوتی تھی لہذا ان فلوس کی حیثیت دنانیر اور درہم کی ریزگاری کی طرح تھی اور فلوس کو دراہم و دنانیر کے ساتھ ایک خاص نسبت تھی، مثلاً یہ کہ ایک فلس چاندی کے درہم کا عشر (دسواں حصہ) ہے، بازار کی اصطلاح میں اس نسبت کے بدلنے کو ہی فلوس کی قیمت میں کمی بیشی سے تعبیر کرتے ہیں، ایسی صورت میں جب کہ فلوس سونے چاندی سے مربوط ہوں امام ابو یوسف فلوس کی قیمت کی ادائیگی کو ضروری قرار دیتے ہیں، نوٹوں کی صورت حال اس سے بالکل مختلف ہے، یہ سونے چاندی سے مربوط نہیں، یہ مستقل ثمن

☆ ناظم جامعہ خیر العلوم، نور محل روڈ، بھوپال۔

اصطلاحی ہیں، ان کی اپنی ایک قدر ہے جس کا سونے چاندی سے کوئی تعلق نہیں، پھر اس زمانے کے فلوس اور نوٹوں میں ایک اور فرق بھی ہے وہ یہ کہ فلوس کی قیمت معلوم کرنے کے لئے ایک واضح معیار سونے چاندی کا موجود تھا جس کو سامنے رکھ کر فلوس کی قیمت تحقیقی طور پر معلوم کی جاسکتی تھی لیکن اب نوٹوں کی قدر کا تخمینی اندازہ تو لگایا جاسکتا ہے قدر کا حقیقی علم نہیں ہوسکتا (اسلام اور جدید معیشت، ص ر ۱۱۱)۔

ادائیگیوں کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنے کا نظریہ پیش کیا جاتا ہے، اس نظریہ کی دلیل یوں دی جاتی ہے کہ نوٹ بذات خود کچھ نہیں، یہ سلۃ البضائع یعنی کچھ اشیاء کی ٹوکری کی قوت خرید کی نمائندگی کرتے ہیں لہذا جب کسی نے دوسرے کو کچھ نوٹ قرض دئے تو گویا اس نے اس کو سلۃ البضائع دی ہے جس کا طریقہ یہ ہے کہ ادائیگی کو قیمتوں کے اشاریئے سے وابستہ کیا جائے یعنی ادائیگی کے وقت نوٹوں کی اتنی مقدار زیادہ ادا کی جائے جو افراط زر کی شرح کے مساوی ہو مثلاً سو روپئے قرض دئے تھے اور ادائیگی کے وقت افراط زر میں دس فیصد اضافہ ہوا تو اب ایک سو دس روپئے ادا کئے جائیں۔

(یہ اشاریہ کے نظریہ کا خلاصہ ہے)، قیمتوں کا اشاریہ ایک تخمینی چیز ہے تحقیقی نہیں؛ اس لئے کہ اس میں کون سی اشیاء لینی ہے اس کا فیصلہ تخمینی ہے پھر ہر شئی کو جو وزن دیا جاتا ہے وہ بھی تخمینی، ہر شئی کی جو قیمت لی جاتی ہے وہ بھی تخمینی ہے (اسلام اور جدید معیشت ر ۱۰۹)۔

فقہی لحاظ سے یہ نقطۂ نظر بوجوہ غلط ہے:

پہلی وجہ تو یہ کہ نوٹ کی پشت پر کچھ مخصوص اور متعین اشیاء ہوتیں تو یہ کہا جاسکتا تھا کہ نوٹ دراصل سلۃ البضائع کی نمائندگی کرتا ہے لیکن سلۃ البضائع کوئی متعین چیز نہیں بلکہ اس سے حاصل ہونے والا فائدہ ہے، چنانچہ کسی کو نوٹ دینے کا مطلب سلۃ البضائع دینا نہیں بلکہ ایسا آلہ تبادلہ دینا ہے جس سے سلۃ البضائع خریدی جاسکتی ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اس نظریہ کا حاصل یہ ہے کہ ادائیگی میں مثلیت باعتبار قیمت حقیقیہ معتبر ہونی چاہئے صرف قیمت اسمیہ میں مثلیت کا اعتبار درست نہیں شرعی نقطہ نظر سے جائزہ لیا جائے تو بات اس کے برعکس ہے، شرعاً قرض کی ادائیگی میں مقدار میں مثلیت کا اعتبار ہے حقیقی قیمت میں مثلیت کا اعتبار نہیں، مثلاً کسی نے گندم قرض لی، جب واپسی کا وقت آیا تو وہ گندم کی اتنی مقدار ہی واپس کرے گا خواہ قیمت کم ہو یا زیادہ اس بات پر کہ اعتبار مقدار کا ہوتا ہے حقیقی قیمت کا نہیں۔ایک کافی واضح دلیل حضرت ابن عمرؓ کی حدیث ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ صحابیؓ بقیع میں اونٹ بیچا کرتے تھے، کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ بیع دراہم پر ہوتی تھی اور ادائیگی دنانیر میں ہوتی تھی اور کبھی بیع دنانیر میں ہوتی اور ادائیگی دراہم میں ہوتی، اس کے بارے میں آں حضرت ﷺ سے سوال کیا گیا تو آپ نے اس شرط کے ساتھ اجازت دی کہ ادائیگی کے دن کی قیمت کے مطابق ہو، اس سے معلوم ہوا کہ ذمے میں تو اسی چیز کی مقدار واجب ہوتی ہے جس پر بیع ہوئی تھی پھر ادا کے وقت اس دن کی قیمت کے لحاظ سے تبادلہ ہوسکتا ہے، معلوم ہوا کہ دیون میں جو چیز واجب ہوتی ہے وہ دیون کی مقدار ہے نہ کہ قیمت، اگر قیمت واجب ہوتی تو وجوب کے دن کی قیمت کے لحاظ سے تبادلہ ہوتا۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ اموال ربویہ میں مجازفۃ کو جائز نہیں قرار دیا اور ادائیگی کو قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ وابستہ کرنے میں مجازفۃ لازم آتی ہے؛ اس لئے کہ یہ بات پہلے واضح ہوچکی ہے کہ قیمتوں کا اشاریہ تخمینی ہوتا ہے، افراط زر کی صورت میں جیسے ادائیگی کو ضروری سمجھا جاتا ہے تو تفریط زر کی صورت میں ادائیگی میں کمی بھی ہونی چاہئے حالاں کہ اس کا کوئی بھی قائل نہیں۔البتہ جہاں کسی کرنسی کی قیمت اس حد تک گر جائے کہ کساد میں داخل ہوجائے تو اس کا حکم مختلف ہوسکتا ہے (اسلام اور جدید معیشت، ص ۱۱۲ - ۱۱۳)۔

فتاوی عالم گیری میں ہے:''قال مشائخنا لم یفتوا بجواز ذلک (التفاضل)

في العدالي والغطارفة لأنها أعز الأموال في ديارنا فلو أبيح التفاضل فيه ينفتح باب الربوا" (فتاویٰ عالمگیری ۱۰۶/۳) (ہمارے مشائخ نے عدالی اور غطارفہ سکوں میں زیادتی کے ساتھ لین دین کے جواز کا فتویٰ نہیں دیا؛ کیوں کہ وہ ہمارے ملک میں عزیز ترین مال ہیں، اگر اس میں زیادتی کے ساتھ لین دین کو جائز قرار دیا جائے تو سود کا دروازہ کھل جائے گا۔

سود کا دروازہ کھلنے کے اندیشے کی وجہ سے اس معاملہ کو ناجائز کہنا ضروری ہے۔ اور حضور ﷺ نے حساب وشمار کی باریکیوں سے بچا کر چاند کے دیکھنے اور نہ دیکھنے پر تاریخ کے شروع ہونے کی بنیاد رکھی اور اس کی وجہ یہ بتلائی کہ ہم امت امیہ ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ حساب اور کتاب کی باریکیوں میں عوام کو الجھانا شرعی نقطۂ نظر سے درست نہیں؛ لہذا ان کے لئے معاملات کے آسان طریقے بتلائے گئے ہیں۔

۲-مہر یا ادھار فروختگی کی سونے چاندی کی قیمت کے مساوی نوٹوں کے ذریعہ ادائیگی:

سونا اور چاندی کیوں کہ ثمن خلقی اور ثمن حقیقی ہیں لہذا قرض دیتے وقت یا ادھار فروختگی کے وقت یا مہر مقرر کرتے وقت سونا یا چاندی کی خاص مقدار مقرر کر دی جائے اور ادائیگی کے وقت اس مقدار کے سونا چاندی کی قیمت کے برابر روپے دے دئے جائیں تو یہ شرعاً جائز ہوگا جیسا کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نقیع میں اونٹ بیچتے تھے، کبھی ایسا ہوتا تھا کہ بیع دراہم پر ہوتی تھی اور ادائیگی دنانیر میں ہوتی تھی اور کبھی دنانیر میں بیع ہوتی تھی اور ادائیگی دراہم میں ہوتی تھی، اس کے بارے میں حضور ﷺ سے سوال کیا گیا تو آنحضرت ﷺ نے اس شرط کے ساتھ اجازت دی کہ ادا کے دن کی قیمت کے مطابق ہو (ابوداؤد شریف ۴۷۶/)۔

اور اگر روپے مقرر کئے تو متعینہ مقدار اتنی ہی تعداد کے روپے ادا کئے جائیں، مبسوط میں ہے:

''وإن اشترى فاكهة بدانق فلس والدانق عشرون فلسا فلم يرد الفلوس حتى غلت أو رخصت فعليه عشرون فلسا لأن بالغلاء والرخص لا ينعدم صفة الثمنية وصار هو عند العقد بتسمية الدوانق مسميا ما يوجد به من الفلوس وذلك عشرون ولو صرح بذلك القدر لم يتغير العدد بعد ذلك بغلاء السعر ورخصه فهذا مثله" (مبسوط ۱۴/۲۹)۔

(اگر ایک دانق کے برابر پیسوں میں میوہ خریدا، ایک دانق بیس پیسوں کے برابر ہوتا ہے پھر پیسے نہیں دیے یہاں تک کہ پیسے مہنگے ہو گئے یا سستے ہو گئے تو اس پر بیس پیسے ہی دینے لازم ہوں گے؛ کیوں کہ مہنگا اور سستا ہونے سے ثمنیت ختم نہیں ہوگی، اور دانق کو مقرر کرنے سے اس کے برابر پیسوں کی تعداد مقرر ہوگی اور وہ بیس پیسے ہیں، اگر اتنی مقدار پیسوں کی وضاحت کر دیتا تو پیسوں کے مہنگے اور سستے ہونے سے وہ تعداد نہیں بدلتی، اسی طرح یہ مسئلہ ہے)۔

''وإن استقرض دانق فلوس أو نصف درهم فلوس فرخصت أو غلت لم يكن عليه إلا مثل عدد الذي أخذ" (مبسوط ۱۴/۳۰) (اگر ایک دانق کے برابر پیسے قرض لیے یا آدھا درہم کے برابر پیسے قرض لیے پھر پیسے سستے ہو گئے یا مہنگے ہو گئے تو جتنی مقدار میں پیسے لیے تھے تو اتنی ہی تعداد میں واپس کرنا اس پر لازم ہوگا)۔

ہدایہ میں ہے: "قال مشائخنا لم يفتوا بجواز ذلك (التفاضل) في العدالى والغطارفة لأنها أعز الأموال في ديارنا فلو أبيح التفاضل فيه ينفتح باب الربو ثم إن كانت تروج بالوزن فالتبايع والاستقراض فيها بالوزن وإن كانت تروج بالعد فبالعد" (ہدایہ ۳/۱۰۹)۔

(ہمارے مشائخ نے عدالی اور غطارفہ سکوں میں زیادتی کے ساتھ لین دین کے جواز کا فتاوی نہیں دیا کیوں کہ وہ ہمارے ملک میں عزیز ترین مال ہیں اگر اس میں زیادتی کے ساتھ لین دین کو جائز قرار دیا جائے تو سود کا دروازہ کھل جائے گا۔ پھر یہ سکے اگر وزن سے رائج ہیں تو خرید فروخت اور قرض کا لین دین وزن سے ہوگا اور گن کر ان کے لین دین کا رواج ہو تو شمار کر کے اور گن کر ہی ان سکوں سے معاملہ کیا جائے گا)۔

کرنسی نوٹوں کے ذریعہ ادھار معاملات

مولانا ڈاکٹر سید اسرار الحق سبیلی ☆

۱- پچھلے بقایہ جات کی وصولی:

یہ صحیح ہے کہ یورپی ممالک کے مقابلہ ایشیائی ممالک کی کرنسیوں میں انضباط نہیں ہے، اور گاہے گاہے ان کی قدر میں کمی اور افراط زر ہوتا رہتا ہے، کم از کم ہر تین اور چھ ماہ میں اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ اور نوٹوں کی قدر میں کمی واقع ہوتی رہتی ہے، اس لئے حکومت اپنے ملازمین کے لئے ہر چھ ماہ میں گرانی بھتہ جاری کرتی ہے اور بعض محکمہ میں ہر تین ماہ میں گرانی الاؤنس (D.A) جاری کیا جاتا ہے، اسی طرح ایک سال میں اشیاء کی قیمتوں اور نوٹوں کی قدر میں نمایاں فرق نظر آتا ہے۔

لیکن پچھلے بقایہ جات کی وصولی کے لئے سرکاری اور عوامی سطح پر عملاً مقررہ رقم ہی کا مطالبہ کیا جاتا ہے، مثلاً کسی ملازم نے سرکار سے غلطی سے یا کسی اور وجہ سے گذشتہ پانچ سال تک ہر ماہ اپنی حقیقی تنخواہ سے ایک سو روپے زیادہ حاصل کئے تو اس کو آئندہ پانچ سال تک ہر ماہ اپنی تنخواہ سے ایک سو روپے ہی وضع کرانے پڑتے ہیں۔ روپے کی قدر کی کمی کی بنا پر اس سے زیادہ رقم کا مطالبہ نہیں کیا جاتا ہے۔ اسی طرح عوامی سطح پر کسی نے ایک لاکھ روپے قرض لئے یا ایک لاکھ روپے کا ادھار سامان خریدا، تو دائن ایک یا چند سال بعد ایک لاکھ روپے کی وصولی کو ہی کافی سمجھتا

☆ لکچرر گورنمنٹ جونیر کالج ظہیر آباد، اے، پی۔

ہے، اور ایک لاکھ کی قدر میں ہونے والی کمی کو برداشت کرتا ہے، کیوں کہ قرض یا ادھار دیتے وقت نوٹ کی قدر اور موجودہ قدر کا حساب لگانا ایک پیچیدہ عمل ہے، اور اس زیادہ رقم کی ادائیگی کا پہلے سے مقروض یا مدیون سے معاہدہ نہیں ہوا ہے اور وہ اس زائد رقم کی ادائیگی کے لئے تیار نہیں ہوسکتا، لہذا قرض یا ادھار دینے والا جس طرح چند سال اپنی رقم کے نفع سے محروم رہا، اسی طرح اس رقم کی قدر میں ہونے والی کمی کو بھی برداشت کرتا ہے (البتہ ایسے موقع پر بینک پچھلے سالوں کا حساب کرکے سود مقرر کرتا ہے)۔

اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہؒ کے قول پر عمل کیا جاسکتا ہے، علامہ برہان الدین مرغینانیؒ بیان فرماتے ہیں:

''ولو استقرض فلوسا نافقة، فكسدت، عند أبي حنيفة يجب مثلها لأنه إعارة وموجبه رد العين ومعنى الثمنية فضل فيه، إذ القرض لا يختص به''

(الہدایۃ: ۳؍۱۱۰ط: المکتبۃ الاشرفیۃ دیوبند)۔

(اگر رائج چلر پیسے قرض لئے گئے، پھر ان کا رواج ختم ہوگیا، تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ان کی مثل واجب ہوگی، کیوں کہ یہ اعارہ ہے، اور اس میں بعینہ اس چیز کو لوٹانا واجب ہوتا ہے، اور ثمنیت کی صفت اس میں زائد ہے، کیوں کہ قرض اس کے ساتھ مخصوص نہیں)۔

علامہ کاسانیؒ نے امام ابوحنیفہؒ کے ساتھ امام ابو یوسف کا بھی یہی قول ذکر کیا ہے:

''ولو اسقرض فلوسا نافقة وقبضها، فكسدت فعليه رد مثل ما قبض من الفلوس عددا في قول أبي حنيفة وأبي يوسف وفي قول محمد قيمتها''

(بدائع الصنائع ۴؍۴۹۶)۔

(اور اگر کسی نے رائج چلر پیسے قرض لئے اور اس پر قبضہ بھی کرلیا، پھر اس کا چلن ختم ہو گیا، تو امام ابوحنیفہ وابو یوسفؒ کے قول کے مطابق اتنی ہی تعداد میں قبضہ کردہ چلر پیسوں کی مثل

لوٹانا ضروری ہوگا، اور امام محمدؒ کے قول کے مطابق ان کی قیمت **لوٹانا** ضروری ہوگا)۔

آگے علامہ کاسانیؒ نے جو بات لکھی ہے اس سے کرنسی نوٹ کے مسئلہ پر صحیح روشنی ملتی ہے:

"ولو لم تكسد ولكنها رخصت أو غلت فعليه رد مثل ما قبض بلا خلاف، لما ذكرنا أن صفة الثمنية باقية" (بدائع الصنائع ۴/ ۳۹۶)۔

(اور اگر ان کا چلن ختم نہیں ہوا، لیکن وہ سستے یا مہنگے ہوگئے تو بلا اختلاف قبضہ کردہ پیسوں کی مثل کا **لوٹانا** ضروری ہوگا، جیسا کہ ہم نے بیان کیا کہ ثمنیت کی صفت باقی ہے)۔

اور علامہ حصکفیؒ نے لکھا ہے:

"استقرض من الفلوس الرائجة والعدالي، فكسدت، فعليه مثلها كاسدة، ولا يغرم قيمتها...... لما مر أنه مضمون بمثله، فلا عبرة بغلائه ورخصه" (الدر المختار مع رد المحتار ۷/ ۳۹۴ ط: دار الکتاب دیوبند)۔

(کسی نے مروج پیسوں اور عدالی درہم (عدال بادشاہ کی طرف منسوب درہم جس میں کھوٹ ہوا کرتا تھا) قرض لئے، پھر ان کا رواج ختم ہوگیا، تو اس کے لئے ویسے ہی غیر مروج پیسوں کا **لوٹانا** واجب ہوگا، ان کی قیمتوں کا تاوان اس سے وصول نہیں کیا جائے گا...... جیسا کہ گزر چکا کہ وہ مثل کا ضامن ہوگا، چنانچہ اس کے مہنگا یا سستا ہونے کا اعتبار نہیں ہوگا)۔

علامہ شامی نے اس پر اضافہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"وكذلك لو قال: أقرضني عشرة دراهم غلة بدينار، فأعطاه عشرة دراهم، فعليه مثلها، ولا ينظر إلى غلاء الدراهم ولا إلى رخصها" (رد المحتار ۷/ ۳۹۴ ط: دار الکتاب دیوبند)۔

(اسی طرح اگر کسی نے کہا: ایک دینار کے بدلہ مجھے دس مہنگے دراہم قرض دو، اس نے

دس دراہم دیئے، تو اس کے لئے عام دراہم ادا کرنا کافی ہوگا، دراہم کے مہنگے اور سستے ہونے کا خیال نہیں کیا جائے گا)۔

اس مسئلہ میں صاحبین کے قول اس لئے اختیار نہیں کیا جاسکتا کہ فلوس رائجہ کا رواج ختم ہونے کی بنا پر ان کی ثمنیت باقی نہیں رہتی ہے، جب کہ مروجہ کرنسی نوٹوں میں چند سال گزرنے کے باوجود ان کی ثمنی حیثیت باقی رہتی ہے، البتہ ان کی قیمت میں کمی واقع ہوتی ہے، مگر صاحب بدائع نے عدد کا اعتبار کیا ہے، اور تمام فقہاء نے فلوس نافقہ کے مہنگا یا سستا ہونے کا اعتبار نہیں کیا ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ افراط زر کی بنا پر زائد رقم وصول کرنا اس لئے بھی مناسب نہیں کہ افراط زر کی بنا پر بعض چیزیں مہنگی ہوجاتی ہیں تو بعض چیزیں سستی ہوجاتی ہیں۔

۲-سونے کی قیمت کو معیار بنا کر دین کا معاملہ:

البتہ یہ بات جائز ہوسکتی ہے کہ نوٹوں کی شکل میں قرض دیتے وقت یا مہر مقرر کرتے وقت یا سامان ادھار فروخت کرتے وقت طرفین واجب الاداء نوٹ کی مالیت سونے یا چاندی میں طے کرلیں اور بہ وقت ادائیگی اسی قدر سونے یا چاندی کی قیمت کے مساوی نوٹوں کی ادائیگی کریں؛ کیوں کہ باہمی رضامندی کی بنا پر اس میں نزاع کا اندیشہ نہیں ہے اور سونے یا چاندی کی قیمت ادا کرنے کی وجہ سے ربا کا شبہ بھی ختم ہوجاتا ہے، کیوں کہ مقروض نے قرض لیتے وقت جس قدر سونے کی مالیت کے نوٹوں سے استفادہ کیا ہے، ادائیگی کے وقت اتنی ہی مقدار سونے کی مالیت کا نوٹ واپس کررہا ہے، یہ عین انصاف کے مطابق ہے، اور اس میں کسی کا ضرر نہیں ہے۔ اس بارے میں مندرجہ ذیل آیات واحادیث سے رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے:

(۱) "وإن تبتم فلكم رؤوس أموالكم، لا تظلمون ولا تظلمون" (البقرۃ:۲۷۹)۔

(اور اگر تم (سود سے) توبہ کرلو تو تم کو تمہارے اصل مال مل جائیں گے، نہ تم ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے)۔

یہاں سود سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے، لیکن پورا پورا اصل مال لینے کا حق دیا گیا ہے اور اس میں کمی زیادتی سے روکا گیا ہے۔

(۲) "یا أیها الذین اٰمنوا أوفوا بالعقود" (المائدہ:۱)۔

(اے ایمان والو! عہدوں کو پورا کرو)۔

(۳) "لا ضرر ولا ضرار" (سنن ابن ماجہ)۔

(نہ ابتداءً نقصان پہنچایا جائے، نہ بدلہ میں نقصان پہنچایا جائے)۔

(۴) "المسلمون علی شروطهم" (بخاری)۔

(مسلمان اپنی شرطوں پر قائم رہتے ہیں)۔

اس مسئلہ میں صاحبین کے قول کو اختیار کیا جاسکتا ہے، علامہ شامی لکھتے ہیں:

''وإذا استقرض عشرة أفلس، ثم کسدت لم یکن علیه إلا مثلها فی قول أبی حنیفة وقالا: علیه قیمتها من الفضة، یستحسن ذلک'' (ردالمحتار ۷/ ۲۹۴)۔

(کسی نے دس فلوس قرض لئے، پھر ان کا رواج ختم ہوگیا، تو امام ابوحنیفہؒ کے قول کے مطابق ویسے ہی فلوس کی ادائیگی اس پر لازم ہے، صاحبین کا قول یہ ہے کہ اس کے ذمہ اتنی ہی قیمت کی چاندی کی ادائیگی لازم ہے، یہ بہتر بات ہے)۔

خلاصۂ جواب:

۱- دیون یعنی مؤخر مطالبوں میں متعینہ رقم ہی ادا کی جائے گی، کرنسی نوٹوں کی قدر میں کمی ہونے کی وجہ سے زائد رقم کا مطالبہ کرنا درست نہیں ہوگا۔

۲- البتہ یہ بات جائز ہوگی کہ نوٹوں کی شکل میں قرض دیتے وقت یا مہر مقرر کرتے وقت یا ادھار فروخت کرتے وقت فریقین واجب الاداء نوٹ کی مالیت سونے یا چاندی میں طے کرلیں، اور بہ وقت ادائیگی اسی قدر سونے یا چاندی کی قیمت کے مساوی نوٹ ادا کریں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت

مولانا محمد نصر اللہ ندوی ☆

گذشتہ زمانوں میں سونے اور چاندی کے سکوں کا رواج تھا، اور بہت حد تک دونوں کی قیمتوں میں استحکام تھا، اس لئے طویل عرصہ تک ان کو کرنسی کی حیثیت حاصل رہی۔ پھر آہستہ آہستہ ان کی جگہ کاغذی نوٹوں نے لے لی۔ دنیا کے معاشی نظام میں بڑے پیانے پر انقلابات اور تغیرات رونما ہونے کی وجہ سے یہ نوٹ ایک حالت اور کیفیت پر قائم نہیں رہتے ہیں، بلکہ بازار میں عام اشیاء کے دام بڑھنے اور کم ہونے کی وجہ سے اس کی قوت خرید میں فرق آجاتا ہے، جسے ہم موجودہ علم معاشیات کے الفاظ میں افراط زر اور تفریط زر سے تعبیر کرسکتے ہیں۔

یہاں پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ افراط زر اور تفریط زر کی تشریح کی جائے تاکہ آئندہ کی گفتگو کو آسانی سے سمجھا جاسکے۔

عصر حاضر کی اصطلاح میں افراط زر کا مطلب ہوتا ہے کہ کسی ملک کی کرنسی اس ملک کی اشیاء اور خدمات کے مقابلہ میں زیادہ ہوجائے، اس کی وجہ سے اشیاء اور خدمات کی قیمت بڑھ جاتی ہے اور ملک میں مہنگائی پیدا ہوجاتی ہے، کیوں کہ کسی بھی ملک کی کرنسی اشیاء اور خدمات کی طلب کی نمائندگی کرتی ہے اور ملک میں موجود اشیاء وخدمات رسد کی نمائندگی کرتے ہیں، اور جب رسد کے مقابلہ میں طلب زیادہ ہوجاتی ہے تو بہت زیادہ مہنگائی پیدا ہوجاتی ہے۔

☆ استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

اور تفریط زر کا مطلب ہوتا ہے کہ ملک کی کرنسی اشیاء اور خدمات کی مقابلہ میں کم ہوجائے، اس کی وجہ سے اشیاء اور خدمات کی قیمت کم ہوجاتی ہے اور ارزانی پیدا ہوجاتی ہے۔

چنانچہ تفریط زر کے وقت ہم کرنسی کے ذریعہ اشیاء صرف کی بڑی مقدار خرید سکتے ہیں، لیکن افراط زر کے وقت اتنی مقدار میں اشیاء نہیں خرید سکتے جتنی مقدار میں تفریط زر کے وقت خریدی تھیں۔ بلکہ اس مقدار سے کم خرید سکیں گے، مثلاً تفریط زر کے وقت پانچ سو روپے میں چاول ۱۵ رکلو، نمک ۱۵ رکلو، کپڑا دس میٹر خرید سکتے ہیں لیکن افراط زر کے وقت ہم پانچ سو روپے میں مذکورہ بالا اشیاء صرف مندرجہ ذیل مقدار میں خرید سکتے ہیں:

چاول ۸ رکلو، نمک ۸ رکلو، کپڑا چھ میٹر۔

غور کرنے کی بات ہے کہ ان دونوں حالتوں میں پانچ سو روپے تو وہی رہے اس کی مقدار میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی لیکن دوسری صورت میں روپے کی قوت خرید پہلی کی بہ نسبت کمزور ہوگئی۔

اس کا حل ماہرین معاشیات نے نکالا کہ وہ کرنسی نوٹوں کی پیمائش قوت خرید سے کرنے لگے اور قوت خرید ہی کے ذریعہ اس کی حقیقی قیمت کا اندازہ لگانے لگے۔ اس فرق کو ماہرین معاشیات کرنسی کی قیمت فرق سے تعبیر کرتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے گذشتہ مثال میں دیکھا کہ افراط زر کے وقت روپے کی قوت خرید کم ہوگئی ہے کیوں کہ افراط زر کے وقت ہم تفریط زر کے مقابلہ میں تقریباً آدھی اشیاء ہی خرید سکتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا حقوق وواجبات کی ادائیگی میں افراط زر کے وقت کے پانچ سو روپے تفریط زر کے وقت کے پانچ سو روپے کے مساوی قرار دئے جائیں گے یا ڈھائی سو روپے کے برابر سمجھے جائیں گے؟

بعض ماہرین معاشیات کے نزدیک اس کا حل یہ ہے کہ کرنسی اور نوٹ کی قیمت متعین

کرنے کے لئے قیمتوں کے اشاریہ کو معیار بنایا جائے اور تمام حقوق وواجبات کی ادائیگی میں قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ کرنسی کی قیمت کے تعلق کو بنیاد بنایا جائے، مثلاً اگر ایک ہزار روپے کسی نے قرض لئے اور قرض کی واپسی کے وقت قیمتوں کے اشاریہ میں دس فیصد کی تناسب سے اضافہ ہو چکا ہے تو اب قرض دار بھی قرض میں دس فیصد کے تناسب سے اضافہ کرکے گیارہ سو روپے واپس کرے، کیا شرعی نقطہ نظر سے ایسا کرنا درست ہے؟

اس سوال کا جواب جاننے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے یہ طے کیا جائے کہ نوٹ مثلی ہے یا غیر مثلی؟

نوٹ مثلی ہے یا غیر مثلی؟

فقہاء نے مثلی کی تعریف مندرجہ ذیل الفاظ میں کی ہے:

۱-جس میں ایک ہی نوع کے مختلف اجزاء میں قیمت کے اعتبار سے تفاوت نہ ہو، ''ما لا یختلف أجزاء النوع الواحد منه بالقیمة'' (الاشباہ والنظائر للسیوطی ر ۷۷-۵۷۶)۔

۲-وہ اشیاء جن کی مقدار ناپ تول کر معلوم کی جاتی ہو یا شمار کر کے معلوم کی جاتی ہو لیکن اس کے مختلف افراد میں قابل لحاظ تفاوت نہ ہو، جیسے کیلی، وزنی اور وہ عددی اشیاء جن کے افراد میں قابل لحاظ تفاوت نہ ہو۔ اسی طرح ہاتھ اور گز سے ناپی جانے والی اشیاء اور ایسی شمار کی جانے والی جن کے افراد میں باہم کافی تفاوت ہو، مثلی نہیں ہوگی۔

مثلی اور قیمی کی تعریف میں فقہاء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے، اگر ہے بھی تو تعبیر وبیان کا اختلاف ہے، کسی شئے کے مختلف افراد میں فرق نہ ہو یا اتنا کم فرق ہو جس کو عام طور پر نظر انداز کردیا جاتا ہے، وہ مثلی ہے اور جس کے افراد میں قابل لحاظ فرق ہو وہ قیمی ہے۔

کسی چیز کی مثلی یا قیمی ہونے کا دارومدار بہت حد تک عرف پر بھی ہوتا ہے۔ مثلاً گز سے ناپ کر فروخت کی جانے والی اشیاء کپڑے وغیرہ، فقہی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ

قدیم میں کپڑوں کے ایک ہی تھان کے مختلف حصوں میں خاصا فرق ہوتا تھا، مگر آج ایسا نہیں ہے۔ کپڑوں کی انواع اس طرح مشخص ہوگئی ہیں اور ایک ہی نوع کے کپڑے میں اتنا کم اور ناقابل لحاظ فرق ہے کہ ان کے مثلی ہونے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہا۔

ان تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ نوٹ مثلی ہی ہیں، اگر چہ یہ فقہاء کی زبان میں کیلی اور وزنی نہیں لیکن عددی غیر متفاوت ہیں، اس لئے ایک ہی تعداد کی دونوٹ ایک ہی مالیت رکھتے ہیں اور ان کی قدر میں کوئی فرق نہیں جیسا کہ فقہاء نے دراہم ودنانیر کی طرح فلوس کو بھی مثلی شمار کیا ہے۔

مثلی اشیاء میں مقدار کا اعتبار:

جب یہ بات متعین ہوگئی کہ نوٹ کا تعلق مثلی اشیاء سے ہے تو اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا قرض کی ادائیگی کے وقت صرف اس کی مقدار ادا کرنا واجب ہے یا اس کی مالیت اور قیمت کو بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے؟

نصوص شرعیہ میں غور کرنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ قرض کی واپسی میں مقدار اور کمیت میں برابری مطلوب ہے، قیمت اور مالیت میں نہیں۔ اس کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

۱- اگر ایک شخص دوسرے سے دس کلو چاول بطور قرض لے اور قرض لیتے وقت دس کلو چاول کی قیمت پچاس روپے تھی اور واپسی کے وقت دس کلو چاول کی قیمت تیس روپے ہوگئی تو اب وہ صرف دس کلو چاول واپس کرے گا زیادہ نہیں، باوجودیکہ دس کلو چاول کی قیمت پچاس روپے سے کم ہوکر تیس روپے ہوگئی ہے۔ اس پر تمام فقہاء کا اجماع ہے۔ یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ قرض میں جس مثلیت اور برابری کا اندازہ شریعت میں ضروری ہے، وہ مقدار اور کمیت میں برابری ہے، قیمت اور مالیت میں برابری معتبر نہیں۔

۲-قرضوں کی واپسی میں برابری کی شرط صرف سود سے بچنے کے لئے ہے، اس سے کسی کو اختلاف نہیں ہے، صحیح مسلم میں ہے:

''عن عبد المجید بن سهیل بن عبد الرحمن أنه سمع سعید بن المسیب یحدث أن أبا هریرة وأبا سعید حدثاه أن رسول الله ﷺ بعث أخا بنی عبد الأنصاری فاستعمله علی خیبر فقدم بتمر جنیب، فقال له رسول الله ﷺ: أکل تمر خیبر هکذا، قال: لا، والله یا رسول الله! إنا لنشتری الصاع بالصاعین من الجمع فقال رسول الله ﷺ: لا تفعلوا ولکن مثلا بمثل أو بیعوا هذا واشتروا بثمنه من هذا، وکذلک المیزان'' (فتح الملہم ۷/۵۶۷)۔

(حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے بنی عدی کے ایک شخص کو خیبر کا عامل بنا کر بھیجا، وہ عامل جب واپس آیا تو حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں جنیب کھجور (عمدہ قسم کی کھجور) پیش کیں۔ حضور اکرم ﷺ نے سوال کیا کہ کیا خیبر کی تمام کھجوریں ایسی ہوتی ہیں؟ انہوں نے جواب دیا: نہیں، ہم اس (عمدہ) کھجور کے ایک صاع کو (گھٹیا) کھجور کے دو صاع کے بدلہ میں تبدیل کر لیتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ایسا مت کرو؛ بلکہ برابری کے ساتھ اس کا تبادلہ کیا کرو۔ یا نہیں تو پہلے جمع کھجور (مختلف قسم کی ملی جلی کھجور) کو دراہم کے عوض فروخت کردو، پھر ان دراہم سے جنیب کھجور خرید لیا کرو)۔

یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اموال ربویہ میں جو تماثل اور برابری مطلوب ہے وہ مقدار میں تماثل ہے، قیمت میں یہ تماثل اور برابری مطلوب نہیں؛ اس لئے کہ جنیب جمع کھجور کے مقابلہ میں بہت اعلی درجہ کی تھی۔ مگر حضور ﷺ نے کھجور کی ایک قسم کو دوسری قسم سے تبدیل ہونے کی صورت میں عمدہ اور گھٹیا ہونے کا بالکل اعتبار نہیں کیا بلکہ وزن میں برابری کو ضروری قرار دیا۔

۳-"عن عبادة بن الصامت قال: قال رسول الله ﷺ: الذهب بالذهب، والفضة بالفضة، والبر بالبر، والشعير بالشعير، والتمر بالتمر، والملح بالملح مثلا بمثل، سواء بسواء يدا بيد، فإذا اختلفت هذه الأوصاف فبيعوا كيف شئتم إذا كان يدا بيد" (فتح الملہم ۷/۵۵۶)۔

(حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: سونے کو سونے کے بدلہ میں، چاندی کو چاندی کے بدلہ میں، گیہوں کو گیہوں کے بدلہ میں، جو کو جو کے بدلہ میں، کھجور کو کھجور کے بدلہ میں اور نمک کو نمک کے بدلہ میں برابر سرابر اور ہاتھوں ہاتھ نقد بیچو، ہاں اگر ان اشیاء کی بیع میں جنس مختلف ہو جائے تو پھر جس طرح چاہو کمی زیادتی کے ساتھ بیچو، بشرطیکہ نقد انقد ہو)۔

۴-"عن أبي هريرة قال: قال رسول الله ﷺ: الذهب بالذهب وزنا بوزن مثلا بمثل والفضة بالفضة وزنا بوزن مثلاً بمثل، فمن زاد أو استزاد فهو ربا" (فتح الملہم ۷/۵۵۷)۔

(حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: سونا سونے کے بدلہ میں، چاندی چاندی کے بدلہ میں وزن کر کے برابر سرابر بیچو، ان میں جو شخص اضافہ کرے یا اضافہ طلب کرے تو وہ اضافہ سود ہے)۔

خلاصۂ بحث:

مندرجہ بالا احادیث اس بات کو واضح کرتی ہیں کہ شریعت میں جو تماثل اور برابری معتبر ہے وہ مقدار میں برابر ہے۔ اموال ربویہ میں قیمت کے فرق کا بالکل اعتبار نہیں، یہ احکام اس صورت میں ہیں جب بیع نقد ہو رہی ہو، اور اگر معاملہ قرض کا ہو جس میں اصل سود جاری ہوتا

ہے اور جس میں ہر قسم کی کمی زیادتی بلکہ زیادتی کے شبہ سے بھی بچنا ضروری ہے، تو پھر اس میں قیمت کے تفاوت کا لحاظ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

یہ بات طے شدہ ہے کہ قیمتوں کو اشیاء سے منسلک کرنے کا پورا حساب اندازہ اور تخمین پر مبنی ہے اور اگر کسی جگہ پر حساب بہت باریک بینی اور پوری احتیاط سے بھی کیا جائے تو اسے قطعی اور یقینی نہیں کہہ سکتے، جب کہ اوپر مذکورہ احادیث سے یہ واضح ہو چکا ہے کہ قرضوں کی ادائیگی میں اٹکل اور اندازہ کی شرط لگانا شرعاً جائز نہیں؛ لہذا قرضوں کی واپسی کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنا جائز نہ ہوگا۔ واللہ اعلم۔

موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت

مولانا عطاء اللہ قاسمی ☆

(۱)

تعارف

موجودہ کرنسی کاغذی نوٹ ہیں، جن کی اپنی ذاتی قدر و قیمت کچھ نہیں ہے۔ ان نوٹوں کی سونے چاندی کے ساتھ وابستگی ایک قصہ پارینہ بن چکی ہے، کیوں کہ دنیا کے تمام ممالک کے نوٹوں پر ادائیگی کا وعدہ ضرور لکھا ہوتا ہے لیکن عملی طور پر کسی بھی بینک میں سو کے نوٹ پر سونے کی ادائیگی نہیں کی جاتی، بلکہ قانوناً سونے کی ادائیگی بند کردی گئی ہے۔ اس طرح نوٹ پر درج شدہ وعدہ صرف وعدہ ہے۔

عمومی رواج، عوام کا اعتماد، حکومتوں کی ضمانت اور قانون نے مل کر کاغذ کے اس پرزہ کو مالی قوت عطا کردی ہے، اس کو ثمن کا درجہ دے دیا، تمام اشیاء وخدمات کا معاوضہ بنادیا، عالمی سطح پر ادائیگیوں کا ذریعہ ٹھہر لیا گیا ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص ان نوٹوں کو اشیاء وخدمات کے عوض لینے سے انکار کردے تو وہ شخص عرف، قانون اور حکومت سب کی نظر میں مجرم متصور ہوگا۔

شرعی حیثیت:

کسی بھی سکہ کو ثمنیت کا درجہ دینے کے لئے شریعت نے جو شرطیں عائد کی ہیں وہ تمام

☆ صدر مدرس، مدرسہ امداد العلوم کوپا گنج، مئو۔

شرطیں موجودہ کرنسی میں بدرجہ اتم پائی جارہی ہیں۔ یہ نوٹ بذات خود موجودہ دور کا بہت اہم مال اور مطلوب ترین چیز ہیں، علامہ شامیؒ نے مال کی جو تعریف کی ہے وہ بھی یہاں صادق آرہی ہے۔

المال: ما يميل إليه الطبع ويمكن ادخاره بوقت الحاجة والمالية تثبت بتمويل الناس كافة (شامی ۴/۳، دیوبند) (مال وہ ہے جس کی طرف طبیعتوں کا میلان فطری طور پر ہوتا ہے، اور وقت ضرورت کے لئے اسے ذخیرہ بنانا ممکن ہو، مالیت کا ثبوت عوام الناس کے مالیت تسلیم کرلینے سے ہوتا ہے)۔

لہذا موجودہ کرنسی شرعی اعتبار سے ''ثمن عرفی'' یا ''ثمن اصطلاحی'' کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کرنسی پر وہ تمام احکامات مرتب ہوں گے جو سونے چاندی کے سکوں پر مرتب ہوتے ہیں۔ مثلاً ان نوٹوں پر زکوۃ واجب ہوگی اور ان نوٹوں سے زکوۃ کی ادائیگی صحیح ہوگی، وغیرہ وغیرہ۔

نوٹوں کی قدر اور اشاریہ:

البتہ ان نوٹوں کے ساتھ عالمی حالات کے تناظر میں ایک اہم مسئلہ جڑا ہوا ہے اور وہ ہے ان کرنسی نوٹوں کی حقیقی قدر میں ''عدم استقلال'' یعنی افراط زر کی صورت میں ان کاغذی نوٹوں کی قدر اور قوت خرید گر جاتی ہے اور تفریط کی صورت میں ان کی قدر بڑھ جاتی ہے، قدروں اور قیمتوں کی کمی بیشی کو منضبط کرنے کے لئے ریاضی کا پیچیدہ اور بظاہر سائنٹفک طریقہ نکالا گیا جسے ''اشاریہ'' کہا جاتا ہے۔

اشاریہ: ہیئت ترکیبی:

اشاریہ جسے پختہ اور مضبوط نظریہ سمجھا جاتا ہے یہ بہت غیر یقینی اور پھسپھسا ہے۔ اشاریہ کے تین بنیادی عناصر ترکیبی ہیں:

۱- اشیاء ضروریہ کی تعیین اور ان کی فہرست سازی۔

۲-ان اشیاء کی اہمیت کا تعین۔

۳-ان کی قیمتوں کا تعین۔

یہ تینوں عناصر افراد، زمانہ اور مکان کے اختلاف سے یقینی طور پر متاثر ہوتے ہیں، کیوں کہ کچھ اشیاء کچھ افراد کے لئے ضروری اور بڑی اہم ہوتی ہیں تو دوسرے اشخاص کے لئے قطعاً غیر ضروری اور بالکل بے کار ہوتی ہیں، اس طرح وقت اور مکان کے فرق سے اشیاء کی قیمتوں میں کھلا ہوا فرق روزمرہ کا مشاہدہ ہے، نتیجہ ظاہر ہے کہ اشاریہ کے عناصر ترکیبی مختلف فیہ غیر یقینی ہیں، تو ان سے برآمد ہونے والا نتیجہ بھی غیر یقینی اور تخمینی ہوگا، یقینی اور قطعی ہر گز نہیں ہوگا۔ ایسے اشاریہ کے ساتھ نوٹوں کی حقیقی قدر وابستہ کرنا غیر مناسب اور ادائیگیوں کو اس کے ساتھ وابستہ کرنا ناممکن ہے، یہی وجہ ہے عملی طور پر کہیں نافذ نہیں ہوسکا۔

پرفریب نظریہ:

کرنسی نوٹوں کے قدر میں عدم استحکام اور اس کو اشاریہ سے وابستہ کرنے کا نظریہ سرمایہ دارانہ ذہنیت کی تسکین کے لئے بنایا گیا ہے؛ کیوں کہ ''ثمن'' خلقی ہو یا عرفی اس کی قدر اور قیمت متعین ہوتی ہے اس میں کمی بیشی کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ کرنسی کی قیمت میں بعض اوقات کمی اس طرح ہوتی ہے کہ خود حکومت اپنے سکے کی قیمت گرادیتی ہے۔ لیکن اس کا براہ راست اثر بیرونی کرنسی کی شرح تبادلہ پر پڑتا ہے، اندرونی معاملات پر اس کا اثر نہیں ہوتا؛ بلکہ اس ثمن کے مقابلہ میں جو اشیاء وخدمات حاصل کی جاتی ہیں ان کی قیمتوں میں کمی بیشی ہوتی ہے۔ وجوہات مختلف ہوسکتی ہیں، مثلاً:

الف- اشیاء کی کمی: جیسے قحط سالی، کم پیداوار جس کے سبب قیمت بڑھ جاتی ہے۔

ب- حکومتیں اپنے خزانے بھرنے اور وزراء وحکام کی تنخواہوں میں اضافہ کے لئے تاجروں پر ٹیکس لاددیتی ہے اور تجار اشیاء کی قیمتیں بڑھا کر اسے وصول کر لیتے ہیں۔

ج -کمیاب اور نایاب اشیاء کی قیمتوں میں بالقصد اضافہ کر لیتے ہیں۔

د-حکومتوں کا رویہ: حکومت کے اشارہ پر قیمتوں میں اضافہ اور کمی روزمرہ کا معمول اور مشاہدہ ہے۔

مختصر یہ کہ کرنسی کی قدر مستحکم ہوتی ہے اور اشیاء کی قیمتوں میں کمی بیشی ہوتی ہے، حکومت اپنی ناکامی کو چھپانے کے لئے کرنسی کی قدر میں عدم استحکام اور اشاریہ کا بہانہ بنالیتی ہے اور اس طرح رائے عامہ کو گمراہ کرتی ہے۔

اشاریہ ایک نظریہ ہے جو عملی نفاذ سے محروم ہے۔

ادائیگی اور اشاریہ: شرعی حیثیت:

اشاریہ اپنے تمام مراحل میں اندازہ وتخمین پر مبنی ہے، اگر کسی جگہ بہت باریک بینی اور پوری احتیاط سے بھی مرتب کیا جائے تو بھی اس کا نتیجہ تقریبی اور تخمینی ہوتا ہے یقینی نہیں ہوتا۔ اس لئے دیون یعنی موخر مطالبوں کی ادائیگی کو اشاریہ سے وابستہ کرنا شرعی نقطۂ نظر سے ہرگز جائز نہیں۔ اس کی بہترین فقہی نظیر بیع مزابنہ کی حرمت ہے:

"ولا یجوز بیع المزابنة وهو بیع التمر علی رؤوس النخل بخرصة تمراً إنما لا یجوز هذا البیع لنهیه علیه السلام عن المزابنة والمحاقلة" (الجوهرة النیرة ۱/۲۴۴) (بیع مزابنہ یعنی درخت پر لگی ہوئی کھجور کو توڑی گئی کھجوروں کے عوض اندازہ کر کے بیچنا جائز نہیں؛ کیوں کہ نبی علیہ السلام نے بیع مزابنہ اور بیع محاقلہ سے منع فرمایا ہے)۔

تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ قرض کی واپسی میں مقدار کی یقینی مثلیت اور یقینی برابری بنیادی شرط ہے، اندازہ وتخمین سے واپسی ہرگز جائز نہیں، اسی طرح تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ اموال ربویہ میں تبادلہ یقینی برابری کے ساتھ ہونا چاہئے، اندازہ وتخمین بہر حال ناجائز ہے۔

ظاہر ہے توڑی گئی کھجوروں کی مقدار وزن کر کے معلوم کی جاسکتی ہے جب کہ درخت

پر لگی ہوئی کھجوروں کی مقدار معلوم کرنے کا طریقہ اندازہ وتخمین کے سوا دوسرا نہیں ہے، اسی وجہ سے نبی علیہ السلام نے اس کو علی الاطلاق حرام قرار دیا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ادائیگی کو اشاریہ کے ساتھ جوڑنے کی صورت میں معاملہ ربوا اور سود کا بن جائے گا، کیوں کہ کرنسی ایک جنس ہے اس کا تبادلہ اور اس کی ادائیگی اسی جنس سے ہونی ضروری ہے، اشاریہ سے جوڑنے کی صورت میں جو اضافہ ہوگا وہ تاخیر (نسیئہ) کے مقابلہ میں ہو جائے گا جو کھلا ہوا ربوا ہے، اس لئے: ''ادائیگیوں کو اشاریہ سے جوڑنا باب ربا کھولنے کا سبب بنے گا''۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ یہ مستقل تنازعہ کا سبب بنے گا؛ کیوں کہ نوٹ کی قدر افراط زر کی صورت میں گرے گی تو سو روپے قرض کی ادائیگی ایک سو دس یا بیس روپے ہونی چاہئے، اور تفریط زر کی صورت میں نوٹ کی قدر بڑھے گی تو اسی قرض کی ادائیگی ننانوے روپے میں ہوگی۔ ظاہر ہے دونوں صورتیں متنازع ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسا عملی طور پر کہیں بھی نافذ نہیں ہو سکا اور نہ ہی اسے قبول عام حاصل ہو سکا۔

چوتھی توجیہ یہ ہے کہ شریعت انہیں اصولوں کو حکم کی بنیاد بناتی ہے جو ہر شخص کی دسترس میں ہو اور عامۃ الورود ہو جیسے حکم ہے: "صوموا لرؤيتكم و أفطروا لرؤيتكم" (چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر عید کرو)، ظاہراً یہ ایسا اصول ہے جو ہر جگہ ہر شخص کے لئے قابل فہم ہے؛ جب کہ:

اشاریہ ایک نظریہ ہے جو ریاضی کے پیچیدہ اصولوں اور دقیق فنی بنیادوں پر مبنی ہے جو ہر شخص کے فہم سے بالاتر ہے اس لئے کسی شرعی حکم کی بنیاد نہیں بن سکتا۔ هذا ما ظهر لي والله أعلم بالصواب۔

(۲)

اس سوال میں جو صورت مسئلہ ذکر کی گئی ہے وہ قطعی طور پر حرام اور نا جائز ہے، اس کی حرمت دو وجہ سے ہے، ایک تو یہ سودی معاملہ ہے، دوسرے سود کو جائز کرنے کا حیلہ ہے۔

مسئلہ کی نوعیت یہ متعین ہے کہ مثلاً زید نے دس ہزار روپئے قرض لئے یا دس ہزار روپئے کا ادھار سامان خریدا۔ جس وقت یہ معاملہ ہو رہا تھا اس وقت دس ہزار میں دس تولہ سونا خرید اجا سکتا تھا۔ طرفین نے یہ طے کر لیا کہ بوقت ادائیگی اتنے نوٹ دینے ہوں گے جن سے دس تولہ سونا خرید اجا سکے۔ طے شدہ شرط کی بنا پر ادائیگی کے وقت دس تولہ سونے کی قیمت بارہ ہزار روپئے ہونے کی صورت میں زید بارہ ہزار روپئے دینے کا پابند ہوگا۔

اس صورت میں نوٹ قرض میں دیا گیا ہے اور واپسی بھی نوٹ ہی کی شکل میں ہو رہی ہے۔ اور کرنسی نوٹ کا شمار جنس ہونے کی بنا پر اموال ربویہ میں ہوتا ہے لہذا مقدار میں برابری کے ساتھ لین دین واجب ہوگا، کمی بیشی بہر صورت ربا اور سود ہوگی۔

اس معاملہ کو جائز قرار دینے میں دوہرے گناہ کو دعوت دینا ہے: ایک سودی معاملہ، دوسرے سود کے جواز کے لئے حیلہ۔

یہاں پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ قرض لیتے وقت دس ہزار روپے کی مالیت واپسی کے وقت کے بارہ ہزار کی مالیت کے برابر ہے؛ اس لئے ربوا کا تحقق نہیں ہوتا۔

لیکن یہ اعتراض باطل ہے؛ اس لئے کہ وہ تمام نصوص جو سود کی حرمت پر دلالت کرتی ہیں ان سے برابری اور مثلیت کے معنی پوری صراحت و وضاحت کے ساتھ متعین ہو جاتے ہیں، وہ یہ کہ اموال ربویہ کی مقدار اور کمیت میں برابری معتبر ہے مالیت اور قیمت میں برابری قطعاً غیر معتبر ہے۔ تمام فقہاء کے نزدیک یہ بات مسلم ہے کہ قرضوں کے لین دین میں برابری کی شرط صرف سود اور ربا سے بچنے کے لئے ہے۔ دلیل:

۱-تمام متقدمین ومتاخرین فقہاء کا متفقہ فتوی ہے کہ اگر ایک کلوگندم قرض لیا گیا تو ایک کلوگندم ہی واپس کرنا واجب ہے۔قرض لیتے وقت اور واپس کرتے وقت گندم کی مالیت میں چاہے جتنا بھی تفاوت ہو جائے۔ یہ بالکل واضح دلیل ہے کہ شریعت قرض میں جس برابری کو ضروری قرار دیتی ہے وہ مقدار اور کمیت میں برابری ہے نہ کہ قیمت اور مالیت کی برابری۔

دس ہزار روپے کو سونے کے ساتھ وابستہ کر کے قرض دینا ربو یا شبہ ربا سے ہرگز خالی نہیں ہے، اگر یہ معاملہ ایسے کرلیا جائے کہ قرض دینے والا سونا قرض دے اور قرض لینے والا اس کو بیچ کر کام میں لائے پھر اتنی مقدار سونے کی خرید کر قرض ادا کردے۔

اگر اس طرح معاملہ کرنے میں کوئی دقت نہ ہو تو اسی طریقہ کو اپنانے کی ترغیب دینی چاہئے۔

موجودہ کرنسی کا شرعی حکم

مفتی محمد احتشام قاسمی ☆

اس عنوان کے تحت پہلے سوال کی یہ عبارت کہ ’’کاغذی نوٹوں کی اپنی ذاتی کوئی قیمت نہیں ہوتی اور افراط زر کی صورت میں اس کی قوت خرید تیزی سے گر جاتی ہے‘‘ اس عبارت کے سلسلہ میں اولاً تو یہ عرض ہے کہ ’’افراط زر کی صورت میں کاغذی نوٹ کی قوت خرید تیزی سے گر جاتی ہے‘‘ صحیح نہیں ہے۔

کیوں کہ ثمن خلقی یا ثمن عرفی واصطلاحی کی قیمت متعین ہوتی ہے، اس میں کمی بیشی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بلکہ جو اشیاء خریدی جاتی ہیں ان کی قیمتوں میں اضافہ ہوتا ہے اور اس اضافہ کی مختلف وجہیں ہوسکتی ہیں مثلاً کبھی پیداوار کم ہونا، یا قحط سالی کا ہونا، یا کسی چیز کا کم یاب یا نایاب ہونا، یا حکومتوں کا اپنے خزانے کو بھرنے کے لئے یا تنخواہوں وغیرہ میں اضافہ کرنے کے لئے تجار پر مختلف قسم کے ٹیکس لگا کر یا بڑھا کر رقم وصول کرنا، جس کی وصولی تجار قیمتوں میں اضافہ کر کے کرتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

مختصر یہ کہ روپیہ کی قوت خرید کم نہیں ہوتی، بلکہ ارزانی یا گرانی سامان واشیاء میں ہوتی ہے، اب کچھ لوگ تعبیر کو الٹ کر یوں کہتے ہیں کہ ’’روپیہ کی قیمت یا روپیہ کی قوت خرید کم ہوگئی، جو لوگ ایسا کہتے ہیں یا سمجھتے ہیں صحیح نہیں ہے۔

☆ پھولاس اکبر پوری، معرفت گولڈن گارمنٹس دیوبند۔

جب ہم اس کے متعلق ذخیرہ حدیث کو بنظر غائر دیکھتے ہیں تو یہ بات بالکل منقح ہوکر سامنے آتی ہے کہ ارزانی وگرانی کا تعلق سامان واشیاء سے متعلق ہے ثمن سے نہیں، کیوں کہ سامان واشیاء کی قیمت بڑھنے کی وجہ سے ثمن میں کم وبیش کا مسئلہ پیش آتا ہے۔

مشکوۃ باب الاحتکار میں، ص/۲۵۱ پر حدیث ہے:

''عن ابن عمر قال: قال رسول الله ﷺ: من احتکر طعاما أربعین یوما یرید الغلاء فقد برئ من الله وبرئ الله منه''۔

حدیث مذکور میں گرانی کا تعلق جنس غلہ سے ظاہر کیا گیا ہے، روپیہ کی قدر میں کمی بیشی سے نہیں۔

اور اسی صفحہ پر ایک دوسری حدیث ہے:

''عن أنس قال: غلا السعر علی عهد النبی ﷺ فقالوا: یا رسول الله! سعر لنا''۔

اس حدیث میں بھی غلہ اور دوسری اشیاء کی قیمتوں کو مقرر کرنے کی درخواست کی گئی کہ یہ طے ہوجائے کہ فلاں چیز کی قیمت یہ ہوگی یہ نہیں کہ اتنی کھجور کے برابر اتنے درہم ہوں گے یا فلاں چیز کے برابر اتنے درہم ہوں گے، بلکہ یہ طے کردیا جائے کہ اتنے درہم کے بدلے میں اتنی کھجور وغیرہ ملیں گی اور یہی عرف ودستور آج تک چلا آرہا ہے۔

اور اسی صفحہ پر ایک تیسری حدیث ہے:

'' عن معاذ قال: سمعت رسول الله ﷺ یقول: بئس العبد المحتکر إن أرخص الله الأسعار حزن وإن أغلاها فرح''۔

اس حدیث میں بھی ارزانی وگرانی کو اشیاء ہی سے متعلق کیا گیا ہے ثمن سے نہیں۔

اور ابوداؤد کی ایک حدیث میں تو اس کی صراحت ملتی ہے کہ اونٹ گراں ہوگئے۔

"قال: كانت قيمة الدية على عهد رسول الله ﷺ ثمان مائة دينار أو ثمانية آلاف درهم....... حتى استخلف عمر فقال خطيبا: ألا إن الإبل قد غلت فافترضها عمر على أهل الذهب ألف دينار وعلى أهل الورق اثنى عشر ألف درهم" (ابوداؤد ۶۲۵)۔

یہاں حدیث کی یا مسئلہ کی بحث میں نہ جاتے ہوئے صرف یہ عرض ہے کہ خلیفۂ راشد کی زبان سے یہی نکلا کہ "ألا إن الإبل قد غلت" کہ اونٹ کی قیمت بڑھ گئی، یہ نہیں فرمایا کہ درہم ودینار کی قیمت گھٹ گئی۔

جب یہ بات واضح ہوگئی کہ کاغذی نوٹوں کی قیمت یا قوت خرید میں کوئی کمی، ارزانی اور گراوٹ نہیں ہوتی بلکہ وہ بحالہ باقی رہتی ہے تو یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ "افراط زر کی صورت میں کاغذی نوٹ کی قوت خرید تیزی سے گر جاتی ہے"، اور سوال میں مذکور موٴخر مطالبوں مثلاً قرض، مہر پنشن، ادھار خریداری کی اور وقت پر ادا نہ ہونے کہ ادائیگی کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اور اگر موٴخر مطالبوں کو کسی اشاریہ سے وابستہ کیا جاتا ہے تو اس کی سب سے بڑی اور بنیادی خرابی یہ ہے کہ اس سے سود کا دروازہ کھل جائے گا جس کی حرمت کو قرآن حکیم نے بڑے شد ومد کے ساتھ بیان کیا ہے اور جس کے بارے میں احادیث میں بڑی بڑی وعیدیں آئی ہیں اور شریعت اسلامی نے سود کے بارے میں جو آہنی دیواریں قائم کی ہیں وہ ریت کے تودے سے زیادہ کمزور ہو جائیں گی اور سود خوار بڑی آسانی سے مدیون سے سود وصول کریں گے اور کہیں گے کہ اتنی مدت میں بازار کی قیمتوں میں اس قدر تفاوت ہوگیا ہے، اس لئے اتنا اضافہ لینا ضروری ہے، اور مفتیان کرام نے اس کو جائز ہونے اور وصول کرنے کا فتویٰ بھی دے رکھا ہے، حالانکہ یہ اضافہ اور زیادتی سود ہی ہے۔

کیوں کہ فقہاء نے سود کی یہ تعریف کی ہے: "**كل زيادة لا يقابلها عوض**" (احکام القرآن للجصاص: ص ۲۴۴)۔

لہذا جتنی مالیت کی کرنسی نوٹ قرض لئے ہیں، برسوں کے بعد بھی اتنی ہی مالیت کے نوٹ ادا کرنے ضروری ہوں گے، مثلاً دس ہزار روپے قرض لئے ہیں تو دس ہزار روپے ہی واپس کرنے ضروری ہوں گے چاہے جتنی مدت کے بعد لوٹائے، زیادتی کرنا شرعی طور پر قطعاً جائز نہ ہوگا، اور اگر زیادتی کی جائے گی تو وہ سود ہی ہوگی۔

دوسری خرابی یہ ہے کہ ایسے کسی اشاریہ کو منضبط کرنا بھی عوام الناس کے لئے سہل نہیں ہے، جس کی بنیاد دقیق فنی اصولوں پر ہو۔

تیسری خرابی یہ ہے کہ اس نظام کی وجہ سے عوام الناس یقیناً مشکلات اور تنازعات میں مبتلا ہوجائیں گے۔

۲-سوال (۲) میں جو یہ شکل بیان کی گئی ہے کہ "قرض وغیرہ دیتے وقت ان کی مالیت کو سونے چاندی میں طے کرلیں اور بوقت ادائیگی اسی قدر سونے یا چاندی کی قیمت کے مساوی ادائیگی کردی جائے"، تو یہ صورت شرعی اصول کی روشنی میں صحیح اور جائز ہے۔

لیکن یہ صورت بھی عوام الناس کے لئے مختلف مشکلات اور ان کے درمیان نوع بنوع کے تنازعات سے خالی نہیں ہے، مثلاً حق دار چاہے گا کہ میرا حق اس وقت ملے جب سونے چاندی کی قیمت گراں ہو، اور مقروض چاہے گا کہ اس وقت ادا کروں جب ان کی قیمت ارزاں ہو، جو نزاع کا باعث ہے۔

اور یہ طریقہ پیغمبر اسلام اور اسلام کے مزاج کے بھی منافی ہے؛ کیوں کہ پیغمبر اسلام اور اسلام کو سہل الحصول اور سادگی کا طریقہ پسند ہے، مشکوۃ میں ہلال کے سلسلہ میں ایک حدیث ہے: "**إنا أمة أمية لا نكتب ولا نحسب**"، اس حدیث کا حاصل یہی تو ہے کہ رسول اللہ

ﷺ نے عوام کے لئے اس طریقہ کو پسند نہیں کیا جس کی وجہ سے عوام دقتوں، پریشانیوں اور مشکلات میں مبتلا ہو جائیں، یا قدم قدم پر کسی حساب کرنے والے کے محتاج ہوں۔

اور فقہاء نے جہاں عرف وعادت سے بحث کی ہے، وہاں یہ بھی لکھا ہے: "**يعمل بمثل ما عملوا من اعتبار تغيرات العرف وأحوال الناس وما هو أرفق بالناس وما ظهر عليه التعامل**" (رسم المفتی: ص ۹۷) اس میں خط کشیدہ عبارت پرانے طریقہ کی بھرپور تائید کر رہی ہے۔

لہذا جو پرانا طریقہ عرصہ سے چلا آرہا ہے اور عوام الناس کے لئے سہل وسادہ بھی ہے، اسی کو باقی رکھنا چاہئے اور پرانے طریقہ کو چھوڑ کر اس نئے طریقہ کو اختیار کرنے میں سہولت کو ختم کرنا، سرمایا داروں کو اور زیادہ سرمایادار بنانا، غریبوں کی ہمدردی کے بجائے ان کا اور زیادہ خون چوسنا اور لوگوں کو مشکلات اور تنگی میں ڈالنا ہے، جو کسی بھی طرح قابل ستائش نہیں ہوسکتا، اسلام کی سادگی اس مشکل صورت کو پسند نہیں کرتی جو بہت سے مشکلات اور پیچیدگیوں کی حامل ہے، جب کہ حدیث نبوی ہے: "**يسروا ولا تعسروا**" (آسانی پیدا کرو دشواری میں نہ ڈالو)، لہذا پرانے طریقہ کو باقی رکھنا ہی بہتر ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

موجودہ کرنسی اور اس کی شرعی حیثیت

مولانا محمد احسن عبد الحق ندوی ☆

کسی سے یہ بات مخفی نہیں کہ موجودہ دور بڑی تیزی کے ساتھ انقلاب سے دوچار ہے، سائنس کی ترقی، نئی نئی ایجادوں کو جنم دے رہی ہے اور ان سے نئے نئے مسائل ابھر رہے ہیں، ایسی ترقی جن کا انکار کوئی سمجھ دار انسان نہیں کرسکتا، پہلے جو چیزیں خواب وخیال تھیں اب وہ مشاہدہ میں آرہی ہیں اور لوگ ان سے بھرپور فائدہ اٹھا رہے ہیں، چنانچہ حکومت نے ابتداء میں جب نوٹ رائج کیا تو اس کو سند اور وثیقہ قرار دیا اور اس پر طبع کرایا کہ اس کا مال سونے یا چاندی سے دیا جائے گا۔

سوال: نوٹ کا جب نوٹ سے تبادلہ ہو تو کیا اس میں مالیت کے کم وبیش کی اجازت ہوگی یا نہیں؟

جواب: نوٹ ثمن عرفی ہے اور یہ ثمن خلقی کے قائم مقام ہے، تو جس طرح ثمن خلقی میں کم وبیش جائز نہیں، اسی طرح ثمن عرفی میں بھی کم وبیش جائز نہیں ہوگا، احناف میں امام محمد تفاضل کے جواز کے قائل نہیں ہیں۔

”وقال محمد: لا يجوز لأن الثمنية تثبت باصطلاح الكل فلا تبطل باصطلاحهما، وإذا بقيت أثماناً تتعين، فصار إذا كانا بغير أعيانها وكبيع الدرهم بالدرهمين“ (ہدایہ ۳/۶۵)۔

☆ مرکز الامام ابی الحسن الندوی، دارعرفات تکیہ کلاں رائے بریلی۔

(فلوس کی بیع میں امام محمد فرماتے ہیں کہ تفاضل جائز نہیں؛ کیوں کہ اس کی ثمنیت عوام کی اصطلاح میں ثابت ہو چکی ہے، تو دو شخصوں کے مان لینے سے وہ باطل نہیں ہوگی، اور جب وہ ثمن باقی رہے تو متعین نہیں ہوں گے، جیسا کہ غیر اعیان سے اور ایک درہم کا دو درہم کے عوض بیچنا درست نہیں ہے)۔

امام مالک کا مسلک بھی امام محمد کی طرح ہے، امام مالک نے فلوس کی بیع میں تفاضل کو کسی طرح بھی جائز قرار نہیں دیا ہے۔

"لأن مالكاً قال: لا يجوز فلس بفلسين ولا تجوز الفلوس بالذهب والفضة ولا بالدنانير نظرة" (المدونۃ الکبری ۷/ ۱۰۴)۔

(امام مالک فرماتے ہیں کہ ایک فلوس کا تبادلہ دو فلوس سے کیا جائے تو جائز نہیں ہوگا، اسی طرح فلوس کا تبادلہ سونے چاندی یا دنانیر سے کمی بیشی کے ساتھ جائز نہیں ہوگا)۔

کھوٹے سکوں کے تفاضل میں جو صاحب ہدایہ نے لکھا ہے اس سے بھی امام محمد کے مسلک کی تائید ہوتی ہے۔ صاحب ہدایہ تحریر فرماتے ہیں:

"وقال ومشايخنا لم يفتوا بجواز ذلك في العدالي والغطارفة لأنها أعز الأموال في ديارنا فلم أبيح التفاضل فيه ينفتح باب الربوا" (ہدایہ ۳/ ۹۳)۔

(صاحب ہدایہ فرماتے ہیں کہ ہمارے مشائخ نے عدالی اور غطارفہ کے سکوں میں بھی تفاضل کے جواز کا فتوی نہیں دیا ہے، اس لئے کہ وہ ہمارے دیار میں بیش قیمت مال شمار ہوتے ہیں، اگر تفاضل کو ان سکوں میں مباح کر دیا تو سود کا دروازہ کھل جائے گا)، اس لئے سداً للباب تفاضل کے نا جائز ہونے کا فتوی دینا لازم ہے۔

کرنسی سے متعلق دو سوالات کے جوابات:

سوال ۱- کیا شرعاً یہ صحیح ہوگا کہ دیون یعنی مؤخر مطالبوں مثلاً قرض، مہر، پینشن، ادھار

خریداری کی رقم اور وقت پر ادا نہ ہونے والی تنخواہوں کی ادائیگی کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کردیا جائے.....؟

جواب: دیون یعنی مؤخر مطالبوں میں جیسے قرض، مہر، پینشن اور ادھار خریداری کی رقم کی ادائیگی کو قیمتوں کے اشاریہ سے متعین کرنا نہ تو شرعاً جائز ہے اور نہ قیمتوں کے اشاریہ کے ذریعہ ادائیگی کے لئے کوئی متعین منضبط قاعدہ ہے، اور جو دقیق فنی قاعدے اس سلسلہ میں بیان کئے جاتے ہیں وہ عوام الناس کے فہم و ادراک سے بالاتر ہیں، جن کی وجہ سے عوام الناس کے درمیان قرض کی ادائیگی کے لئے قیمتوں کے اشاریہ کو معیار قرار دینا ایک مستقل تنازع کا سبب بھی بن جائے گا، اس کے علاوہ اس طریقہ کار سے سود کا دروازہ بھی کھل جائے گا، لہذا شرعی نقطہ نظر سے قیمتوں کے اشاریہ کا اعتبار کرنا کسی طرح بھی جائز قرار نہیں دیا جاسکتا۔

خلاصہ بحث:

راقم الحرف کے نزدیک مذکورہ بحث کا ماحصل یہ ہے کہ جتنی چیزوں کا سوال میں ذکر ہے ان کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنا شرعاً جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ موجودہ دور میں اگر اس کی اجازت دے دی گئی تو سود کا دروازہ کھل جائے گا اور یہ باہمی تنازع کا بھی موجب بنے گا؛ لہذا اس کی اجازت نہیں ہونی چاہئے۔ واللہ اعلم۔

سوال ۲- کیا یہ جائز ہوگا کہ نوٹوں کی شکل میں قرض دیتے وقت یا مہر کے تقرر کے وقت یا ادھار فروختگی کے وقت طرفین واجب الاداء نوٹ کی مالیت سونے یا چاندی میں طے کرلیں اور بوقت ادائیگی اسی قدر سونے یا چاندی کی قیمت کے مساوی نوٹوں کی ادائیگی عمل میں آئے؟

جواب ۲: حکومتوں کا نظام اب تک یہی رہا ہے کہ جس قدر قرض دیا گیا ہے، پانچ، دس سال بعد بھی اتنی ہی رقم واپس ہوتی ہے، اصل رقم میں کوئی اضافہ یا کمی نہیں ہوتی ہے۔ سود کے نام

پر جو اضافہ ملتا ہے اس کا تعلق اصل رقم کی کمی بیشی سے قطعاً نہیں ہوتا ہے۔

قدر و قیمت کے بڑھنے اور گھٹنے کے سلسلہ میں حدیث میں صراحت ملتی ہے کہ دراصل سامان کی قیمت بڑھنے کی وجہ سے ہی قیمت میں کمی بیشی کا مسئلہ پیش آیا ہے۔ یعنی ارزانی اور گرانی کا تعلق سامان اور اشیاء سے متعلق ہے، ثمن خلقی کی قدر میں کمی و بیشی سے نہیں ہے۔

''باب الاحتکار'' میں ایک حدیث ہے: "عن ابن عمر رضی الله عنهما قال: قال رسول الله ﷺ: من احتكر طعاماً أربعين يوماً يريد الغلاء فقد برئ من الله وبرئ الله منه" (مشکوۃ ۲۵۱/۲)۔

(اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو کھانے کا سامان چالیس دن دبا کر رکھے اور اس کا مقصد گراں کرنے کا ہو تو ایسا شخص اللہ سے بری ہے اور اللہ اس سے بری ہے)۔

اس حدیث میں گرانی کا تعلق جنس غلہ سے ظاہر کیا گیا ہے، روپے کی قدر میں کمی بیشی سے نہیں۔

اگر نوٹوں سے قرض کا معاملہ کیا جائے تو جتنی مدت کے بعد بھی اس کی ادائیگی ہوگی بعینہ اسی مقدار کے نوٹ واپس کرنے ضروری ہیں، ایک روپیہ کا بھی اضافہ جائز نہیں ہے۔ خواہ قیمتوں میں آسمان و زمین کا فرق ہو جائے ورنہ یہ سود ہو جائے گا، مثلاً کسی نے دس سال قبل ایک ہزار روپے قرض لئے تھے اور قرض کی ادائیگی آج کر رہا ہے تو وہ ایک ہزار روپے ہی واپس کرے گا، ایک روپے زیادہ دینا یا لینا سود کا موجب ہوگا۔

زیر بحث مسئلہ کے سلسلہ میں سب سے بہتر اور آسان صورت یہ ہے کہ قرض دیتے وقت یا دیون یعنی مہر مقرر کرتے وقت، اسی طرح ادھار فروختگی کے وقت طرفین واجب الاداء نوٹ کی مالیت سونے یا چاندی میں طے کرلیں اور بوقت ادائیگی اسی قدر سونے یا چاندی کی قیمت کے مساوی نوٹوں کی ادائیگی پر معاملہ کرلیں، مثلاً اس طرح کہ آج ایک تولہ چاندی کے برابر دس

ہزار روپے قرض میں دے رہا ہوں اور وصولیابی کے وقت ایک تولہ چاندی کے برابر روپے **لوں گا**، خواہ کتنے ہی نوٹوں کے برابر ہوں۔

خلاصۂ بحث:

راقم الحروف کا اس سلسلہ میں یہ خیال ہے کہ قرض دیتے وقت یا مہر وغیرہ مقرر کرتے وقت سونے چاندی کی مالیت طے کر لی جائے اور قرض یا مہر وغیرہ کی ادائیگی کے وقت اسی کے مطابق عمل کیا جائے، تاکہ طرفین کے مابین نزاع کا اندیشہ باقی نہ رہے۔ واللہ اعلم۔

موجودہ کرنسی کا حکم

مفتی سید باقر ارشد قاسمی بنگلوری ☆

۱- دیون یعنی مؤخر مطالبوں مثلاً قرض، مہر، پنشن، ادھار خریداری کی رقم اور وقت پر ادا نہ ہونے والی تنخواہوں کی ادائیگی کو قیمتوں کے اشاریہ کے نظام سے مربوط کر دینے میں کئی ایک مشکلات و الجھنیں پیدا ہو جائیں گی اور عوام الناس کے لئے یہ بڑی پیچیدگی والی بات ہوگی؛ کیونکہ اشاریہ میں سارا دار و مدار حساب و کتاب پر ہے اور حساب و کتاب ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔

دیون کی ادائیگی کے سلسلہ میں (کاغذی نوٹ یا موجودہ کرنسی کو ثمن عرفی مان لینے کے باوجود) دو پہلو ہیں اور دونوں ہی میں الجھن و کشمکش ہے۔

ایک پہلو یہ ہے اگر دینار و درہم کے جیسا ثمن نہ مانا جائے بلکہ قیمتوں کا لحاظ کیا جائے تو ایسی صورت میں سود کا دروازہ کھل جائے گا۔مثلاً دس سال پہلے اگر کسی نے سو روپے قرض لئے تو دس سال بعد اس کو روپے کی قدر کے مطابق سو سے زائد روپے قرض میں ادا کرنے ہونگے۔اور دس سال پہلے جو قدر روپے کی تھی، جو قیمت روپے کی تھی، اس قیمت و قدر میں اور اب دس سال بعد کی قیمت و قدر میں زمین آسمان کا تفاوت ہے۔

نیز معیار روپے کی قدر رکھ دیا جائے تو ایسی صورت میں عوام کو کاروباری سطح پر کافی

☆ سرپرست معہد یعقوب، چن پٹن، بنگلور، کرناٹک۔

مشکلات کا سامنا ہوگا، حساب و کتاب کا ایک مستقل نظام رکھنا پڑے گا اور یہ عوام کے لئے کافی دقت والا معاملہ ہے۔ کیونکہ حساب و کتاب کرنا ہر کس و نا کس کے بس کی بات نہیں، اور ایسا کرنے سے رسول اکرم ﷺ نے روکا بھی ہے کہ عوام کو زیادہ الجھنوں اور مشکلات میں ڈالا جائے اور ان کے لئے دین مشکل بنادیا جائے۔ اسلام ایک سادا مذہب ہے اور اس میں بجائے پیچیدگیوں کے عوام کو سہولتیں مہیا ہیں۔ چنانچہ ایک موقع پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ إنا أمة أمية لا نكتب و لا نحسب...... (صحیح البخاری رقم حدیث ۱۹۱۳، دار الکتاب العربی، بیروت)۔ یعنی ہم امی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں جو دقیق حساب و کتاب نہیں جانتی۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر نوٹ کو دینار و درہم کی جگہ مان لیا جائے اور ان کو دینار و درہم جیسا ثمن قرار دیا جائے تو مطلب یہ نکلتا ہے کہ چند سال قبل اگر کسی نے سو روپے بطور قرض لئے تھے، اب اس کو سو روپے ہی کی ادائیگی لازم ہے نہ کہ آج کی کرنسی کی قدر کے مطابق زائد دینے کی ضرورت ہے۔ سو روپے سے اوپر ایک روپے کا اضافہ بھی سود میں داخل ہوگا۔ اور ایسا کرنا جائز نہیں۔ حالانکہ اس میں قرض دینے والے کا نقصان ہے اور قرض لینے والا فائدہ میں رہتا ہے؛ کیونکہ دس سال پہلے کی روپے کی قدر میں اور آج دس سال بعد روپے کی قدر میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ایک نقصان یہ ہے کہ روپے کی قدر میں کمی آرہی ہے لیکن اس سے بڑا نقصان یہ ہو رہا ہے کہ سود کا دروازہ کھل رہا ہے، سود خوروں کو اذن عام دیا جارہا ہے کہ وہ حیلے بہانوں سے سود کھائیں اور غریب عوام کو لوٹیں، نیز آپسی رشتوں میں بھی سود کا چلن عام ہوجائے گا، شوہر کے لئے لازم ہوگا کہ وہ بیوی کا مہر روپے کی قدر کے مطابق زائد ادا کرے، اور یہ سود ہوگا، اس سے کئی ایک مفاسد کے کھلنے کا اندیشہ ہے۔ اسی لئے فقہ کا اہم ترین و مشہور قاعدہ ہے: **الضرر الأشد يزال بالضرر الأخف**، یعنی شدید نقصان خفیف نقصان کو گوارا کرکے دور کیا جائے۔

ایک اور نکتہ یہ ہے کہ عام طور سے یہ مشہور ہے کہ کرنسی کی قدر گر گئی، حالانکہ ایسا نہیں ہے،

کرنسی تو وہی ہے، دس سال پہلے جو سو کا نوٹ تھا وہی نوٹ اب نئے ایڈیشن، نئے ڈیزائن کے ساتھ چھپ رہا ہے۔ اصل بات قیمتوں میں اضافہ کی نہیں اشیاء کی گرانی کی ہے۔ اشیاء گراں ہوجاتی ہیں، آسانی سے دستیاب نہیں ہوتیں؛ لہٰذا اس کو خریدنے کے لئے زیادہ کرنسی کی ادائیگی ضروری ہوجاتی ہے۔ پہلے جو چیز آسانی سے دستیاب ہوتی تھی اب اس کی فراہمی مشکل ہوگئی۔ ملک کے اقتصاد پر اثر پڑتا ہے تو حکومت ٹیکس میں اضافہ کرتی ہے، قحط سالی کے موقع پر چونکہ پیداوار ہی کم ہوتی ہے اور وہ ملک کے عوام کو نا کافی ہوتی ہے لہٰذا اس کا حصول مشکل ہوجاتا ہے اور جو چیز مشکل سے حاصل ہوتی ہے اس کی قیمت میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ یعنی روپیہ تو وہی رہتا ہے، اشیاء کی قیمتوں میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ جیسا کہ عہد رسول اکرم ﷺ میں دیت آٹھ سو دینار یا آٹھ ہزار درہم تھی، اور یہ اسی طرح باقی رہی، یہاں تک کہ حضرت عمرؓ نے اپنے دور خلافت میں خطبہ دیا اور فرمایا کہ اب اونٹ مہنگے ہوگئے ہیں۔ پھر آپ نے سونا والوں پر ایک ہزار دینار اور چاندی والوں پر بارہ ہزار درہم دیت مقرر کی۔ چنانچہ ابوداؤد میں ہے: **عن عمرو بن شعیب عن أبیه عن جده قال کانت قیمة الدیة علی عهد رسول الله ﷺ ثمان مائة دینار أو ثمانیة آلاف درهم، ودیة أهل الکتاب یومئذ النصف من دیة المسلمین، قال: فکان ذلک کذلک حتیٰ استخلف عمر فقام خطیباً: فقال ألا أن الإبل قد غلت قال: ففرضها عمر علی أهل الذهب ألف دینار و علیٰ أهل الورق اثنی عشر ألفاً** ....الخ (ابوداؤد، رقم حدیث: ۴۵۴۲، مکتبۃ المعارف الریاض)۔

لہٰذا موجودہ کرنسی ثمن عرفی ہے اور اس کو وہی مقام حاصل ہوگیا ہے جو مقام دینار و درہم کا تھا۔ اس لئے اس کرنسی میں دیون کا جو بھی معاملہ کیا جائے بعد مدت کے ادائیگی میں اتنی ہی مقدار میں لوٹانا چاہئے، اسپر ایک روپیہ کا اضافہ بھی سود میں داخل ہے۔

اس سلسلہ میں کہا یہ جاتا ہے کہ قرض والے کا نقصان ہے، لیکن یہاں یہ بھی بات ذہن

میں رکھنی ہوگی کہ قرض دینے والا قرض مدد و ہمدردی کے جذبات کے تحت دیتا ہے نہ کہ سودابازی یا کاروبار کے لئے، لہذا اس میں نفع نقصان کی بات ہی نہیں، قرض، مہر، پنشن، ادھار خریداری وغیرہ میں اختیار ہے چاہے تو دے یا نہ دے مثلاً مہر اسی وقت عورت مانگ سکتی ہے لیکن اس میں مہلت ہمدردی کے جذبات کے تحت ہے۔

دوسری غور طلب بات یہ ہے کہ کیا قرض دینے والا دس سال پہلے قرض نہ دیتا اور وہ رقم اپنے پاس رکھتا تو کیا وہ رقم اس کے پاس موجودہ قدر کے حساب سے بڑھ جاتی؟ جو وہ قرض دار سے وصول کرنا چاہتا ہے۔ چاہے قرض دے یا نہ دے اس کی رقم کی قدر میں گراوٹ کا ہونا لازمی ہے۔ ہاں اس نے اپنے ایک بھائی کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کیا اور اس کی مدد کردی جس کا اجر اس کے لئے دنیا یا آخرت میں مختص ہے۔

فی الجملہ دیون یعنی موخر مطالبوں مثلاً قرض، مہر، پنشن، ادھار خریداری کی رقم اور وقت پر ادا نہ ہونے والی تنخواہوں کی ادائیگی کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنا درست نہ ہوگا۔ کیونکہ ایسا کرنے سے غریبوں کی مشکلات میں اضافہ ہوگا؛ عوام کے لئے کاروباری دقتوں میں زیادتی ہوگی اور سود کا اور اس کے مفاسد کا دروازہ کھل جائے گا۔

۴ - اب چونکہ موجودہ کرنسی کو ثمن عرفی کی حیثیت حاصل ہے اور دینار ودرہم کے قائم مقام ہے تو ایسی صورت میں نوٹوں کے ذریعہ ہی تمام معاملات طے کئے جاسکتے ہیں۔ شریعت نے دین کو آسان رکھا ہے۔ اب سونے وچاندی کی مالیت کے نوٹوں میں دیون کا معاملہ طے ہو تو یہ پیچیدگی پھر بھی باقی رہے گی کہ دونوں کو سونے وچاندی کے نرخ کا علم رکھنا ہوگا اور اس کا حساب وکتاب بھی رکھنا پڑے گا۔ یہ چیز عوام کے لئے تکلیف دہ ہے۔ لہذا جب یہ بات واضح ہے کہ دنیا میں موجودہ کرنسی کا چلن اتنا عام ہے اور اس کو ثمن عرفی کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے اور لوگ بلا تکلف اسی سے اپنے معاملات طے کررہے ہیں تو اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ طرفین آپس میں

معاملہ بجائے نوٹوں کے سونے و چاندی میں کریں، کیونکہ ایسا کرنا شرعاً جائز بھی نہیں ہے۔

چنانچہ اسی سلسلہ میں اس حدیث سے استدلال کیا جاسکتا ہے کہ: **عن عبادة ابن الصامت قال :قال رسول الله ﷺ: الذهب بالذهب و الفضة بالفضة و البُر بالبُر و الشعير بالشعير والتمر بالتمر و الملح بالملح مثلا بمثلٍ سواءً بسواءٍ يدا بيدٍ فإذا اختلف هذه الأصناف فبيعوا كيف شئتم إذا كان يداً بيدٍ** (صحیح مسلم: باب الصرف وبیع الذہب بالورق نقداً، ص ۶۸۵، دار الغد الجدید، مصر)۔ یعنی رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ سونے کو سونے کے بدلے اور چاندی کو چاندی کے بدلے، گیہوں کو گیہوں کے بدلے، جو کو جو کے بدلے، کھجور کو کھجور کے بدلے اور نمک کو نمک کے بدلہ میں برابر کر کے ہاتھ در ہاتھ فروخت کرو۔ اور اگر جنس بدل جائے تو پھر جس طرح چاہے فروخت کرو مگر شرط یہ ہے کہ ہاتھ در ہاتھ یعنی نقد ہو ادھار نہ ہو۔

اس حدیث میں اللہ کے رسول نے نقد معاملات طے کرنے کا حکم دیا ہے اور ایسے معاملات کو ادھار کرنے سے منع فرمایا ہے۔ اس لئے بہتر ہے کہ عرف عام میں موجودہ کرنسی کا چلن ہے اور لوگ بلا جھجک نوٹوں ہی کے ذریعہ اپنے معاملات طے کر رہے ہیں، لہذا یہی صورت حال برقرار رہے تا کہ عوام کے لئے سہولت وآسانی کا سبب بنے۔

چنانچہ رسم المفتی میں لکھا ہے: **يعمل بمثل ما عملوا من اعتبار تغيرات العرف و أحوال الناس وما هو الأرفق بالناس وما ظهر عليه التعامل** (ص۷۹) یعنی عرف اور عوام کے احوال بدل جانے سے جس پر عوام عمل کر رہے ہوں اسی پر عمل کیا جائے گا جو عوام کے لئے زیادہ سہولت کا باعث ہو اور جس پر تعامل بھی غالب آچکا ہو۔

خلاصہ کلام:

☆ اب موجودہ کرنسی اور اشیاء میں در کار تناسب نہ رہا جس کی وجہ سے اشیاء کی قیمتوں

میں اضافہ ہوگیا، جس کو عام طور پر کرنسی کی قدر میں گراوٹ سے تعبیر کیا جاتا ہے، جب کہ اشیاء گراں ہوئی ہیں، کرنسی کی قدر میں کمی نہیں۔

☆ زمانہ جدید میں موجودہ کرنسی دینار ودرہم یعنی سونے و چاندی کے قائم مقام ہوگئی ہے اور اس کو ثمن اصطلاحی وثمن عرفی کی حیثیت حاصل ہوچکی ہے۔لہذا اس کرنسی میں دیون کا جو بھی معاملہ کیا جائے بعد مدت ادائیگی کی صورت میں اتنی ہی مقدار میں لوٹانا چاہئے، اس پر ایک روپے کا اضافہ بھی سود میں داخل ہے۔

☆ دیون کے سلسلہ میں ادائیگی کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنا عوام کے لئے باہمی تنازع ووقت کا بھی باعث ہے۔

☆ حدیث میں اللہ کے رسول ﷺ نے نقد معاملات طے کرنے کا حکم دیا ہے اور جنس بدل جانے کی صورت میں ادھار معاملات سے منع کیا ہے۔

☆ نیز چونکہ موجودہ کرنسی ثمن عرفی واصطلاحی کی حیثیت کی حامل ہے، کرنسی ہی کے ذریعہ تمام معاملات کئے جائیں۔اسی میں عوام کے لئے سہولت ہے۔ھذا ما عندی واللہ تعالی اعلم۔

موجودہ کرنسی اور شرعی نقطہ نظر

مولوی ارشد شاداب ندوی ☆

موجودہ زمانہ بڑی تیزی کے ساتھ انقلابات سے دوچار ہے، سائنس کی ترقی، نئی ایجاد اور نئی تدبیروں کو جنم دے رہی ہے، ان سے نئے مسائل ابھر رہے ہیں، ان حالات وانقلابات نے دین کے ان احکام ومسائل کو بھی متاثر کیا ہے، جو مجتہد فیہا ہیں، اور منقول ومنصوص نہیں ہیں، انہی میں سے ایک اہم مسئلہ ''موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت'' ہے۔

کرنسی انسانی سماج میں بہت بڑی ضرورت ہے، کیوں کہ انسان اپنی ضروریات کو خرید فروخت کے بغیر پورا نہیں کرسکتا اور خرید فروخت میں ایک ایسی شئی کا وجود ضروری ہے، جسے اشیاء کے تبادلہ کا ذریعہ مانا گیا ہو، اللہ تعالی نے جہاں انسانی غذا کی ضرورت کے لئے اجناس، پھل اور ترکاریاں پیدا فرمائیں اس کی دوسری ضرورتوں کے لئے مٹی، پتھر اور لکڑی وغیرہ کو وجود بخشا، اسی طرح اشیاء کے تبادلہ میں ذریعہ ووسیلہ بنانے کے لئے سونا چاندی کو پیدا فرمایا، لیکن نظام معیشت اور تبادلہ زر میں آنے والی تبدیلی کے باعث مختلف چیزیں اس کی جگہ لیتی رہی ہیں، اس وقت پوری دنیا میں اس مقصد کے حصول کے لئے کاغذی نوٹ جاری ہیں۔ اور اس وقت کاغذی نوٹ کو ثمن اصطلاحی کی حیثیت حاصل ہے۔ تو اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی کے ذمہ دس سال پہلے کسی کے سو نوٹ بطور دین قرض واجب الاداء ہو جائیں تو کیا وہ شخص محض صوری

☆　تاج رتن اسٹور رام بابو مارکٹ ہلی روڈ، مہوا ضلع ویشالی، بہار۔

اورعددی طور پر اس دین قرض کے برابر نوٹ ادا کرنے سے فارغ الذمہ قرار دیا جائے گا، اور کیا ان دونوں نوٹوں میں مالیت اور قیمت خرید میں تفاوت فاحش کے باوجود محض عددی وصوری مساوات کی بنیاد پر ایک کو دوسرے کا مثل تسلیم کیا جائے گا؟ یا دقیق فنی اصول اور اشاریہ کے ذریعہ قرض ادا کرے گا؟

اس تناظر میں فقہی تصریحات پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ قرض ادا کرنے میں تماثل لازم وضروری ہے یعنی جتنا قرض لیا تھا اتنا ہی واپس کرے گا، مثلاً زید نے بکر سے دس سال پہلے دوسو (۲۰۰) روپے لیا تھا تو اب زید بکر کو دس سال بعد دوسو (۲۰۰) روپے ہی ادا کرے گا خواہ اس کی خرید فروخت میں زمین وآسمان کا فرق ہی کیوں نہ ہو جائے۔ اس کی مالیت کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا جائے گا۔

چنانچہ علامہ ابن قدامہؒ اپنی کتاب المغنی میں لکھتے ہیں:

"إن المستقرض يرد المثل في المثليات سواء رخص سعره أو غلا أو كان بحاله ولو كان ما أقرضه موجودا بعينه فرده من غير عيب يحدث فيه لزم قبوله سواء تغير سعره أو لم يتغير" (المغنی لابن قدامہ ۴/ ۳۶۰ مطبوعہ بیروت لبنان)۔

(قرض خواہ مثلیات میں مثل ہی واپس کرے گا خواہ اس کی قیمت کم ہوگئی ہو، بڑھ گئی ہو یا جوں کا توں ہو، اگر قرض لی ہوئی چیز بعینہ موجود ہو اور کوئی عیب پیدا ہوئے بغیر اس کو لوٹا دے تو قرض دہندہ کے لئے اس کو قبول کرنا لازم ہے، خواہ اس کی قیمت میں کوئی تبدیلی ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو)۔

ہدایہ میں ہے:

"المماثلة بين الشيئين باعتبار الصورة والمعنى" (ہدایہ مع الفتح ۷/ ۷)۔

(دونوں چیزوں کے درمیان صورت ومعنی کے اعتبار سے مماثلت ہو)۔

علامہ کاسانیؒ بدائع الصنائع میں لکھتے ہیں:

"والمثل المطلق هو المثل صورة ومعنى فأما القيمة فمثل من حيث المعنى دون الصورة" (بدائع الصنائع ۴/۲۰۱)۔

(تماثل مطلق اس وقت ہوگا جب کہ صورۃً ومعنیً تماثل پایا جائے، جہاں تک بات رہی قیمت کی تو یہ معناً تماثل ہے نہ کہ صورۃً)۔

بلغۃ السالک میں ہے:

" أخذ بمثله ولا ينظر للسعر الرافع" (بلغۃ السالک ۲/۲۱۲)۔

(مثل لیا جائے گا، گراں ہوتی قیمت پر توجہ نہیں کیا جائے گا)۔

علامہ نوویؒ فرماتے ہیں:

"إذا أقرض شيئا له مثل كالحبوب والادهان، والدراهم والدنانير وجب على المقترض رد مثلها لأنه أقرب إليه (شرح المہذب ۱۲/۲۱۵، دارالتراث بیروت)۔

(اگر مثلی چیز مثلاً دانے، تیل، دراہم، دنانیر قرض دیا جائے تو مقروض پر اسی کے مثل واپسی واجب ہوگی؛ کیوں کہ یہی اس کے قرض سے قریب ترین ہے)۔

علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

"يجب عليه رد مثله إن كان ذوات الأمثال كالمكيل والموزن والعدد الذى لا يتفاوت" (مجموعۂ رسائل ابن عابدین، تنبیہ الرقود فی احکام النقود ۵۶)۔

(اگر ذوات الامثال کے قبیل کی چیزیں ہیں مثلاً کیلی، موزونی اور ایسا عددی جس میں بہت زیادہ تفاوت نہیں ہوتا ہے تو قرض خواہ پر اس کی مثل لوٹانا واجب ہے)۔

مذکورہ بالا تمام فقہی عبارتوں سے پتہ چلتا ہے کہ قرض ادا کرنے میں تماثل وبرابری ضروری ہے، تعارف کسی طرح بھی جائز نہیں ہے؛ کیوں کہ قیمتوں کی کمی وبیشی ایک اضافی چیز

ہے، حقیقی نہیں ہے۔ مثلاً جس وقت قرض لیا تھا اس وقت ایک کتاب کی قیمت ایک سو روپے تھی جب کہ آج اس کی قیمت دو سو روپے ہے، تو کیا کہا جائے گا کہ کتاب کی قیمت بڑھ گئی یا روپے کی قیمت گھٹ گئی؟ تو عام بول چال اور عرف میں گرانی کی اضافت سامان کی طرف کیا جاتا ہے۔ یعنی کتاب کی قیمت بڑھ گئی یا سبزی وغیرہ کی گھٹ گئی، یہی بات صحیح معلوم ہوتی ہے کیوں کہ روپیہ تو ثمن ہے، اس کی قیمت کیا گھٹے گی یا بڑھے گی؟ وہ اپنے حال پر قائم ہے، البتہ اس کے مقابلے میں جو سامان خریدا گیا ہے وہ گراں ہو گیا ہے، یعنی ارزانی و گرانی کا تعلق سامان اور اشیاء سے متعلق ہے، چونکہ احادیث کو دیکھنے سے بھی یہی پتہ چلتا ہے:

عن معاذؓ قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول: بئس العبد المحتكر إن أرخص الله الأسعار حزن وإن أغلاه فرح" (مشکوٰۃ ۲۵۱ باب الاحتکار)۔

(حضرت معاذؓ سے مروی ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ذخیرہ اندوزی کرنے والا بہت ہی بد بخت شخص ہے اگر اللہ تعالیٰ نرخ کم کردے تو غمزدہ ہوتا ہے اور اگر بڑھادے تو خوش ہوتا ہے)۔

اس حدیث میں گرانی کا تعلق نرخ سے ظاہر کیا گیا ہے، روپے کی قدر میں کمی وبیشی نہیں کیا گیا ہے۔ اسی طرح ایک دوسری حدیث میں ہے:

"**عن أنس قال: غلا السعر على عهد النبي ﷺ فقالوا: يا رسول الله! سعر لنا**" (مشکوٰۃ ۲۵۱ باب الاحتکار)۔

(حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ عہد نبوی میں جب نرخ میں گرانی آئی تو صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! ہمارے لئے نرخ متعین فرمادیجئے)۔

یہاں بھی دیکھئے کہ صحابہ کرام نے غلہ اور دوسری چیزوں کی قیمتوں کو مقرر کردینے کی درخواست کی ہے، کہ یہ طے ہو کہ فلاں چیز کا نرخ یہ ہے۔ ان احادیث کی روشنی میں یہی بات سمجھ

میں آتی ہے کہ قیمت میں ارزانی وگرانی سامان واشیاء میں ہوتی ہے۔ جب سامان کی قیمت زیادہ ہوتی ہے تو قیمت بڑھ جاتی ہے۔ اور جب سامان کی قیمت کم ہوتی ہے تو قیمت بھی کم ہوجاتی ہے۔ یہ کہنا کہ روپئے کی قوت خرید کم ہوگئی ہے صحیح نہیں ہے۔

قرض کو اشاریہ اور دقیق فنی اصول سے وابستہ کرنا نہ شرعاً درست ہے نہ عملاً ممکن ہے۔ شرعاً تو اس لئے کہ یہ سود کی صورت ہوگی؛ کیوں کہ ایک ہی جنس کا اضافہ کے ساتھ تبادلہ ہے۔ نہیں تو کم از کم ربا کا شبہ تو ضرور پایا جارہا ہے۔ اور آپ ﷺ نے ربا اور ریبہ دونوں سے منع فرمایا ہے، چنانچہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

''دع ما یریبک إلی ما لا یریبک'' (ترمذی: ۲۵۱۸)۔

علامہ ابن ہمام فتح القدیر میں لکھتے ہیں:

''شبهة الربا مانعة كحقيقة الرباء لإجماع على منع بيع الأموال الربوية مجازفة وإن ظن التساوي'' (فتح القدیر ۷/۱۱)۔

عملاً اس لئے ممکن نہیں ہے کہ اشاریہ میں کس چیز کو بنیاد بنایا جائے گا؟ بعض مرتبہ اناج کی قیمت بڑھتی ہے لیکن سونے کی قیمت نہیں بڑھتی اور بعض مرتبہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ اسی طرح دوسری اشیاء کا معاملہ ہے یعنی قیمت کے گھٹنے وبڑھنے کا کوئی اصول نہیں ہے اور نہ یہ ضروری ہے کہ اگر ایک چیز کی قیمت گھٹ یا بڑھ گئی ہو تو دوسری چیز کی قیمت بھی اسی تناسب سے گھٹے یا بڑھے گی، اور اگر کوئی اشارہ بنا دیا گیا جیسا کہ حکومت ملازمین کی اجرت میں مہنگائی بھتہ کے اضافہ کے لئے بناتی ہے تو کرنسی کی قیمت میں ہر وقت کمی وبیشی کا عمل کرتے رہنا ہوگا، ظاہر ہے کہ یہ ذہنوں کو الجھا دینے والی اور باہمی نزاع کا باعث ہوگی، اس لئے اشاریہ کو معیار بنانا درست نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے گھٹتی وبڑھتی نرخ کا اعتبار نہیں کیا ہے۔

ردالمحتار میں ہے:

''وإن استقرض دانق فلوس أو نصف درهم فلوس ثم رخصت أو غلت لم يكن عليه إلا مثل عدد الذي أخذه...... ولا ينظر إلى غلاء الدراهم ولا إلى رخصها'' (ردالمحتار ۷/ ۳۹۰)۔

(اگر کسی نے ایک فلوس کا دانق یا نصف درہم قرض لیا پھر بعد میں فلوس کی قیمت ارزاں یا گراں ہوگئی تو قرض خواہ پر اتنا ہی واجب ہوگا جتنا کہ اس نے لیا تھا، دراہم کے گراں ہونے اور ارزاں ہونے پر توجہ نہیں دی جائے گی)۔

علامہ حصکفیؒ لکھتے ہیں:

''استقرض من الفلوس الرائجة والعدالي فكسدت فعليه مثلها....... ولا يغرم قيمتها....... أنه مضمون بمثله فلا عبرة بغلائه ورخصه'' (الدرالمختار مع رد المحتار ۷/ ۳۹۰)۔

(اگر کسی نے رائج اور عدالی فلوس قرض لیا پھر چلن بند ہوگیا تو قرض خواہ پر اس کا مثل واجب ہوگا تاوان میں اس کی قیمت ادا نہیں کرے گا، بلکہ اسی کے مثل کا ضامن ہوگا، چنانچہ اس کی گرانی وارزانی کا اعتبار نہیں کیا جائے گا)۔

علامہ شامیؒ اپنے رسالہ تنبیہ الرقود فی احکام النقود میں لکھتے ہیں:

''أن الفلوس إذا لم تكسد ولكن غلت قيمتها أو رخصت فعليه مثل ما قبض من العدد'' (مجموعہ رسائل ابن عابدین: تنبیہ الرقود فی احکام النقود: ۶۰)۔

اگر فلوس کا چلن بند نہ ہو، لیکن اس کی قیمت گھٹ یا بڑھ جائے تو قرض خواہ پر اتنی ہی مقدار واجب ہوگی جتنا کہ اس نے لیا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ دقیق فنی اصول کو اپنانا اسلامی مزاج کے بالکل خلاف ہے، کیوں کہ اسلام میں سادگی ہے اور سادگی کو پسند کرتا ہے۔ باریک تشقیقات اور خواہ مخواہ کی موشگافیاں

اسلام کو پسند نہیں ہے۔ خصوصا اس وقت جب کہ عوام الناس کے پریشان ہونے کا سبب ہو، حضور اکرم ﷺ کا یہ مشہور فرمان ہمارے سامنے ہے: **نحن أمة أمية لا نكتب ولا نحسب** (بخاری ۱/۲۵۶) کہ ہم امی جماعت ہیں حساب وکتاب نہیں جانتے، ہمارے خیال میں اس حساب وکتاب کا مطلب یہی ہے کہ باریک حسابات اور فنی تشقیقات جو عوام کی دسترس سے باہر ہوں وہ اسلام کو پسند نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام ہمیشہ ایسا اصول اپناتا ہے جس میں سادگی اور عوام وخواص دونوں کے لئے یکساں دلچسپی کا حامل ہو۔ نیز عرف عام میں بھی قرضوں اور واجبات کی ادائیگی خواہ کتنے ہی عرصہ بعد کیوں نہ ہوا تنے ہی روپے ادا کی جاتی ہے جتنے روپے اس نے لئے تھے یا واجب تھے۔ لہذا اس عرف کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ مثل ہی واجب کیا جائے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ نوٹ میں کمی وبیشی کا اختیار کسی عام شخص کو حاصل نہیں ہوسکتا ہے بلکہ یہ اختیار حکومت وقت کو ہی حاصل ہوسکتا ہے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ حکومت وقت بھی کرنسی نوٹ میں اضافہ کو تسلیم نہیں کرتی ہے؛ کیوں کہ اگر کوئی شخص بینک میں کچھ روپے جمع کرتا ہے دس بیس سال بعد اتنا ہی روپیہ واپس ہوتا ہے جمع شدہ اصل رقم میں کوئی اضافہ یا کمی نہیں ہوتی ہے۔ مثلاً بیس سال پہلے زید نے بینک میں پانچ سو روپے جمع کیا تھا بیس سال بینک وہی پانچ سو روپے واپس کرتا ہے۔ جو زائد رقم ہوتی ہے اس کا تعلق اصل رقم سے نہیں ہوتا ہے بلکہ یہ سود کے نام پر ملتا ہے۔ یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ حکومت کے نزدیک بھی نوٹ کی قیمت یکساں رہتی ہے خواہ اشیاء کے قیمت میں کتنا ہی اضافہ کیوں نہ ہوگیا ہو۔ مگر نوٹ اپنی حالت پر برقرار رہتا ہے۔

جہاں تک اس کا تعلق ہے کہ قرض دینے والے کا نقصان ہوگا اور اس کا حق مارا جائے گا نیز اس کے ساتھ عدل وانصاف نہیں ہو سکے گا، یہ اعتراض درست نہیں ہے، بلکہ علماء مثل لوٹانے کو ہی عین انصاف قرار دیتے ہیں، چنانچہ علامہ سرخسیؒ فرماتے ہیں:

"لأن المقصود هو الجبران وذلک فی المثل أتم، لأن فيه مراعاة

الجنس والمالية وفي القيمة مراعاة المالية فقط فكان إيجاب المثل أعدل" (المبسوط ۱۱/ ۵۰)۔

(اصل مقصود نقصان کی تلافی کرنا ہے اور یہ چیز مثل میں بدرجہ اتم موجود ہے اس لئے کہ اس میں جنس و مالیت دونوں کی رعایت ہوتی ہے اور قیمت کی صورت میں صرف مالیت کی رعایت ہوتی ہے اس لئے مثل واجب کرنا زیادہ قرین انصاف ہے)۔

علامہ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

"ولهذا كان من أوجب المثل في كل شيئ بحسب الإمكان مع مراعاة القيمة أقرب إلى العدل ممن أوجب القيمة من غير المثل" (مجموعہ فتاوی ابن تیمیہ: ۱۱/ ۳۵۲)۔

(اسی وجہ سے جنہوں نے حتی المقدور تمام چیزوں میں قیمت کی رعایت کے ساتھ مثل واجب قرار دیا ہے یہ عدل کے زیادہ قریب ہے بہ مقابلہ ان لوگوں کے جنہوں نے مثل کے بجائے قیمت کو واجب قرار دیا ہے)۔

فقہ کا مشہور کا قاعدہ ہے: الضرر الأشد يزال بالضرر الأخف (الاشباہ لابن نجیم: ۱۴۳ مطبوعہ دار النشر والاشاعۃ) جب دو ضرر لاحق ہوتو اخف کو برداشت کیا جائے گا اشد کو چھوڑ دیا جائے گا، یعنی کسی معاملہ کا دورخ ہو اور دونوں رخوں میں سے ہر رخ میں ضرر کا پہلو ہو تو بڑے ضرر سے بچنے کے لئے چھوٹے ضرر کو برداشت کیا جائے گا، اس صورت میں اگر چہ قرض دینے والے کو ضرر لاحق ہورہا ہے لیکن سود کے بڑے ضرر سے بچنے کے لئے اس کو برداشت کیا جائے گا۔

خلاصہ کلام یہ کہ قرض خواہ نے جتنا کرنسی نوٹ قرض لیا تھا قرض دہندہ کو اتنا ہی واپس کرے گا اس میں تفاوت کسی طرح بھی درست نہیں ہے؛ کیوں کہ یہ سود کا ذریعہ ہوگا اور ظاہر ہے سود اسلام میں قطعاً حرام ہے، دوسرے یہ کہ دقیق فنی اصول اسلام کی سادگی کے خلاف ہے اور

عاقدین کے باہمی نزاع کا سبب ہے۔ اور جو چیز مفضی الی النزاع ہو وہ درست نہیں ہے۔

۲- نوٹوں کی شکل میں دیئے ہوئے قرض کو سونے یا چاندی کی سالمیت میں طے کرنا اور بوقت ادائیگی اس قدر سونے یا چاندی کی قیمت کے مساوی نوٹوں کی ادائیگی پر معاملہ کرنا جائز نہ ہوگا، کیوں کہ یہ ربا کی صورت ہوگی، سوال میں مذکور صورت سود کی رقم کو جائز قرار دینے کا حیلہ ہے، اور حیلہ کے ذریعہ کسی حرام کو حلال نہیں کیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک بات رہی مہر کی، تو اول مرحلہ میں ہی سونے یا چاندی میں مہر متعین کر لے۔ ادائیگی کے وقت عورت چاہے تو بازار کے نرخ کے مطابق سونے یا چاندی کی قیمت وصول کر لے یا سونا ہی وصول کر لے، اس میں شرعاً کوئی حرج نہیں ہے (واللہ تعالیٰ اعلم)۔

خلاصہ بحث:

ا- قرض ادا کرنے میں تماثل لازم وضروری ہے، کسی طرح کا کوئی تفاوت جائز نہیں ہے۔

۲- مؤخر مطالبات کو دقیق فنی اصول سے وابستہ کرنا کسی طرح بھی جائز نہیں ہے؛ کیوں کہ اس میں ربا کا شبہ ہے اور لوگوں کے لئے پریشانی کا سبب ہے۔

۳- نوٹوں کی شکل میں دیئے ہوئے قرض کو سونے یا چاندی کی سالمیت میں طے کرنا درست نہیں ہے۔

۴- مہر میں اول مرحلہ میں ہی سونا یا چاندی متعین کرنا درست ہے بلکہ افضل ومستحسن ہے، اور زوجین کے لئے آسانی کا باعث ہے۔

چوتھا باب

مختصر تحریریں

موجودہ کرنسی پر دوسوال اور اس کا حکم

مولانا زبیر احمد قاسمی ☆

۱- دوسرے فقہی سمینار منعقدہ ۸ تا ۱۱ دسمبر ۱۹۸۹ء میں جن دو سوالات کے متعلق فیصلہ نہ ہو سکا تھا ان دونوں سوالوں کے سلسلے میں اپنی رائے میں اسی سمینار میں پیش کر چکا ہوں جو میرے مفصل اور بہت حد تک مدلل مقالہ شائع شدہ فقہی مجلّہ میں موجود ہے، اور میں نے جس رائے کا اظہار اس دن کیا تھا اس رائے سے پھیرنے والی کوئی دلیل اب تک میرے سامنے نہ آسکی۔ اس طرح میں آج تک اپنی سابقہ رائے پر قائم ہوں۔ اس دن میں نے وہی کہا تھا کہ یہ کاغذی نوٹ اگر چہ ذریعہ تبادلہ بن کر عرفی طور پر ثمن بن چکا ہے لیکن درحقیقت یہ ثمن نہیں بلکہ صرف وثیقہ ثمن ہے۔ چنانچہ سب ہی حضرات کاغذی نوٹوں کا قدر نصاب اسی خلقی ثمن سونے چاندی کے قدر نصاب کے پیمانے سے ناپ کر کبھی پانچ ہزار روپے کے مالک کو مالک نصاب قرار دیتے تھے تو کبھی دس ہزار روپے کو نصاب کہتے تھے، اور اب تقریباً پندرہ ہزار سے بھی کچھ زائد روپے کے مالک پر مالک نصاب ہونے کا حکم لگاتے ہیں۔ اسی طرح سارے ہی لوگ آئے ہی دن اس طرح کا معاملہ کرتے رہتے ہیں کہ کسی کو ایک ہزار کا ایک کاغذی نوٹ دے کر اس کے بدلے میں سو روپے کے دس نوٹ لیتے ہیں، عوضین کی تعداد اور گنتی وشمار میں اس کھلے ہوئے فرق کے باوجود کسی کے حاشیہ خیال میں بھی ربوا ہو جانے کا شبہ تک نہیں ہوتا، تو آخر کیوں؟ صرف اسی

☆ اشرف العلوم کنہواں، سیتامڑھی، بہار۔

وجہ سے نا کہ گو گنتی وشمار میں عوضین متفاوت ہیں مگر اپنی مالیت و قیمت میں دونوں برابر ہیں فلایکون ربوا۔

پھر وہ اللہ تعالیٰ جو غنی الاغنیاء ہے اس کے حق زکوۃ کے وجوب میں تو نوٹوں کی گنتی وشمار سے صرف نظر کرتے ہوئے اس کی قدر وقیمت اور مالیت پر نظر رکھتے ہوئے نوٹوں کا مختلف زمانے میں مختلف قدر نصاب ماننے اور منواتے آئے ہیں، لیکن یہ کیسی عجیب منطق ہے جو سمجھ میں نہیں آتی کہ اللہ کے ایک بندہ کے حقوق میں جو احوج المحتاجین ہے ہم نوٹوں کی قدر وقیمت اور مالیت سے صرف نظر کر کے صرف گنتی وشمار میں برابری کو کیوں ضروری سمجھنے لگتے ہیں۔ اور ایسا کس بنیاد پر کہا جاتا ہے کہ دس سال پہلے جو دس ہزار کاغذی نوٹ کسی نے کسی سے قرض لیا تھا، اس کی ادائیگی آج دس سالوں بعد بھی بس گنتی وشمار میں برابر دس ہزار نوٹ سے ہی ہو جائے گی، شمار و گنتی میں اگر ایک زائد نوٹ کا بھی مطالبہ ہوگا تو اکل ربوا ہو جائے گا، واعجباہ، جب کہ دس ہزار نوٹ کی جو قیمت و مالیت دس سال پہلے تھی آج اس کی مالیت اس کے نصف کے برابر بھی نہیں رہ گئی ہے۔

اس لئے ہماری رائے میں مؤخر مطالبوں قرض ومہر وغیرہ کی ادائیگی میں نوٹوں کی محض گنتی وشمار پر نظر رکھنا اور اس کی حقیقی قدر و مالیت سے آنکھ بند کر لینا اسلام کے عادلانہ نظام کے خلاف ہے، عدل کا تقاضہ یہی ہے کہ قدر و قیمت میں مساوات کو مدنظر رکھا جائے صرف گنتی وتعداد میں نہیں۔ تو ظاہر ہے کہ اسے قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کر کے اصل مقصد کو حاصل کرنا دشوار ہی ہوگا؛ بلکہ آسان تر صورت یہی ہو سکتی ہے کہ واجب الاداء نوٹوں کی مالیت سونے چاندی میں طے کر لیا جائے، اور بوقت ادائیگی اسی قدر سونے چاندی کے مساوی نوٹوں کی ادائیگی کو لازم کیا جائے، اس میں گو بظاہر سو روپے کے بدلے پانچ سو روپے کی بھی ادئیگی ہو سکتی ہے مگر یہ تفاوت صرف شمار و گنتی میں ہوگا ورنہ درحقیقت سابقہ سو روپے اور یہ حالیہ پانچ سو روپے بالکل مساوی ہی ہوں گے، کما هو الظاهر، هذا ما عندي و العلم عند الله۔

موجودہ کرنسی اور اس کی شرعی حیثیت

مفتی انور علی اعظمی ☆

۱- کیا مؤخر مطالبوں اور اجرتوں کی ادائیگی کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنا ممکن ہے؟

مذکورہ سوال کا جواب دینے سے قبل ضروری ہے کہ افراط زر اور تفریط زر کی وضاحت کی جائے۔

موجودہ معاشی اصطلاح میں ''افراط زر'' کا مطلب یہ ہے کہ کسی ملک میں مستقل کرنسی کی مقدار اس ملک کی اشیاء اور خدمات کے مقابلہ میں زیادہ ہوجائے جس کے نتیجہ میں اشیاء اور خدمات کی قیمت بڑھ جانے سے ملک میں مہنگائی پیدا ہوجائے؛ اس لئے کہ کسی ملک میں جاری شدہ کرنسی اشیاء اور خدمات میں طلب کی نمائندگی کرتی ہے اور ملک میں میسر اشیاء اور خدمات رسد کی نمائندگی کرتی ہیں اور جب رسد کے مقابلہ میں طلب زیادہ ہو جائے گی تو مہنگائی پیدا ہوجائے گی، یہ بات علم معاشیات کے بنیادی اصولوں کے ذریعہ واضح ہے۔

''تفریط زر'' کا مطلب یہ ہے کہ کسی ملک میں جاری شدہ کرنسی اشیاء اور خدمات کے مقابلہ میں کم ہوجائے جس کے نتیجہ میں اشیاء اور خدمات کی قیمت کم ہوکر ارزانی پیدا ہوجائے؛

☆ دار العلوم، مئو۔

اس لئے کہ جب اشیاء طلب سے زیادہ ہوجاتی ہیں تو بھاؤ گر جاتا ہے اور قیمت کم ہوجاتی ہے۔

افراط زر کے وقت روپے کی قوت خرید کم ہوجاتی ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ افراط زر کے وقت عدد کا اعتبار کرتے ہوئے جتنا روپیہ حق دار کا واجب تھا اتنا ہی ادا کرنے سے حق ساقط ہوگا یا روپئے کی قوت خرید گھٹنے سے عددی مقدار بڑھا کر اس کی تلافی کرنا ضروری ہوگا؟

چونکہ کاغذی نوٹوں کی خود کوئی مستقل قیمت نہیں ہے ان کی قیمت اشیاء کے اعتبار سے متعین ہوتی ہے، اس لئے بعض ماہرین معاشیات اس مشکل کا حل نکالنے کے لئے یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ کرنسی کی قیمت متعین کرنے کے لئے قیمتوں کے اشاریہ کو معیار بنایا جائے اور تمام حقوق اور واجبات کی ادائیگی میں قیمتوں کے اشاریئے کے ساتھ کرنسی کی قیمت کے تعلق کو بنیاد بنایا جائے اور مالی سال کے شروع میں ان اشیاء کی جو قیمت رائج ہو وہ درج کی جائے اور پھر سال کے اخیر میں جو قیمت رائج ہو وہ درج کی جائے اور دونوں نرخوں اور قیمتوں کے درمیان جو فرق ہو اس کا تناسب نکالا جائے اور اسی تناسب سے نوٹوں کی قیمت میں تغیر مانا جائے۔

قرضوں کو قیمتوں کے اشاریے سے منسلک کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ قرض دار قرض خواہ کو صرف قرض کے برابر روپے واپس نہ کرے بلکہ قیمتوں کے اشاریئے میں اشیاء کی قیمتوں میں جس تناسب سے اضافہ ہوا ہے اسی تناسب سے قرض میں اضافہ کے ساتھ واپس کرے۔ بعض ماہرین معاشیات اس کے جواز کے لئے یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ یہ زیادتی جو قرض دار قرض خواہ کو دے رہا ہے یہ حقیقی زیادتی نہیں ہے بلکہ یہ اسی مالیت کو واپس کر رہا ہے جو قرض دار نے بطور قرض اس سے لیا تھا، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ اس زیادتی کو جائز سمجھنے والوں کی یہ دلیل شرعی قواعد واصول سے میل نہیں کھاتی؛ اس لئے کہ شریعت اسلامیہ میں قرضوں کو اسی مقدار کے مثل ادا کرنا واجب ہے اس میں کسی کو اختلاف نہیں۔ جو لوگ قرضوں کو قیمتوں کے اشاریے سے جوڑنے کو صحیح مانتے ہیں وہ بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں؛ لہذا صرف مسئلہ یہ ہے کہ مثل سے کیا مراد

ہے؛ مثل (ناپ، وزن، عدد) میں برابری مراد ہے یا قیمت اور مالیت میں برابری ضروری ہے۔ چنانچہ قرآن وسنت کے دلائل میں غور کرنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ قرض کی واپسی میں جو برابری شریعت میں مطلوب ہے وہ مقدار اور کمیت کی برابری ہے قیمت اور مالیت کی برابری نہیں۔

چنانچہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت ابو سعید خدریؓ سے یہ روایت منقول ہے کہ حضور اقدس ﷺ کے زمانہ میں ہمارے پاس ہر قسم کی ملی جلی کھجوریں آیا کرتی تھیں۔ ہم گھٹیا کھجور کے دو صاع عمدہ کھجور کے ایک صاع کے بدلہ میں بیچ دیتے تھے۔ آپ ﷺ کو اطلاع ہوئی تو آپ ﷺ نے کہا کہ دو صاع کھجور ایک صاع کے بدلہ میں نہ بیچو۔ حالانکہ حضور ﷺ کو یہ بات معلوم تھی کہ جو کھجور دو صاع کے بدلہ میں بیچی جائے گی وہ دو صاع والی کھجور کے مقابلہ میں زیادہ قیمتی ہوگی؛ لیکن اس کے باوجود اللہ کے رسول ﷺ نے اس کی اجازت نہیں دی؛ بلکہ مقدار اور ناپ میں مماثلت اور برابری کا حکم دیا، اور قیمت کے فرق کا اعتبار نہیں کیا۔

یہ روایت اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اموال ربویہ میں تماثل اور یکسانیت مقدار میں مطلوب ہے قیمت میں نہیں۔

چونکہ قیمتوں کا اشاریہ اپنے تمام مراحل میں اندازہ اور تخمین پر مبنی ہے اگر کسی جگہ حساب بہت باریک بینی اور پوری احتیاط سے کیا جائے تو اس کے نتیجہ کو زیادہ سے زیادہ تقریبی کہا جا سکتا ہے یقینی اور واقعی نہیں کہا جا سکتا؛ جب کہ احادیث کی روشنی میں واضح ہے کہ قرضوں کی واپسی میں اٹکل اور اندازہ کی شرط لگانا جائز نہیں لہذا قرضوں کی ادائیگی کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنا کسی حال میں جائز نہیں۔ چنانچہ مولانا محمد تقی عثمانی تحریر فرماتے ہیں: تمام مالی معاملات میں قیمتوں کے اشاریہ کو عمل میں لانا ایک ایسا فعل ہے جس کا حصول عملاً ناممکن ہے (کرنسی کی قوت خرید، ص ۷۰)۔

اور اس طرح اشاریہ کو بنیاد بنا کر لین دین کی اجازت دینا عامۃ الناس میں مستقل

تنازع کا باعث ہے نیز اس طرح ایک سو روپے کے بدلہ پانچ سو روپے کی ادائیگی باب ربا کو کھولنے کا ذریعہ یقیناً بنے گی (بحوالہ کرنسی کی قوت خرید تکملۃ فتح الملہم ج ۱، ودرس ترمذی ج ۴، مولفات مولانا مفتی محمد تقی عثمانی)۔

۲-سونا یا چاندی کی قیمت کے مساوی نوٹوں کے ذریعہ واجب الاداء قرضوں کی ادائیگی؟

اس سوال کے جواب کی بنیاد یہ ہے کہ مہر کے تقرر یا ادھار فروختگی کے وقت حق دار پر جو چیز ذمہ میں واجب ہے وہ نوٹ ہے یا سونا چاندی، سوال سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بنیادی طور پر حقدار کے ذمہ جو چیز واجب الاداء ہے وہ نوٹ ہے۔ اور مستقبل کے اس خدشہ کے پیش نظر کہ نوٹوں کی اپنی کوئی مستقل قیمت نہیں ہوتی بلکہ نوٹ کی قیمت اشیاء ضروریہ کی قوت خرید ہے، جانبین اپنے اس خدشہ کو دور کرنے کے لئے نوٹ کی مقدار سونے یا چاندی کے ساتھ مقید کرتے ہیں۔ اس مسئلہ کا ایک آسان حل یہ ہے کہ درمیان سے نوٹ کا ذکر ہی نکال دیا جائے اور مہر کا تقرر سیدھے سیدھے ثمن حقیقی سونے یا چاندی میں کیا جائے۔ اسی طرح ادھار فروختگی کے لئے نوٹ کا ذکر کئے بغیر سونے اور چاندی کو طے کر دیا جائے۔ ایسا کرنے میں نہ کوئی شرعی رکاوٹ ہے اور نہ کوئی جھگڑا، لیکن نوٹ متعین کر کے اس کی مؤخر ادائیگی کو سونے یا چاندی کے ساتھ مقید کرنا نزاع کا باعث بھی ہے اور شرعی قاعدہ کے خلاف بھی؛ اس لئے کہ جب اس کے ذمہ نوٹ کی ایک مقدار طے ہے تو اس کی ادائیگی میں شرعی ضابطہ کے مطابق عدد میں مماثلت ضروری ہے۔ ایسی چیزوں میں قیمت اور مالیت کو بنیاد بنا کر کمی بیشی کرنا شرعاً درست بھی نہیں اور سود کا دروازہ کھولنا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت

مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی ☆

علم معاشیات میں کاغذی نوٹ اور کرنسی کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا تا ہے، ایک کو زر معیاری اور دوسرے کو غیر زر معیاری کہتے ہیں، زر معیاری تو وہ ہے جس کے عوض ریزرو بینک آف انڈیا یا دوسرے بینکوں نے اتنی ہی مالیت کا سونا محفوظ کر رکھا ہے، زر معیاری کی حد تک کرنسی کی حیثیت ثمن کی نہیں، وثیقہ ثمن کی ہے۔ اسلئے ایک روپے کے نوٹ یا سکہ کو چھوڑ کر کاغذ کے تمام کرنسی پر ہندوستان میں لکھا ہوتا ہے:

''میں دھارک کو............دینے کا وچن دیتا ہوں''۔

ہندوستان کی حد تک صرف ایک روپے کا نوٹ غیر معیاری زر سمجھا جاتا تھا، جس پر ایسی کوئی تحریر نہیں ہوتی تھی اور نہ ہی اس کے عوض از روئے بینک کوئی سونا مختص کرتا تھا، لیکن اب صورت حال بدل گئی ہے، آج کے گلوبل ایج میں اور بڑھتی ہوئی ضرورتوں کے پیش نظر بینک نے غیر معیاری زر کے انداز میں دوسرے نوٹ بھی چھاپنے شروع کر دیے، جس کے نتیجے میں افراط زر کی صورت حال پیدا ہوگئی، اس لئے اب ان کی حیثیت وثیقہ کی نہیں، ثمن اصطلاحی کی ہے۔ البتہ اس کی حقیقی قدر متعین کرنے کے لئے سونا چاندی آج بھی معیار ہے اور ماہرین معاشیات کی طرف سے مقرر کردہ اندازہ پر مبنی اشاریہ بڑی حد تک آج بھی اسی پر منحصر ہے۔

☆ نائب ناظم امارت شرعیہ، بہار اڑیسہ و جھارکھنڈ۔

۱- اس صورت حال کے باوجود، دیون یعنی مؤخر مطالبوں مثلاً قرض، مہر، پنشن، ادھار خریداری کی رقم اور وقت پر ادانہ ہونے والی تنخواہوں کی ادائیگی کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنا صحیح نہیں ہوگا، بلکہ محض عددی وصوری مساوات کی وجہ سے ایک کو دوسرے کا مثل تسلیم کیا جائے گا، اس لئے کہ قرض کی ادائیگی میں تماثل لازم وضروری ہے خواہ قرض لینے اور ادائیگی کے وقت کی قوت خرید میں زمین وآسمان کا فرق ہی کیوں نہ ہوجائے، **بلغة السالک** میں ہے: "**أخذ بمثله ولا ينظر للسعر الرافع**" (بلغة المسالک ۲/۲۱۲) قرض کے مثل لیا جائے گا اور بڑھی ہوئی قیمت پر توجہ نہیں دی جائے گی، علامہ نوویؒ لکھتے ہیں:

"**إذا أقرض شيئا له مثل كالحبوب والادهان والدراهم والدنانير وجب على المقترض رد مثلها لأنه أقرب إليه**" (شرح المہذب ۱۲/۲۱۵)۔

(جب قرض مثلی چیز لیا ہو، جیسے دانہ، تیل دراہم ودنانیر تو قرض دار پر اس کے مثل لوٹانا واجب ہے، اس لئے کہ یہی قرض لی گئی اشیاء کے زیادہ قریب ہے)۔

ابن قدامہ نے المغنی میں لکھا ہے:

"**إن المستقرض يرد المال في المثليات سواء رخص سعره أو غلا أو كان بحاله ولو كان ما أقرضه موجودا بعينه فرده من غير عيب يحدث فيه لزم قبوله سواء تغير سعره أو لم يتغير**" (المغنی ۴/۳۶۵)۔

(قرض دار مثلیات میں مثل ہی واپس کرے گا خواہ قیمت کم ہوگئی ہو، بڑھ گئی ہو یا علی حالہ ہو، اگر قرض لی جانے والی چیز بعینہ موجود ہو تو بغیر عیب کے اس کو لوٹا دے تو قرض دہندہ کے لئے اسی سامان کو قبول کرنا لازم ہے خواہ اس کی قیمت میں تبدیلی ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو)۔

یہیں سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ عامۃ الناس کے درمیان ادائیگی کے لئے ایسے معیار مقرر کرنا جن کی بنیاد دقیق فنی اصولوں پر ہو، صحیح نہیں ہے، اور یہ مستقل مفضی الی النزاع ہے، پھر

گھٹتی بڑھتی قیمتوں کی وجہ سے سودخوری کے دروازے کھلنے کا یقین ہے۔ اسی لئے فقہاء نے فلوس کی قدر کی کمی بیشی کا دیون یعنی مؤخر مطالبوں میں اعتبار نہیں کیا ہے۔ ردالمحتار میں ہے:

"وإن استقرض دانق فلوس أو نصف درهم فلوس ثم رخصت أو غلت لم يكن عليه إلا مثل عدد الذى أخذه ...... ولا ينظر إلى غلاء الدراهم ولا إلى رخصها" (رد المحتار ۷/ ۳۹۰)۔

(اگر کسی نے فلوس کا دانق یا نصف درہم فلوس لیا، پھر قیمت گرگئی یا مہنگی ہوگئی تب بھی قرض دار پر اسی عدد کے بقدر واجب ہوگا جتنا اس نے لیا، دراہم کی قیمت کے کم وبیش ہونے کا اعتبار نہیں ہوگا)۔

اب اگر جو روپیہ لیا گیا تھا، وہ بند ہوجائے یعنی حکومت نے اس کی جگہ دوسری کرنسی کو رواج دے دیا، اس صورت میں بھی وہ پرانی کرنسی کی موجودہ قیمت نہیں دے گا، بلکہ قرض خواہ پر اس کا مثل واجب ہوگا، پرانی کرنسی کے مہنگے یا سستے ہونے کا اعتبار اس صورت میں بھی نہیں ہوگا۔

"استقرض من الفلوس الرابحة والعدالى فكسدت فعليه مثلها ولا يغرم قيمتها ...... انه مضمون بمثله فلا عبرة بغلائه ورخصه" (الدرالمختار علی ردالمحتار ۷/ ۳۹۰)۔

حکومت جن کی پالیسیاں کرنسی کی قدر وقیمت پر اثر انداز ہوتی ہیں اور بینک جو تمام مالیاتی نظام کو کنٹرول کرتا ہے وہ بھی کرنسی کی قدر وقیمت کے بڑھنے گھٹنے کا اعتبار نہیں کرتا، اسی وجہ سے جمع شدہ رقم ہی بینک واپس کرتا ہے اور جو زائد رقم دیتا ہے وہ انٹرسٹ یا سود کے نام پر دیتا ہے۔

اس پوری صورت حال کا تجزیہ کرنے کے بعد عام ذہنوں میں ایک اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرض دینے والے کے حق کی رعایت اس میں نہیں کی گئی ہے جو عدل وانصاف کے خلاف ہے، علماء وفقہاء کی عام رائے یہ ہے کہ مثل لوٹانا ہی عدل وانصاف ہے، بصورت دیگر سود اور ربا کا بازار گرم ہوگا اور یہ اسلام کی نظر میں ظلم ہے، اللہ رب العزت نے سودی معاملوں کے ذکر کے بعد فرمایا کہ نہ تم

پرکوئی ظلم کرے اور نہ تم کسی پر ظلم کرو: "لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ"، علامہ سرخسی فرماتے ہیں:

"لأن المقصود هو الجبران وذلک فی المثل أتم لأن فيه مراعاة الجنس والمالية وفی القيمة مراعاة المالية فقط فكان إيجاب المثل أعدل" (المبسوط ۱۱۰/۵)۔

(مقصود نقصان کی تلافی ہے اور وہ مثل کی واپسی میں بدرجہ اتم ہے؛ اس لئے کہ اس صورت میں جنس اور مالیت دونوں کی رعایت ہے؛ جبکہ قیمت دینے میں صرف مالیت کی رعایت ہے، اس لئے مثل کا وجوب زیادہ انصاف کے قریب ہے)۔

۲- مہر کا سونے یا چاندی میں ابتداءً متعین کرنا درست ہے، ادھار فروختگی کے وقت طرفین سونے چاندی میں ثمن طے کرلیں اس میں بھی کوئی قباحت نہیں ہے، کیونکہ یہ دونوں معاملے قرض کے نہیں ہیں گوان پر دیون یعنی متاخر مطالبوں کا اطلاق ہوتا ہے۔ نوٹوں کی شکل میں دئے ہوئے قرض کی مالیت اگر سونے چاندی میں معاملہ کے وقت ہی طے ہو جائے کہ اس روپے کے بدلے میں اس قدر سونا لوں گا، تو یہ بیع سلم میں مبیع کی ادائیگی کو مؤخر کرنے جیسا ہوگا اور بیع سلم کے متعلق فقہاء نے جن شرائط کا ذکر کیا ہے، ان کی پابندی لازم اور ضروری ہوگی، ہذا ما عندی واللہ تعالیٰ اعلم۔

موجودہ کرنسی اور شرعی نقطہ نظر

مولانا محمد جعفر علی رحمانی ☆

دیون کو سونے چاندی کی قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنا:

۱-دیون یعنی مؤخر مطالبوں، مثلاً قرض، مہر، پنشن، ادھار خرید فروخت کی رقم اور وقت پر ادا ہونے والی تنخواہوں کی ادائیگی کو سونے یا چاندی کی قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنا، مستقل باہمی تنازعہ کا موجب ہے، وہ اس طرح کہ دیون کو سونے چاندی کی قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنا دقیق فنی بنیادوں پر قائم ہے، عامۃ الناس کے لئے اس پر عمل ممکن نہیں، نیز ہوسکتا ہے کہ جس دن مستقرض بشکل روپیہ قرض لے، اس روز سونے چاندی کے مارکیٹ بند ہوں، جس کی وجہ سے بوقت وصولی قرض اس کی اصل قیمت معلوم نہ ہوسکے، اور بعد میں جب مقرض ومستقرض ان پر روپیوں کی مالیت کو سونے یا چاندی کی قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ وابستہ کرنا چاہے، تو دونوں میں اختلاف پیدا ہو، کہ جس وقت میں نے روپے آپ کو بطور قرض دیئے، اس وقت سونے یا چاندی کی یہ قیمت تھی، جس کی وجہ سے میں اس قدر سونے یا چاندی کی قیمت کا حق دار ہوں، اور مستقرض سونے یا چاندی کی قیمت اس سے کم بتلائے، جس کی وجہ سے آپس میں تنازعہ کھڑا ہو۔

نیز دیون کو سونے چاندی کی قیمتوں سے وابستہ کرنا باب ربوا کو کھولنے کا ذریعہ ہے، وہ

☆　جامعہ اشاعت العلوم اکل کوا، مہاراشٹر۔

اس طرح کہ مثلاً آج بتاریخ ۸/۱/۱۴۳۱ھ کو زید ''۱۷۲۰۰'' روپے بکر کو ایک سال کی مدت ادائیگی پر بطور قرض دے دے، جس کی مالیت ایک تولہ سونے کے بقدر ہے، اب ممکن ہے کہ جب ایک سال پورا ہو جائے، تو سونے کے دام بڑھ کر ''۲۰۰۰۰'' روپے فی تولہ ہو جائے، اس صورت میں بکر پر ''۱۷۲۰۰'' روپے کی ادائیگی لازم ہونے کے بجائے ''۲۰۰۰۰'' روپے کی ادائیگی لازم ہوگی، یعنی قرض پر حاصل کردہ ''۱۷۲۰۰'' روپے پر ''۲۸۰۰'' زائد دینے ہوں گے، اور یہ سود ہے۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک سال پورا ہونے پر سونے کے دام گھٹ کر ''۱۶۰۰۰'' فی تولہ ہو جائے، اور اس صورت میں بکر پر ''۱۷۲۰۰'' کی ادائیگی لازم ہونے کی بجائے ''۱۶۰۰۰'' کی ادائیگی لازم ہو، یعنی قرض پر حاصل کردہ ''۱۷۲۰۰'' میں ''۱۲۰۰'' کم دینے ہوں گے۔

سونے چاندی کی قیمت میں اس کمی بیشی کے احتمال کی وجہ سے، قرض کی ادائیگی میں روپیوں کی مقدار موہوم ہے، یعنی ہوسکتا ہے کہ جو مقدار قرض میں لی اس سے زیادہ ادا کرنی پڑے، اور یہ بھی امکان ہے کہ جو مقدار قرض میں لے لی اس سے کم دینی پڑے، اور یہ قمار ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ دیون کو سونے چاندی کی قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنا عامۃ الناس کے لیے قابل عمل نہیں ہے، اور یہ ربوا و قمار کے دروازے کو کھولنے کا ذریعہ بن سکتا ہے؛ جب کہ فقہ کا قاعدہ ہے کہ ممنوع کا ذریعہ بھی ممنوع ہوا کرتا ہے۔

۲– اس صورت کا حکم بھی وہی ہے جو پہلی صورت کا ہے، البتہ اگر مہر وغیرہ کا تقرر عین سونا یا چاندی میں کیا جائے، اور ادائیگی کے وقت وہی مقررہ مقدار یا روپیوں کی شکل میں اس کی جو قیمت بھی بنتی ہو، اس کو ادا کیا جائے، تو یہ بلا تأمل جائز و درست ہوگا۔

دلائل:

قرآن کریم: "أحل الله البيع وحرم الربوا" (سورۃ البقرۃ:۲۷۵)۔

صحیح مسلم: عن جابر قال: "لعن رسول الله ﷺ آكل الربا وموكله وكاتبه وشاهديه، وقال: هم سواء" (۲/۲۷، مکتبہ بلال دیوبند)۔

تنویر الابصار مع الدر والرد: الربا شرعاً فضل خال عن عوض بمعيار شرعي مشروط لأحد المتعاقدين في المعاوضة" (تنویر ۷/ ۳۹۸-۴۰۱، دار الکتب العلمیۃ بیروت)۔

تبیین الحقائق والرمز والبحر والنہر: هو فضل مال بلا عوض في معاوضة مال بمال (۴/ ۴۲۶، رمز الحقائق شرح کنز الدقائق ۲/ ۳۲، البحر الرائق ۶/ ۲۰۷، النہر الفائق ۳/ ۴۶۹، کتاب البیوع، باب الربوا)۔

قرآن کریم: "إنما الخمر والميسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشيطن فاجتنبوه لعلكم تفلحون" (سورہ المائدۃ:۹۰)۔

رد المحتار: لأن القمار من القمر الذي يزداد تارة وينقص أخرى، وسمي القمار قماراً لأن كل واحد من المقامرين ممن يجوز أن يذهب ماله إلى صاحبه، ويجوز أن يستفيد مال صاحبه، وهو حرام بالنص (۹/ ۵۷۷، کتاب الحظر والاباحۃ، باب الاستبراء، فصل فی البیع)۔

معجم لغۃ الفقہاء: القمار تعليق الملک على الخطر، والمال من الجانبين (ص:۳۶۹)۔

بدائع الصنائع: الوسيلة إلى الحرام حرام (۶/۲۸۸)۔

شامی: ماكان سبباً لمحظور فهو محظور (۵/ ۲۲۳، مکتبہ نعمانیہ)۔

خلاصہ:

۱- دیون کو سونے چاندی کی قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنا عامۃ الناس کے لیے قابل عمل نہیں ہے، اور ربوا وقمار کے دروازے کو کھولنے کا ذریعہ ہے۔

۲- دوسری صورت کا حکم بھی پہلی صورت ہی کی طرح ہے، البتہ اگر مہر وغیرہ کا تقرر عین سونا یا چاندی میں کیا جائے، اور ادائیگی کے وقت مقررہ مقدار یا روپیوں کی شکل میں اس کی جو قیمت بھی بنتی ہو، اس کو ادا کیا جائے، تو یہ عمل بلا تامل جائز و درست ہوگا۔

کرنسی کی شرعی حیثیت

ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی ☆

احقر کے نزدیک ان کرنسیوں کی وہی حیثیت ہے احادیث کے اعتبار سے جو ثمن خلقی کی ہے۔

حضرت مولانا تقی عثمانی کا ایک تفصیلی مقالہ جس پر حضرت نے اس سلسلہ کی بڑی مفید اور بیش بہا معلومات پیش کی ہیں جس کا ایک اقتباس پیش خدمت ہے: ''اس طرح اب سونا کرنسی کے دائرہ سے بالکل خارج ہو چکا ہے اور اب سونے کا کرنسی سے کوئی تعلق باقی نہیں رہا اور نوٹوں اور زر علامتی (یعنی کم قیمت کے سکوں) نے پوری طرح سونے کی جگہ لے لی ہے، اب نوٹ نہ سونے کی نمائندگی کرتے ہیں نہ چاندی کی؛ بلکہ ایک فرضی قوت خرید کی نمائندگی کرتے ہیں۔ حضرت عثمانی صاحب نے اس مسئلہ پر مسند احمد کے مرتب اور شارح علامہ احمد ساعاتی کی ایک تحریر پیش کی ہے:

''فالذی أراه حقا أو دین الله علیه أن حکم الورق المالی کحکم النقدین وفی الزکاۃ سواء بسواء لأنه یتعامل به کالنقدین تماماً ولأن مالکه یمکنه صرفه وقضاء مصالحه به فی أی وقت شاء فمن ملک النصاب من الورق المالی ومکث عنده حولا کاملا وجبت علیه زکاته'' (فقہی مقالات ۱/ ۲۳)

☆ شیخ الحدیث وپرنسپل جامعہ دار العلوم سئو۔

(میرے نزدیک صحیح بات جس پر میں اللہ تعالی کے حضور جوابدہ ہوں یہ ہے کہ زکاۃ کے وجوب اور اس کی ادائیگی کے مسئلہ میں ان کاغذی نوٹوں کا حکم بھی بعینہ سونے چاندی کے حکم کی طرح ہے، اس لئے کہ لوگوں میں ان نوٹوں کا لین دین بالکل اسی طرح جاری ہے جس طرح سونے چاندی کا لین دین رائج ہے اور ان نوٹوں کے مالک کو اس کا بالکل اختیار رہے کہ وہ جس وقت چاہیں ان کو خرچ کریں اور ان کے ذریعہ اپنی ضروریات پوری کریں؛ لہذا جو شخص نصاب کے بقدر ان نوٹوں کا مالک بن جائے اور اس پر ایک سال گزر جائے تو اس پر زکوۃ واجب ہوجائے گی)۔

حضرت مولانا اختر امام عادل صاحب کا ایک مقالہ اس موضوع پر ہے جس پر موصوف نے کرنسیوں کی تاریخ رقم کرنے کے بعد لکھا ہے: "عملی طور پر شہری کو سونا چاندی کے سکوں کی طرح نوٹ قبول کرنے پر مجبور کردیا گیا اس سے بظاہر معلوم پڑتا ہے کہ نوٹ نے ترقی کرکے مستقل ثمن عرفی کے حکم کی حیثیت حاصل کرلی ہے۔

ڈاکٹر یوسف قرضاوی کرنسی کو مستقل ثمن قرار دینے کی بابت کئی دلائل ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

نوٹوں کا جب آغاز ہوا تو ان کی زکاۃ کے بارے میں اختلاف ضرور پیدا ہوا اور اس قسم کا اختلاف ہر نئی چیز کے بارے میں پیدا ہوتا رہتا ہے لیکن آج صورت حال بالکل بدل گئی ہے، آج ان کاغذی سکوں نے ہر ملک میں ڈھلے ہوئے سکوں کی جگہ لے لی ہے اور سماج کے تمام کام انہیں کے ذریعہ انجام پاتے ہیں مثلاً مہر کی ادائیگی نوٹوں کے ذریعہ ہوتی ہے اور اس پر شرعاً کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا، اشیاء کی قیمت بلانزاع انہیں کے ذریعہ چکائی جاتی ہے، مزدور کو اجرت میں نوٹیں ہی دی جاتی ہیں اور وہ ان کو قبول کرنے سے انکار نہیں کرتا، جو شخص نوٹیں چراتا ہے وہ چوری کی سزا کا بلا اختلاف مستحق قرار پاتا ہے، اسی طرح نوٹوں کا جو شخص ایک خاص مقدار میں مالک ہوتا ہے اسے غنی شمار کیا جاتا ہے، ان حقائق کے پیش نظر نوٹوں کی حیثیت شرعی نقدی کی قرار

پاتی ہے لہذا یہ کس طرح جائز ہوگا کہ ہم فقراء ومساکین ودیگر مستحقین کو اس سے محروم رکھیں (فقہ الزکاۃ از شمس پیرزادہ ۱۹۸)۔

حاصل کلام:

کرنسی "نوٹ کیش" احادیث میں وہی حکم رکھتی ہے جو ثمن خلقی (سونا، چاندی) رکھتا ہے؛ اس لئے اس کے ذریعہ تمامی معاملات درست وصحیح ہوجائیں گے۔ مزکی کی زکوۃ صحیح ہوجائے گی؛ خواہ زکوۃ لینے والے نے اسے اپنے مصروف میں استعمال کیا ہو یا نہ کیا ہو۔

موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت

مولانا ابوسفیان مفتاحی ☆

۱ – الجواب وباللہ التوفیق: کاغذی نوٹوں کی اگر چہ اپنی ذاتی کوئی قیمت نہیں مگر جب ان نوٹوں کو اصل سونے یا چاندی کا متبادل وبدل قرار دے دیا گیا تو یہ نوٹ اپنے مبدل منہ کا حکم فی الجملہ اختیار کرلیں گے اور ان پر وہی احکام جاری ہوں گے، یعنی کسی آدمی کے پاس نہ تو سونے کا نصاب مکمل ہے نہ چاندی کا لیکن دو تولہ سونا ہے اور چالیس تولہ چاندی ہے تو ادائیگی زکوۃ کے لئے دو تولہ سونے کو چاندی کے ساتھ ضم کردیں گے اور ۴۰ تولہ چاندی کو موجودہ کرنسی نوٹ سے تبادلہ کردیں گے، اگر تبادلہ کے بعد چاندی کا نصاب مکمل ہوجاتا ہے تو ادائیگی زکوۃ فرض ہوجاتی ہے تو ظاہر ہے کہ نوٹ وموجودہ کرنسی نے چاندی کا حکم لے لیا اور اسی اعتبار سے زکوۃ کی ادائیگی فرض قرار دی گئی۔

اور یہ کہنا کہ اس کی قوت خرید تیزی سے گرجاتی ہے صحیح نہیں ہے، یہ ایک قسم کا مغالطہ ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ چیزوں کی قیمت بڑھ جانے کی وجہ سے چیزوں کے خریدنے میں گرانی کے اعتبار سے زیادہ نوٹ دینے پڑتے ہیں۔ اور اسی گرانی کے اعتبار سے دیون مؤخر مطالبوں مثلاً قرض مہر، پنشن وغیرہ میں بھی دیون کی مالیت کے اعتبار سے زائد نوٹ دینے پڑیں گے۔ واللہ اعلم، نیز یہ تعبیر کہ نوٹوں کی قیمتیں بڑھتی ہیں، میرے کے خیال میں درست نہیں، بلکہ درحقیقت

☆ جامعہ مفتاح العلوم مئو۔

اشیاء کی قیمتوں میں کمی زیادتی ہوتی ہے؛ اس لئے دیون میں نوٹ لیے یا طے کئے گئے ہیں تو بعینہ وہی نوٹ یا اس کے مثل کی ادائیگی واجب ہوگی۔ قرض میں ایک سو روپے کا نوٹ دے کر اس کے بدلہ میں ۵۰۰ کا نوٹ لینا ناجائز اور سود ہوگا، اس لئے اس فتنہ وفساد کے دور میں پہلے سے اس کی قیمت سونے یا چاندی کے وزن کے ساتھ متعین کر دینا ضروری ہے۔ ادائیگی کے وقت خواہ سونا یا چاندی دے دی جائے خواہ اس کے مساوی و برابر نوٹ دے دیے جائیں یہ صورت بلاشبہ جائز و درست ہے۔

قرض، مہر، پنشن وغیرہ ادھار معاملات میں سونا چاندی ہی معیار ہیں؛ اس لئے کہ معیار صرف وہی چیز بن سکتی ہے جو تغیر وتبدل سے پاک ہو۔ دوسرے تمام سامان چند دنوں کے بعد تغیر وتبدل کا شکار ہونے لگتے ہیں، اس کے برخلاف سونا چاندی عام طور پر تغیر وتبدل سے پاک رہتے ہیں، اسی بنا پر سونا اور چاندی کو نقد وثمن قرار دیا گیا ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اگر کوئی دوسری چیز بطور سکہ کے لوگوں میں رائج ہو جائے اور وہ بھی اس طرح ذریعہ تبادلہ قرار دیا جائے جس طرح کہ سونا چاندی تو نقد کا اطلاق اس پر درست ہوگا یا نہیں؟

ضابطہ کی بات تو یہی ہے کہ اس وقت اس پر بھی نقد وثمن کا اطلاق درست ہے، البتہ یہ فرق ضرور ہے کہ سونا چاندی ثمن خلقی ہیں، اور نوٹ ثمن عرفی، چنانچہ مالکیہ کا مشہور مذہب اور حنفیہ کا مسلک یہی ہے۔

امام مالکؒ نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ اگر چمڑا کو بھی اس حیثیت سے رواج مل جائے تو وہ ثمن ہو جائے گا؛ چنانچہ المدونۃ الکبری (۱۰۴/۷) میں ہے: "ولو أن الناس أجازوا بينهم الجلود حتى يكون لها سكة وعين لكرهتها أن تباع بالذهب والورق فنظرة" یعنی اگر لوگوں کے درمیان چمڑے کے ذریعہ خرید فروخت اس قدر رواج پا جائے کہ وہ

چمڑا ثمن اور سکہ کی حیثیت اختیار کر جائے تو اس صورت میں میرے نزدیک سونے چاندی کے ذریعہ اس چمڑے کو ادھار فروخت کرنا جائز نہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ دیون یعنی مؤخر مطالبوں مثلاً قرض، مہر، پنشن وغیرہ ادا کرنے کے وقت پر جو کرنسی و نوٹ کی حیثیت ہوگی اسی سے ادا ہوگی، اور باب ربوا کا کھلنا ایک قسم کا مغالطہ ہے، واللہ اعلم۔

۲- الجواب وباللہ التوفیق: نوٹوں کی شکل میں قرض دیتے وقت یا مہر مقرر کرنے کے وقت یا ادھار بیچنے کے وقت طرفین واجب الاداء نوٹ کی مالیت سونے یا چاندی میں طے کرلیں تاکہ ادا کرنے کے وقت اسی قدر سونے یا چاندی کی قیمت کے برابر نوٹوں کی ادائیگی عمل میں آئے، یہ صورت شرعاً جائز و درست ہے، واللہ اعلم۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ نوٹوں کی شکل میں قرض وغیرہ دیتے وقت طرفین واجب الاداء نوٹ کی مالیت سونے یا چاندی میں طے کرلیں تاکہ ادا کرنے کے وقت اسی قدر سونے یا چاندی کی قیمت کے برابر نوٹ دے دیئے جائیں، یہ صورت شرعاً جائز ہے، واللہ اعلم۔

موجودہ کرنسی کا مسئلہ

مولانا اشتیاق احمد الاعظمی ☆

۱-دیون یعنی موٴخر مطالبوں کی ادائیگی کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنا کیسا ہے؟

جواب: اصل سوال کے جواب سے پہلے افراط زر اور تفریط زر کی وضاحت ہونی ضروری ہے۔

افراط زر اور تفریط زر کی وضاحت:

آجکل کی معاشی اصطلاح میں ''افراط زر'' کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بازار میں اور لوگوں کے پاس رقم زیادہ آگئی، لیکن اور خدمات اتنی ہی ہیں جتنی پہلے تھیں، ان کی رسد میں اضافہ نہیں ہوا ہے، لہذا دوکاندار جب دیکھتا ہے کہ لوگوں کے پاس رقم زیادہ آگئی ہے اور اشیاء کی طلب میں اضافہ ہوگیا ہے، لیکن رسد میں اضافہ نہیں ہوا ہے، تو وہ اشیاء کی قیمت میں اضافہ کردیتا ہے، جس سے روپیہ کی قوت خرید میں کمی آجاتی ہے اور مہنگائی بڑھ جاتی ہے، اسی کو **افراط زر** کہتے ہیں (تقریر ترمذی از مولانا محمد تقی عثمانی ۱/۵۰-۵۱)۔

اور تفریط زر کا مطلب یہ ہے کہ کسی ملک میں جاری شدہ کرنسی، اشیاء اور خدمات کے مقابلہ میں کم ہوجائے، جس کے نتیجہ میں اشیاء اور خدمات کی قیمت کم ہوکر ارزانی پیدا ہوجائے،

☆ استاذ حدیث وفقہ دار العلوم مئو۔

اس لئے کہ جب اشیاء طلب سے زیادہ ہوجاتی ہیں تو بھاؤ گر جاتا ہے اور قیمت کم ہوجاتی ہے (کرنسی کی قوت خرید از مولانا تقی عثمانی/ ۵۰)۔

یہ معلوم ہو چکا کہ افراط زر کے وقت روپیہ کی قوت خرید میں کمی آجاتی ہے تو سوال یہ ہے کہ مؤخر مطالبوں میں افراط زر کی صورت میں عدد کا اعتبار کرتے ہوئے اتنا ہی روپیہ ادا کرنے سے حقدار کا حق ساقط ہوگا، جتنا وجوب کے وقت تھا یا روپیہ کی قوت خرید کم ہوجانے سے عددی مقدار روپیہ کی بڑھا کر اس کی تلافی کرنا ہوگا۔ چونکہ یہ بات واضح ہے کہ کاغذی نوٹوں کی اپنی ذاتی کوئی قیمت نہیں ہوا کرتی، بلکہ ان کی قیمت، اشیاء کے اعتبار سے متعین ہوا کرتی ہے، اس لئے بعض معاشیین بڑے زور شور سے تجویز پیش کرتے ہیں کہ کرنسی اور نوٹ کی قیمت متعین کرنے کے لئے، قیمتوں کے اشاریہ کو معیار بنایا جائے، اور تمام حقوق کی ادائیگی میں قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ کرنسی کی قیمت کے تعلق کو بنیاد قرار دیا جائے اور مالی سال کے شروع میں ان اشیاء کی جو قیمت رائج ہو وہ درج کی جائے اور پھر سال کے اخیر میں جو قیمت رائج ہو، اور دونوں قیمتوں اور نرخوں کے درمیان جو فرق ہو، اس کا تناسب نکالا جائے اور اسی تناسب سے نوٹوں کی قیمت میں تغیر مانا جائے۔

قیمتوں کے اشاریہ سے دیون (مؤخر مطالبوں) کو منسلک کرنے کا منشا یہ ہوا کرتا ہے کہ مدیون، دائن کو صرف اصلی دین کے برابر روپیہ واپس نہ کرے بلکہ قیمتوں کے اشاریہ میں، اشیاء کی قیمتوں میں جس نسبت سے زیادتی ہوئی ہے، اسی نسبت سے دین کی رقم میں اضافہ کر کے واپس کرے۔ بعض معاشیین اس کے جواز کے لئے یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ یہ زیادتی جو مدیون، دائن کو واپس کررہا ہے، یہ حقیقی زیادتی نہیں، بلکہ اسی مالیت کو واپس کررہا ہے، جو مدیون نے بطور دین کے دائن سے لی تھی۔

لیکن ان حضرات کی یہ دلیل شرعی اصول سے متصادم ہے، کیونکہ شریعت کا یہ اصول

ہے: الدیون تقضیٰ بأمثالها (دیون کی ادائیگی انہی کے مثل سے ہوگی) اس سے یہ ثابت ہوا کہ شریعت نے مماثلت فی تضاء الدیون کو ضروری قرار دیا ہے اور شریعت کے تمام مسائل میں مماثلت سے مراد، مماثلت فی المقدار (ناپ، تول اور عدد) ہوا کرتی ہے نہ کہ مماثلت فی القیمۃ (تقریر ترمذی از مولانا محمد تقی عثمانی ۱/۱۵۴)۔

اس امر کی دلیل کہ شرعی مسائل میں مماثلت سے مراد، مماثلت فی المقدار (ناپ، تول اور عدد) ہوا کرتی ہے، نہ کہ مماثلت فی القیمۃ۔ جیسا کہ اس وہ حدیث میں ہے جو بخاری و مسلم میں بروایت حضرت ابوسعید خدریؓ مذکور ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے عہد مبارک میں ہمارے پاس ہر قسم کی کھجوریں آیا کرتی تھیں، دو صاع گھٹیا کھجور کو ہم ایک صاع عمدہ کھجور کے بدلہ بیچا کرتے تھے، ہمارے اس عمل کی خبر حضور ﷺ کو ہوئی تو آپ نے فرمایا: دو صاع کھجور کو ایک صاع کے بدلہ نہ بیچو، حالانکہ حضور ﷺ کو یہ بات معلوم تھی کہ دو صاع کے بدلہ میں ایک صاع جو کھجور بیچی جاتی تھی، وہ زیادہ قیمتی ہوتی تھی، لیکن اس کے باوجود حضور اکرم ﷺ نے اس کی اجازت نہیں دی؛ بلکہ مقدار یعنی وزن میں یہاں برابری کا حکم دیا اور قیمت کے فرق کا کوئی اعتبار نہیں فرمایا۔ اس روایت سے یہ بات ثابت ہوئی کہ مماثلت سے مراد مماثلت فی المقدار ہے، نہ کہ مماثلت فی القیمۃ۔

چونکہ قیمتوں کا اشاریہ اپنے تمام مراحل میں اندازہ اور تخمین پر مبنی ہے، اس کے حساب میں خواہ کتنی احتیاط برتی جائے، پھر بھی اس کے نتیجہ کو زیادہ سے زیادہ تقریبی کہہ سکتے ہیں نہ کہ یقینی اور واقعی۔ جبکہ احادیث کی روشنی میں یہ امر واضح ہے کہ دیون کی واپسی میں اٹکل اور اندازہ کی شرط لگانا جائز نہیں، لہذا قرضوں کی ادائیگی کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنا کسی بھی حال میں جائز نہیں۔ مولانا تقی عثمانی مدظلہ بحوالہ حورم اور ایچ لیوی تحریر فرماتے ہیں: "قیمتوں کے اشاریہ کو تمام مالی معاملات میں پورے طور پر کام میں لانا ایک ایسا فعل ہے، جس کا حصول عملاً ناممکن ہے"۔

۲- واجب الادا قرضوں کی مالیت کو سونے چاندی کی قیمت کے مساوی نوٹوں کے ذریعہ ادا کرنا:

جواب: پچھلے سوال کے جواب میں یہ بات آچکی ہے: "**الدیون تقضیٰ بأمثالها**" (دیون کی ادائیگی انہی کے مثل سے ہوگی)، شریعت اسلامیہ نے مماثلت فی قضاء الدین کو ضروری قرار دیا ہے اور شریعت کے تمام مسائل میں مماثلت سے مراد، مماثلت فی المقدار ہوا کرتی ہے، نہ کہ مماثلت فی القیمۃ۔ تو اب اگر قرض، نوٹ کی شکل میں دیا گیا ہے تو اس کی واپسی، اسی مقدار میں نوٹ ہی کی شکل میں ہوگی، خواہ واپسی کے وقت، نوٹ کی قوت خرید میں کمی واقع ہو چکی ہو، طرفین سے نوٹ کی مالیت، سونے یا چاندی میں طے کرنے سے اور واپسی کے وقت اسی قدر سونے یا چاندی کی قیمت کے مساوی نوٹوں کی ادائیگی کو واجب کرنا نا جائز ہوگا۔

مولانا تقی عثمانی مدظلہ نے اس موقعہ پر ایک بڑی عمدہ بات تحریر فرمائی ہے جو یہاں قابل ذکر ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں: "جب کوئی شخص دوسرے کو قرض دینا چاہتا ہے تو اس کو پہلے یہ فیصلہ کرنا چاہئے کہ اس قرض کے ذریعہ اس کی امداد کرنا چاہتا ہے یا اس کے منافع میں حصہ دار بننا چاہتا ہے؟ اگر وہ منافع میں حصہ دار بننا چاہتا ہے تو پھر اس کے ساتھ نقصان میں بھی حصہ دار بنے اور وہ اس طرح کہ اس کے ساتھ شرکت یا مضاربت کا معاملہ کرے، اور اگر صرف امداد کرنا چاہتا ہے تو پھر یہ سوچ لے کہ قرض دینا ایسا ہے جیسے کوئی شخص اپنے پیسے اٹھا کر صندوق یا الماری میں تالہ لگا کر رکھدے اور پھر اس الماری یا صندوق میں رکھے ہوئے پیسوں پر پانچ سال گذر جائیں تو اس دوران ان پیسوں کی قیمت کم ہو جائے گی، جس کی وجہ سے پیسے رکھنے والے کا نقصان ہو جائے گا تو اس نقصان کی تلافی کون کرے گی؟ ظاہر ہے کوئی نہیں کرے گا۔ اسی طرح آپ نے کسی کو قرض دیا تو وہ ایسا ہی ہے جیسے آپ نے صندوق یا الماری میں پیسے اٹھا کر رکھ دیئے، اس لئے یہ بات درست نہیں کہ دیون کی ادائیگی میں "قوت خرید" کا اعتبار کیا جائے" (تقریر ترمذی ۱/ ۱۵۳)۔

موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت اوراس پر قیمتوں کے اشاریہ کا اثر

مولانا امداداللہ قاسمی منوی ☆

جہاں تک کرنسی نوٹ کی شرعی حیثیت کا سوال ہے تو یہ بات اکیڈمی کے دوسری ہی سمینار میں طے ہوچکی ہے اورموجودہ جہاں دیدہ عالم مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ نے اپنی کتاب ''اسلام اورجدید معیشت وتجارت'' میں اسی کو صحیح قراردیا ہے کہ کرنسی نوٹ سند وحوالہ نہیں، بلکہ خود مال اورثمن ہے، البتہ سونے اور چاندی کی طرح ثمن حقیقی نہیں بلکہ ثمن عرفی اورزر اصطلاحی وقانونی کی حیثیت رکھتا ہے، اور یہ بھی مسلم ہے کہ کاغذی نوٹ کی اپنی حقیقی قدر کچھ نہیں ہوتی، نوٹ کی قدر کا تعین اشیاء وخدمات کی قیمتوں سے ہوتا ہے، اشیاء وخدمات کی قیمتیں بڑھ جائیں تو نوٹ کی قیمت کم ہوجاتی ہے اور گھٹنے کی صورت میں نوٹ کی قیمت بڑھ جاتی ہے، اسی کو افراط زر اورتفریط زر سے تعبیر کیا جاتا ہے، افراط زر کی صورت میں جب نوٹ کی قوت خرید کم ہوجاتی ہے تو اس وقت کیا شرعاً یہ صحیح ہوگا کہ مؤخر مطالبوں کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کردیا جائے، تاکہ صاحب حق کے ساتھ ظلم اورناانصافی نہ ہو؟ اس سوال کے جواب سے پہلے چند باتیں ملحوظ خاطر رکھنی چاہئیں:

۱- اشیاء کی قیمتوں کو دیکھ کر قدر زر اورافراط زر یا تفریط زر کی پیمائش کے لئے ماہرین کے یہاں ایک حسابی نظام ہے، جسے عربی میں ''قائمۃ الأسعار'' اوراردو میں ''قیمتوں کا اشاریہ'' کہتے ہیں، یہ نظام محض ایک تخمینی چیز ہے، قطعی نہیں، اس لیے کہ اس میں کون سی اشیاء لینی ہیں اس

☆ معین المدرسین، دارالعلوم دیوبند۔

کا انتخاب تخمینی ہے، پھر ہر شئے کو جو وزن دیا جاتا ہے وہ بھی تخمینی، ہر شے کی جو قیمت رکھی جاتی ہے وہ بھی تخمینی ہے، غرض یہ نظام ازسرتابن تخمینات اور اندازہ پر مبنی ہے، اور اس قسم کا نظام یقیناً باہمی نزاع کا باعث ہوتا ہے۔

۲- اموال ربویہ میں حقیقی مماثلت ضروری ہے، اسی لئے شریعت نے ان اموال میں مجازفتہ یعنی اٹکل واندازہ سے فروختگی کو ناجائز قرار دیا ہے، اور ادائیگی کو قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ وابستہ کرنے میں مجازفتہ لازم آتا ہے، اس لئے کہ ابھی یہ بات گزری ہے کہ قیمتوں کا اشاریہ محض تخمینی ہوتا ہے۔

۳- قرض کی ادائیگی میں شرعاً مقدار میں مثلیت کا اعتبار ہے، قیمت میں مثلیت کا نہیں، مثلاً کسی نے گیہوں قرض لیا تو واپسی میں گیہوں کی اتنی ہی مقدار لوٹائے گا، اگرچہ اب قیمت تبدیل ہوچکی ہو۔

۴- حضرت ابن عمرؓ کی حدیث میں جو ابوداؤد (۳۳۵۴)، ترمذی (۱۲۴۴)، نسائی (۴۵۹۶) اور ابن ماجہ (۲۲۶۴) میں موجود ہے، مذکور ہے کہ ابن عمرؓ نقیع میں اونٹ بیچا کرتے تھے، کبھی ایسا ہوتا کہ معاملہ دراہم پر ہوتا اور ادائیگی دینار سے ہوتی اور کبھی اس کے برعکس ہوتا، جب انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے اس بابت دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: "لا بأس أن تأخذ بسعر یومھا" یعنی آپ ﷺ نے اس شرط کے ساتھ اجازت دی کہ ادائیگی کے دن کی قیمت کے مطابق ہو، یعنی اگر بیع دراہم پر ہوئی تھی اور ادائیگی دنانیر میں ہورہی ہے، تو ادا کے دن اتنے درہموں کے جتنے دینار بنیں گے وہی دینے ہوں گے، کیوں کہ ذمہ میں تو اسی چیز کی مقدار واجب ہوئی تھی جس پر بیع ہوئی تھی، یعنی دراہم پر، البتہ ادائیگی کے وقت اس دن کی قیمت کے لحاظ سے واجب شدہ تبادلہ دوسرے ثمن مثلاً دینار سے ہوسکتا ہے، اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ دیون میں جو چیز واجب ہوتی ہے وہ دیون کی مقدار ہے نہ کہ حقیقی قیمت، اگر قیمت واجب

ہوتی تو وجوب کے دن کی قیمت کے لحاظ سے تبادلہ ہوتا، نہ کہ ادائیگی کے دن کے اعتبار سے۔

ان امور پر نظر کرنے سے یہ بات واضح طور سے سامنے آتی ہے کہ دیون یعنی مؤخر مطالبوں کو اشیاء کی قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنا شرعاً صحیح نہیں ہے، ایسا کرنا عاقدین کے مابین نزاع کا باعث اور رباب ربا واکرنے کا محرک ہوگا، کیوں کہ یہ اشاریہ تخمینات سے عبارت ہے۔

یہیں سے یہ اشکال بھی ختم ہوجاتا ہے کہ مؤخر مطالبات مثلاً قرض میں نوٹ کی قیمت کم ہوجانے سے صاحب حق کو دی ہوئی مقدار ہی لوٹانے میں اس کے ساتھ ناانصافی اور ظلم ہے، کیوں کہ یہ بات گزر چکی ہے کہ دیون میں مقدار واجب ہوتی ہے نہ کہ قیمت، مقدار میں مماثلت کا اعتبار ہے نہ کہ حقیقی قیمت میں، نیز روپے کی قدر کم ہونے میں مستقرض کے کسی فعل کا دخل نہیں ہے، لہذا وہ ذمہ دار بھی نہ ہوگا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے قرض دینے والا اگر اپنے ہی پاس وہ روپے رکھتا تو قیمت میں کمی کے وقت کوئی ذمہ دار نہ ہوتا۔

البتہ اگر کہیں کی کرنسی کی قیمت اس حد تک گر جائے کہ کساد میں داخل ہوجائے یا خود حکومت اپنی کرنسی کی قیمت گھٹادے تو اس کا حکم مختلف ہوسکتا ہے۔

دوسرا مسئلہ:

اگر نوٹوں کی شکل میں قرض دیتے وقت یا مہر کے تقرر کے وقت یا ادھار فروختگی کے وقت طرفین واجب الاداء نوٹوں کی مالیت سونے یا چاندی میں طے کرلیں، اور یہ واضح کردیں کہ معاملہ درحقیقت اتنے نوٹوں پر نہیں بلکہ اتنی مقدار میں سونے یا چاندی پر ہوا ہے، پھر ادائیگی کے وقت بجائے سونے یا چاندی لینے کے ان کا تبادلہ دوسرے ثمن یعنی نوٹوں سے کرلیں تو ایسا کرنا جائز ہوگا، جیسا کہ حدیث ابن عمرؓ میں ابھی گزرا ہے، نیز نوٹ فلوس کے حکم میں ہیں، لہذا ان کے ذریعہ سونے یا چاندی کا تبادلہ ادائیگی کے دن کی قیمت کے اعتبار سے درست ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

موجودہ کرنسی سے متعلق سوالات کے جوابات

مفتی محفوظ الرحمٰن مفتاحی ☆

موجودہ کرنسی اپنے وجود کے ابتدائی دور میں وثیقۂ ثمن اور سند کے درجہ میں تھا؛ اس لئے اس کے احکامات وثیقہ اور سند کے لحاظ سے تھے مثلاً زکوۃ کی ادائیگی میں نوٹ دینے سے زکوۃ ادا نہیں ہوتی یا قرض نوٹوں سے لیتے وقت اس کی مالیت کا اندازہ سونا چاندی سے طے کیا جاتا کہ قرض ادا کرتے وقت نوٹ اتنے ادا کئے جائیں جتنے متعینہ چاندی یا سونے میں ملیں۔ اسی طرح دوسرے مسائل رہے۔

مگر اب نوٹوں کا چلن اور لین دین عام ہوگیا۔ ثمن حقیقی کے سکے درہم ودینار بالکل ختم ہوگئے ہیں جس کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ نوٹوں کو ثمن حقیقی کی حیثیت حاصل ہے، اور اگر ثمن حقیقی کی حیثیت نہ مانی جائے تو بہت سی مشکلات درپیش ہوں گی اس لئے فقہاء کرام نے اب ثمن حقیقی مان کر فتوے دیے ہیں۔

چنانچہ حضرت مولانا عبدالحئیؒ صاحبؒ نوٹ پر بحث کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ نوٹ ہر چند خلقتاً ثمن نہیں مگر عرفاً حکم ثمن میں ہے بلکہ عین ثمن سمجھا جاتا ہے اس وجہ سے کہ اگر نوٹ سو روپیہ کا کوئی ہلاک کردے تو اصل مالک سو روپے کا تاوان لیتا ہے اور سو روپیہ کا نوٹ جب بیچا جاتا ہے تو مقصود اس سے قیمت ملنا اس کاغذ کا نہیں ہوتا؛ کیوں کہ یہ ظاہر ہے کہ وہ کاغذ

☆ دارالافتاء جامعہ مفتاح العلوم مئو۔

دو پیسہ کا بھی نہیں ہے، بلکہ مقصود سو روپیہ کا بیچنا اور اس کی قیمت لینا ہوتا ہے، اور نوٹ سو روپیہ کا اگر کوئی قرض لے تو بوقت ادا خواہ نوٹ سو روپیہ کا دیوے یا سو روپے دیوے دونوں امر مساوی سمجھے جاتے ہیں اور دائن کو کسی کے لینے میں مدیون سے عذر نہیں ہوتا حالاں کہ اگر مدیون غیر جنس بوقت ادا دیوے تو دائن نہیں لیتا بخلاف پیسوں کے کہ وہ بھی اگر چہ عرفاً ثمن ہے مگر یہ کیفیت ان کی نہیں ہے، اگر ایک روپیہ کے عوض میں کوئی چیز خرید لے یا ایک روپیہ کسی سے قرض لے اور بوقت ادا پیسے یا ایک روپیہ دے دے تو دائن اور فروخت کنندہ کو اختیار رہتا ہے کہ وہ لے یا نہ لے اور حاکم کی طرف سے اس پر جبر نہیں ہوسکتا کہ خواہ مخواہ وہ پیسے لے لے، پس پیسہ اگر چہ عرفاً ثمن ہے مگر عین ثمن خلقی نہیں سمجھے گئے ہیں بخلاف نوٹ کے کہ یہ عین ثمن خلقی ہے گو عینیت خلقیہ نہیں بلکہ عینیت عرفیہ ہو، پس تفاضل بیع فلوس میں جائز ہونے سے یہ نہیں لازم آتا ہے کہ نوٹ میں بھی جائز ہو جائے؛ کیوں کہ پیسہ غیر جنس ثمن ہے حقیقتاً بھی اور عرفاً بھی، گو بوجہ اصطلاح اور عرف کے اس میں ثمنیت آگئی ہو، پس ہر گاہ نوٹ عرفاً جمیع احکام میں عین ثمن خلقی سمجھا گیا، باب تفاضل میں اسی بنا پر حکم لگادیا جائے گا اور تفاضل اس میں حرام ہوگا۔

مولانا نے ان سطروں میں واضح فرمادیا کہ نوٹ اپنی اصلیت کے اعتبار سے اگر چہ ثمن نہیں مگر عرف اور اصطلاح میں ثمن ہی جیسا معاملہ اس کے ساتھ ہو رہا ہے۔

دوسرے فقہاء وعلماء نے بھی اسی کو تسلیم کیا ہے۔ اس لئے:

سوال (۱) کے جواب میں یہ ہے کہ مؤخر مطالبوں کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ نہیں کیا جائے گا، جتنے نوٹ مقرر رہوں گے اتنا ہی نوٹ ادا کیا جائے گا۔

اور سوال (۲) کے جواب میں یہ ہوگا کہ قرض دیتے وقت یا مہر مقرر کرتے وقت نوٹ کی مالیت سونا یا چاندی میں طے کرنے کی ضرورت نہیں، جتنا نوٹ قرض میں لیا یا مہر میں مقرر کیا اتنا ہی نوٹ ادا کرنا ہوگا۔

موجودہ کرنسی اور اس کی شرعی حیثیت

مولانا سلطان احمد اصلاحی ☆

اس سوال نامہ کے تحت دو استفسارات ہیں ان کے جوابات بہ ترتیب حسب ذیل ہیں:

۱- یہ صحیح ہے کہ کرنسی نوٹوں کے سلسلہ میں افراط زر (inflation) ایک مسئلہ ہے۔ ہندوستان کی حد تک ہم کو اس کا براہ راست تجربہ ہوتا ہے۔ اشیاء صرف کی قیمتوں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور اس کی وجہ سے روپے کی حقیقی قیمت گھٹتی رہتی ہے، کھانے پینے کی چیزوں سے لے کر، کپڑا، فرنیچر، برتنے کے دوسرے سامان، زمین، فلیٹ اور دوکان پر ہر چیز کا دام وقت گزرنے کے ساتھ بڑھتا رہتا ہے اور اس کے مقابلے میں روپے کا وزن گھٹتا رہتا ہے۔ آج جو سامان خرید لیا گیا وہ سال بھر بعد خریدا جائے گا تو یقیناً اس کی اس سے زیادہ قیمت دینی پڑے گی۔ اس کے لحاظ سے افراط زر ہماری معاشی زندگی کی ایک حقیقت ہے۔ اس مسئلہ سے عہدہ برآ ہونے کا اصل طریقہ مسلمان معاشرے میں ''عدل'' کی جگہ ''احسان'' پر عمل ہے۔ معلوم ہے کہ اسلام میں ایک چیز عدل ہے، دوسرا احسان ہے۔ عدل یہ ہے کہ میں ۱۰۰ روپے کے بدلے ۱۰۰ روپے لوٹاؤں اور احسان یہ ہے کہ میں اس میں اپنی مرضی سے ۱۰۰ روپے کا اضافہ کردوں۔ یہ جائز ہی نہیں مستحسن ہے۔ اور آخری نبی علیہ السلام کی مثالی زندگی اس کے نمونوں سے بھری پڑی ہے، اس کا تفصیلی مطالعہ ہونا چاہئے اور حضرات علماء کرام کے ذریعہ مسلمان

☆ ادارہ علم وادب، دودھ پور روڈ، علی گڑھ۔

معاشرے میں اس کی مناسب تفہیم ہونی چاہئے۔قرض تو ایک طرح کا احسان ہے، اور اسے ہر حال میں واپس لینا ہی ضروری نہیں ہے؛ بلکہ اس کے معاف کرنے کی بڑی فضیلت ہے۔اسی طرح صرف مہر کی بڑھی رقم سے عورت کی زندگی پار نہیں لگ جاتی۔پینشن، ادھار خریداری اور وقت پر ادا نہ ہونے والی تنخواہوں وغیرہ کو بھی اس کے ساتھ اسی طرح شامل کیا جا سکتا ہے۔ان تمام طرح کی صورتوں میں متعلق فرد/ افراد کو افراط زر کے نتیجے میں پیدا ہونے والے نقصان سے بچانے کا بہتر طریقہ ہے کہ شوہر، امپلائر اور خریدار، جیسا کہ گزرا، عدل کے بجائے (احسان) کا طریقہ اپنائے اور دوسرے فریق کو نقصان سے بچاتے ہوئے ادائیگی میں اس کے ساتھ فراخ دلی کا مظاہرہ کرے۔جس کے نظائر سے ہمارے صدر اول کی روشن تاریخ بھری ہوئی ہے۔اس کے بجائے اس کو کسی لگے بندھے اشارئے سے جوڑنا مفضی الی النزاع، جھگڑے کا سبب ہوگا، جس کی فقہ میں ممانعت ہے، اور جو اس کے اندر کسی معاملے کی حرمت کی ایک مستقل اساس ہے۔

۲- دوسری صورت میں بھی جب کہ پہلی ادائیگی نوٹ کی صورت میں ہو تو دوسری ادائیگی بھی نوٹ ہی میں ہو اور افراط زر کی امکانی نقصان کی تلافی باہمی صوابدید سے اوپر کے ''احسان'' کے اصول سے کی جائے۔جب پہلا معاملہ نوٹ کے ذریعہ ہو تو دوسرا معاملہ بھی نوٹ کے ذریعہ ہی ہونا چاہئے۔افراط زر کے فرق کو سونے چاندی سے نہ جوڑا جائے۔ لیکن اگر فریقین افراط زر کے نقصان سے بچنے کے لئے کرنسی نوٹ سے بچنے کے لئے مصر ہوں تو انہیں پہلا معاملہ بھی نوٹ یعنی کرنسی کے بجائے سونے چاندی کی صورت میں کرنا چاہئے۔چاندی کے ڈلے اور سونے کے بسکٹ سے معاملہ کیا جائے اور ان کی کوالٹی کا اندراج معاملہ کے وقت تحریری طور پر کرلیا جائے، بعد میں واپسی کے وقت برابر برابر سونے اور چاندی کی واپسی ہو جائے۔اس کے بجائے معاملہ کی پہلی صورت شق اول کی طرح ''مفضی

الی النزاع" جھگڑے کا باعث ہوگی۔جس سے بچا جانا ضروری ہے۔ اور جیسا کہ گزرا کسی معاملے کے ناجائز اور ممنوع ہونے کی یہ مستقل اساس ہے۔ ھذا ما عندی واللہ أعلم وعلمہ أتم وأحکم۔

مسائل کرنسی

مولانا محمد عثمان بستوی ☆

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم، اما بعد۔

مؤخر مطالبوں کی اقسام:

مؤخر مطالبوں کو اشاریہ سے متعلق کرنے کی دو صورتیں ہیں:

۱- ثمن، اجرت، مہر کہ جو رقم عاقدین کے درمیان طے کی جائے درحقیقت اس کو عوض نہ بنایا جائے بلکہ عوض اس کی مقدار کی مالیت کو بنایا جائے جو اشاریہ سے حاصل ہو۔

حکم: اشاریہ سے ثمن، اجرت، مہر وغیرہ طے کرنے میں جہالت ہے، لیکن یہ ایسی جہالت ہے جس کا اشاریہ کے اصول وضوابط سے دور کرنا عاقدین کے اختیار میں ہے، اور ہر ایسی جہالت جس کا دور کرنا عاقدین کے اختیار میں ہو راجح ومفتی بہ قول کے مطابق مفسد نہیں، لہذا اگر عاقدین اشاریہ کے اصول وضوابط سے واقف ہوں تو ان کے لئے" اشاریہ سے مہر، ثمن، اجرت وغیرہ متعین کرنا جائز ہے، اگر عاقدین اس کے اصول وضوابط سے واقف نہ ہوں تو ان کے لئے اشاریہ سے قیمت متعین کرنا جائز نہیں ہے (دیکھئے: شامی ۷/ ۴۳)۔

علامہ کشمیری فرماتے ہیں:

☆ ریاض العلوم گورینی، جونپور۔

"والذی أراه أن النهی عند کونه مفضیا إلی النزاع وکل أمر یکون النهی عنه بذلک لا یشدد فیه الشارع بنفسه بل ربما یغمض عنه أیضا فلا ینبغی التشدد فیه" (فیض الباری ۳؍۲۷۲)۔

یعنی جس میں ممانعت کی وجہ نزاع ہو اس میں شارع کی جانب سے اصل میں سختی نہیں ہوتی ہے بلکہ اس میں بعض اوقات اغماض سے کام لیا جاتا ہے لہٰذا اس میں سختی وتشدد مناسب نہیں۔

۲- دوسری صورت یہ ہے کہ عاقدین ثمن، اجرت، مہر وغیرہ اپنی صوابدید کے مطابق متعین کرلیں، ان کی تعیین کے بعد ان کو مؤخر اس شرط کے ساتھ کردیا جائے کہ ادائیگی کے وقت اگر قیمتوں میں اضافہ ہوا، تو قیمتوں کے اشاریہ میں جس تناسب سے اضافہ ہوگا اسی تناسب سے ان متعینہ مقداروں میں بھی اضافہ کرنا پڑے گا۔

حکم: مذکورہ بالا صورت میں دو جہت پائی جاتی ہے:

۱- اس کو اثمان خلقیہ (سونا چاندی) سے مشابہت کی۔

۲- فلوس اور اشیاء مثلیہ سے مشابہت کی۔

۱- پہلی جہت (اثمان خلقیہ سے مشابہت) کا تقاضہ یہ ہے کہ یہ شکل جائز نہ ہو؛ کیوں کہ دیون (مؤخر مطالبے) کا حکم یہ ہے کہ جب وہ سونا چاندی کی قبیل سے ہوں، اور ان کی قیمتوں میں چاہے جتنا اضافہ ہوجائے، تو جتنا ذمہ میں باقی ہے اتنا ہی ادا کیا جائے، اضافہ کی شرط کے ساتھ لین دین ربوا (سود) میں داخل ہونے کی وجہ سے جائز نہیں (دیکھئے: الفقہ الحنفی فی ثوبہ الجدید ۳؍۲۷)۔

۲- دوسری جہت (فلوس اور اشیاء مثلیہ میں مشابہت) کا تقاضہ یہ ہے کہ دوسری شکل جائز ہو، کیوں کہ جب فلوس کی قیمت یا قرض میں دی ہوئی چیز کی قیمت میں تفاوت فاحش (جو

قیمت لگانے والوں کے اندازے میں نہ آئے) حد تک اضافہ یا کمی ہو جائے تو حضرت امام ابو یوسفؒ کے قول کے مطابق (جو راجح اور مفتی بہ بھی ہے) مقروض کے ذمہ قرض کے دن کی قیمت ادا کرنا واجب ہے (دیکھئے الفقہ الحنفی فی ثوبہ الجدید ۴/ ۲۳۷)۔

"لو استقرض الطعام ببلد الطعام فيه رخيص، فلقيه المقرض في بلد الطعام فيه غال ففيه عند الصاحبين عليه قيمته فقد اتفقا على وجوب رد القيمة دون المثل........و قولهما انظر للمقرض من قول الإمام لأن في رد المثل إضراراً به ثم قول أبي يوسف انظر له أيضا لان قيمته يوم القرض أكثر من يوم الانقطاع وهو أيسر أيضا فإن ضبطه وقت الانقطاع عسر" (الفقہ الحنفی فی ثوبہ الجدید ۴/ ۲۱۸)۔

ترجیح: مندرجہ جہات متعارضہ کے حکموں میں غور کرنے سے ترجیح عدم جواز کو معلوم ہوتی ہے؛ چوں کہ متعینہ مقدار پر اضافہ کو لازم کرنے کی صورت میں ربوا (سود) کا دروازہ کھل جانے کا سخت اندیشہ ہے، نیز قیمتوں میں اضافہ کے لئے کن چیزوں کی قیمتوں کا اعتبار کیا جائے اس کی تعیین میں نزاع کا ہونا لابدی ہے۔

ومشائخنا لم يفتوا بجواز ذلک في العدالي والغطارفة لأنها أعز الأموال في ديارنا فلو أبيح التفاضل فيه ينفتح باب الربوا (ہدایہ ۲/ ۹۳)۔

ومعتمد الفقه جريان الربا في الفلوس كالذهب والفضة وتحريم الربا إذا كان النقد ذهبا وفضة لا يعني إبطال حكمه إذا اصطلح الناس على غيره من غيرهما فإن الثمن غير مقصود لذاته بل لقيمته، فإن شرط زيادة في القدر حرم إن كان الما ل ربويا وإن كان غير ربوي على الصحيح"(الفقہ الحنفی فی ثوبہ الجدید ۴/ ۲۳۷)۔

حکم متوسط: ربوا (سود) سے بچنے کے لئے اگر جنس دین کے علاوہ کوئی دوسری چیز وقت قرض کی قیمتوں کا اندازہ کرکے دلوائی جائے تو یہ جائز ہونے کے ساتھ ساتھ انصاف کے مطابق ہے، اس میں نہ تو اضرار ہے اور نہ ہی تحمل ضرر، اس کے جواز کی وجہ یہ ہے کہ دین (قرض) کو من علیہ الدین سے فروخت کردینا اگرچہ کمی بیشی کے ساتھ ہو جائز ہے۔

''عن ابن عمر رضی اللہ عنہما قال کنت أبیع الإبل بالبقیع فأبیع بالدنانیر فآخذ مکانہا الورق وأبیع بالورق فآخذ مکانہا الدنانیر فأتیت رسول اللہ ﷺ فوجدتہ خارجا من بیت حفصۃ رضی اللہ عنہا فسألتہ عن ذلک فقال: لا بأس بہ بالقیمۃ'' (ترمذی شریف)۔

خلاصۂ جواب:

۱-(الف)- قرض ومؤخر مطالبے (مہر، اجرت، ثمن وغیرہ) کو قیمتوں کے اشاریہ سے متعلق کرنا جائز نہیں، یہی پاکستان کے سمینار کا بھی متفقہ فیصلہ ہے، تجویز ۳ ملاحظہ ہو۔

ذمہ میں ثابت شدہ دیون چاہے وہ کسی بھی قسم کے ہوں ان کو قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ منسلک کردینا جائز نہیں الخ (فقہی مقالات ۱/ ۷۳)۔

(ب)- پنشن چوں کہ یہ تبرعات کی قبیل سے ہے لہٰذا اس میں اضافہ جس طرح سے چاہے کرے؛ خواہ قیمتوں کے اشاریہ کے طریقہ سے یا کسی اور طرح (امداد الفتاوی ۳/ ۱۵۰، فتاوی محمودیہ ۲۰/ ۴۰۳-۱۶/ ۱۱۵)۔

۲- اگر نوٹ کی مالیت کا اندازہ کرکے اصل ثمن کے طور پر سونا یا چاندی وغیرہ طے کیا جائے اور پھر ادائیگی کے وقت باہمی رضا سے متعینہ سونا چاندی کی جو قیمت بنے اس کا لین دین کیا جائے تو یہ جائز ہے (دیکھئے: الفقہ الحنفی فی ثوبہ الجدید ۴/ ۲۰۴)۔

موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت

مفتی لطیف الرحمٰن ولایت علی ☆

الجواب وباللہ التوفیق:

۱- ماہرین معاشیات کا تو یہی کہنا ہے کہ کرنسی اور نوٹ کی قیمت متعین کرنے کے لئے قیمتوں کے "اشاریہ" کو معیار بنایا جائے اور تمام حقوق اور واجبات کی ادائیگی میں قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ کرنسی کی قیمت کے تعلق کو بنیاد بنایا جائے (فقہی مقالات ۱/ ۵۱)۔

اور قرضوں کو قیمتوں کے اشاریہ سے منسلک کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ قرض دار قرض خواہ کو صرف قرض کے برابر روپیہ واپس نہ کرے بلکہ قیمتوں کے اشاریہ میں اشیاء کی قیمتوں میں جس تناسب سے اضافہ ہوا ہے اسی تناسب سے قرض میں اضافہ کر کے واپس کرے، مثلاً کسی نے اگر ایک ہزار روپیہ قرض لئے اور قرض کی واپسی کے وقت قیمتوں کے اشاریہ میں دس فیصد کے تناسب سے اضافہ ہو چکا ہے تو اب قرض دار بھی قرض میں دس فیصد کے تناسب سے اضافہ کر کے گیارہ سو روپے کرے، اس لئے کہ ایک ہزار روپے کی قوت خرید قرض لیتے وقت زیادہ تھی اور قرض کی واپسی کے وقت قوت خرید دس فیصد کے تناسب سے کم ہوگئی، اگر اس صورت میں قرض دار ایک ہزار ہی واپس کرے تو یہ قرض خواہ پر ظلم ہوگا (حوالہ بالا ۱/ ۵۲)۔

لیکن حق بات یہ ہے اس زیادتی کو جائز قرار دینے والوں کی یہ دلیل شرعی قواعد پر کسی

☆ دار الافتاء والارشاد، چابھنی مسجد، ناگروز، ممبئی۔

طرح بھی منطبق نہیں ہوتی، اس لئے کہ شریعت اسلامیہ میں قرضوں کو اسی مقدار کے مثل (برابر) ادا کرنا واجب ہے اس میں کسی کو اختلاف نہیں۔ ادھار کے متعلق یہ ضابطہ معروف ہے: "الدین تقضی بأمثالها" کہ ادھار اور قرض کی ادائیگی مثل سے ہی ہوتی ہے، اور عالم گیری میں ہے: "والقرض هو أن يقرض الدراهم والدنانير أو شيئاً مثلياً فأخذ مثله في ثاني الحال" (۳۶۶/۵)۔

اب "مثل" کی تعیین کرنی ہے کہ مثل سے کیا مراد ہے؟ لہذا بنیادی سوال یہ ہوتا ہے کہ یہ برابری اور مثل مقدار (ناپ، وزن، عدد) میں ضروری ہے یا قیمت اور مالیت میں ضروری ہے؟ چنانچہ قرآن وسنت کے دلائل میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرض کی واپسی میں جو برابری شریعت میں مطلوب ہے وہ مقدار اور کمیت میں مطلوب ہے قیمت اور مالیت میں مطلوب نہیں۔

صحیح بخاری ومسلم میں حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ کے زمانہ میں ہمارے پاس ہر قسم کی ملی جلی کھجوریں آیا کرتی تھیں۔ ہم گھٹیا کھجور کے دو صاع کو اچھی کھجور کو ایک صاع کے بدلے میں بیچ دیتے تھے، جب آپ ﷺ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: دو صاع کھجور کو ایک صاع کھجور کے بدلے میں مت بیچو اور نہ دو صاع گندم کو ایک صاع گندم کے بدلے میں بیچو اور ایک درہم کو دو درہم کے عوض مت بیچو۔

یہ بات حضور ﷺ کو معلوم تھی کہ جو کھجور دو صاع کے بدلے میں بیچی جائے گی وہ اس کھجور کے مقابلہ میں زیادہ قیمتی ہوگی جو ایک صاع کے عوض بیچی جائے گی لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ اس پر راضی نہیں ہوئے بلکہ مقدار اور ناپ میں مماثلت اور برابری کا حکم دیا اور قیمت کے فرق کا اعتبار نہیں کیا (فقہی مقالات ۱/۵۵)۔

جہاں یہ نظام حدیث وسنت کے خلاف ہے وہیں اس میں اور بھی مزید خرابیاں پیدا ہو

جائیں گی۔

۱- سب سے پہلے اس سے سود کا دروازہ کھل جائے گا اور سود خور یہ کہنے لگیں گے کہ اتنے دنوں میں بازار کی قیمتوں میں اس قدر تفاوت ہوا اس لئے اضافہ لیا جانا ضروری ہے، تو اسلام نے جس سود پر آہنی دیوار کھڑی کی تھی اس نظام سے گر جائے گی۔

۲- پھر اشاریہ والے نظام میں دوسری مشکل یہ ہے کہ اس کا حساب وکتاب کرنا آسان نہیں ہوگا اور نہ ہر شخص کے بس کی بات ہوگی۔ ہلال کے باب میں ایک حدیث آئی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''إنا أمة أمية لا نكتب و لا نحسب'' (مشکوۃ) (ہم لوگ امی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں جو دقیق حساب وکتاب نہیں جانتی) (جدید فقہی تحقیقات ۱۳۲/۴-۱۳۳)۔

ایک اور اہم بات جو ماہرین معاشیات سے کہی ہے وہ یہ کہ نوٹ کے بارے میں حکومت نے کبھی یہ رویہ اختیار نہیں کیا جس سے معلوم ہو کہ نوٹ کی قیمت میں کمی بیشی ہوتی ہے مثلاً آپ کسی بھی بینک میں روپیہ جمع کریں اور دس سال بعد وہ رقم نکالیں تو وہ اتنی ہی رقم واپس کرے گا جتنی اس نے جمع کی تھی، جو اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ حکومت کے نزدیک نوٹ کی قیمت یکساں رہتی ہے (حوالہ بالا ۲۱۳/۴)۔

اسی طرح ماہرین معاشیات ''افراط زر'' کی صورت میں تو تائید کرتے ہیں لیکن ''تفریط زر'' کی صورت میں کوئی بھی اس نظریہ کو نہیں اپناتا۔ اگر اس نظریہ کو اپنایا جائے گا تو کوئی بھی شخص اپنا پیسہ بینک میں نہیں رکھوائے گا (فقہی مقالات ۱۷/۱)۔

بہر حال دیون یعنی مؤخر مطالبوں میں جیسے قرض، مہر، پنشن اور ادھار خریداری کی رقم کی ادائیگی کو قیمتوں کے اشاریہ سے متعلق کرنا نہ تو شرعاً جائز ہے اور نہ قیمتوں کے اشاریہ کے ذریعہ ادائیگی کے لئے کوئی منضبط و متیقن قاعدہ ہے، اور جو دقیق فنی قاعدے اس سلسلہ میں بیان کئے جاتے ہیں وہ عوام الناس کے فہم وادراک سے بالاتر ہیں، لہذا شرعی نقطۂ نظر سے قیمتوں کے

اشاریہ کا اعتبار کرنا کسی بھی طرح جائز قرار نہیں دیا جا سکتا (جدید فقہی تحقیقات ۴/ ۱۸۸)۔

۲- البتہ قرض دیتے وقت یا مہر مقرر کرتے وقت اور ادھار فروختگی کے وقت طرفین واجب الاداء نوٹ کی مالیت سونے یا چاندی میں طے کرلیں، اور بوقت ادائیگی اس قدر سونے یا چاندی کی قیمت کے مساوی نوٹوں کی ادائیگی پر معاملہ کریں، مثلاً اس طرح کہ آج دو تولہ چاندی کے برابر سو روپیہ قرض میں دے رہا ہوں اور وصولیابی کے وقت دو تولہ چاندی کے برابر روپے لوں گا خواہ کتنے ہی نوٹوں کے برابر ہو (جدید فقہی تحقیقات ۴/ ۲۳۰)۔

اور ''مہر'' کے بارے میں تو سب سے آسان اور سہل صورت اور عورتوں کے حق میں بہتر یہی ہے کہ اس کو سونے یا چاندی کی شکل میں طے کرلیا جائے، اس میں عورت اس کی قیمت بازار کے نرخ سے وصول بھی کرلیں گی اور اس میں شرعاً کوئی حرج بھی واقع نہیں ہوگا اور نہ عورت خسارہ میں رہے گی، اور مرد پر کوئی زائد بار بھی نہیں پڑے گا، واللہ اعلم بالصواب۔

موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت سے متعلق سوال کا جواب

مولانا عبد اللطیف پالنپوری ☆

۱- یقیناً کاغذی نوٹوں کی اپنی ذاتی کوئی قیمت نہیں ہوتی، اور افراط زر کی صورت میں اس کی قوت خرید تیزی سے گر جاتی ہے، لیکن اس کے باوجود یہ عرفی ثمن ہے، دوسری طرف یہ بات بھی متفق علیہ ہے کہ شریعت اسلامیہ نے قرضوں کی ادائیگی میں اسی مقدار کے مثل کو واجب قرار دیا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ یہ مثلیت اور برابری مقدار میں ضروری ہے یا قیمت و مالیت میں؟ دلائل شرعیہ میں غور کرنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ قرضوں کی واپسی میں جو برابری شریعت میں مطلوب ہے وہ مقدار اور کمیت میں مطلوب ہے، قیمت اور مالیت میں مطلوب نہیں۔ مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ نے اپنے مقالہ ''کرنسی کی قوت خرید'' میں دلائل کو تفصیل سے بیان فرمایا ہے (فقہی مقالات ۱/ ۵۳)۔

لہذا دیون یعنی مؤخر مطالبوں مثلاً قرض، مہر، ادھار خریداری کی رقم، اور وقت پر ادا نہ ہونے والی تنخواہوں کو قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ وابستہ کرنا شرعاً صحیح نہ ہوگا، اور یہ باب ربوا کے کھلنے کا ذریعہ ہوگا (فقہی مقالات ۱/ ۷۳)۔

۲- سوال نامہ میں مذکورہ صورت شرعاً صحیح نہیں ہے، ہاں یہ صورت ہوسکتی ہے کہ قرض دیتے وقت بجائے نوٹ کے سونا یا چاندی بطور قرض دے، یا مہر کے تقرر کے وقت یا ادھار فروختگی

☆ دار العلوم جامعہ نذیریہ کاکوسی، گجرات۔

کے وقت بجائے نوٹ کے سونا یا چاندی طے کیا جائے، پھر ادائیگی کے وقت یا تو اسی قدر سونا اور چاندی ادا کرے یا سونے یا چاندی کے بدلے میں اس کی قیمت کے مساوی نوٹ ادا کئے جائیں، لیکن نوٹ ادا کرنے کی صورت میں اسی مجلس میں نوٹ پر قبضہ ضروری ہے تا کہ بیع الدین بالدین لازم نہ آئے:

"ولا یصح السلم حتی یقبض رأس المال قبل أن یفارقه فیه أما إذا کان من النقود فلأنه افتراق عن دین بدین وقد نهی النبی علیه السلام عن الکالئ بالکالئ" (ہدایہ ۳/۹۶ باب السلم)۔

(اور بیع سلم صحیح نہیں ہے یہاں تک کہ رأس المال پر اسی مجلس میں جدا ہونے سے پہلے قبضہ کرلے، وجہ یہ ہے کہ جب رأس المال نقود میں سے ہوگا تو افتراق عن دین بدین لازم آئے گا، حال یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے ادھار کو ادھار کے بدلے میں بیچنے سے منع فرمایا ہے)۔

پنشن حکومت کی طرف سے ایک عطیہ ہے، جز و اجرت نہیں ہے (فتاوی محمودیہ ۲۱۴ مکتبہ صدیق ڈابھیل)۔

لہذا حکومت اگر پنشن کو قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ وابستہ کر کے ادا کرے، چاہے کمی کی صورت میں یا زیادتی کی صورت میں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، اس لئے کہ یہ تبرع ہے۔

موجودہ کرنسی سے متعلق جوابات

مفتی شیر علی گجراتی ☆

مہر مؤجل، پنشن وغیرہ میں معیار کا پیمانہ کیا ہوگا؟

دیون یعنی مؤخر مطالبات مثلاً قرض، مہر مؤجل، پنشن، ادھار خریداری کی رقم اور وقت پر ادا نہ ہونے والی تنخواہوں کی ادائیگی کے لئے سونے کو معیار بنایا جانا چاہئے؛ اس لئے کہ سونا ہی ثمن حقیقی ہے۔

اور اگر ڈالر کو معیار بنائے جائے تب بھی درست ہے؛ کیوں کہ وہ ثمن عرفی عام ہے اور بین الملکی تجارت اور معاملات حکومتوں کے درمیان ڈالر ہی کے ذریعہ انجام پاتے ہیں، اور ڈالر میں زیادہ تر انحطاط نہیں ہوتا ہے برخلاف دیگر ممالک کی کرنسی کے، مثلاً ہندوستان کے روپیہ میں اکثر اوقات گراوٹ زیادہ رہتی ہے۔

اور ویسے بھی ہندوستان کا روپیہ ثمن عرفی خاص ہے اور ڈالر ثمن عرفی عام ہے اور جب ثمن عرفی عام اور ثمن عرفی خاص میں تعارض ہوجائے تو ثمن عرفی عام کو ترجیح حاصل ہوتی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

☆ دارالعلوم فلاح دارین ترکیسر، گجرات۔

موجودہ کرنسی کا شرعی پہلو

مفتی اسماعیل بن ابراہیم بھڑکودروی ☆

۱- عرف حادث میں کاغذی نوٹوں نے ثمن عرفی کی حیثیت لے لی ہے اور جمہور مفتیان کرام نے زکوۃ وغیرہ کی ادائیگی میں اس پر ثمن عرفی کا حکم لگایا ہے، اس کو سونا، چاندی یا کسی مالیت کا وثیقہ نہیں شمار کیا ہے نیز کچھ بڑے ممالک نے اس کے سونے میں ناقابل تبدیل ہونے کا اعلان بھی کر دیا ہے جیسا کہ جناب محمد سلیمان تنولی صاحب اپنے ایک مضمون بعنوان "نصاب زکوۃ: اجتہاد کی ضرورت" میں لکھتے ہیں:

"تاہم جب ۵/اگست ۱۹۷۱ء کو امریکہ نے ڈالر کے سونے میں ناقابل تبدیل ہونے کا اعلان کیا تو سونے کا پیسے سے تعلق تقریباً ختم ہوگیا، اس طرح اب زکوۃ کی تعیین کے لئے روپے کو چاندی یا سونے سے منسلک کرنے کا کوئی جواز نہیں، شرعاً جواز تب تھا جب قانوناً نوٹ چاندی یا سونے میں قابل تبدیلی تھے، اب ایسا نہیں، اس لئے شرعاً کوئی جواز نہیں" (ماہنامہ الفرقان: مارچ ۲۰۰۵ء)۔

اور حکومت کا کوئی بینک کاغذی نوٹوں کے عوض اس کی قیمت کے برابر نوٹ بردار کو سونا دینے کا قانوناً ذمہ دار اور پابند بھی نہیں سمجھتا، لہذا اس کو اتنی قیمت کے سونا، چاندی کا وثیقہ سمجھنا اور مؤخر مطالبات میں سونے چاندی کی قیمت کے اعتبار سے نوٹوں کی ادائیگی کو ضروری قرار دینا یہ

☆ دار العلوم عربیہ اسلامیہ کنتھاریہ بھروچ۔

شرعاً، قانوناً وعرفاً جائز نہیں ہے، وہ صرف ایک عددی ثمن عرفی ہے، لہذا اسی عدد کے اعتبار سے ادائیگی ضروری ہونی چاہئے۔

رہی بات مؤخر مطالبات میں کاغذی نوٹ کی مالیت کو اشیاء ضرورت کی قیمتوں کے ساتھ وابستہ کرنا تو یہ بھی مشکل ہے، اولاً تو اس لئے کہ اشیاء ضرورت کی تعیین کیسے ہوگی؟ ثانیاً اس لئے کہ پڑھے لکھے لوگ بھی اس وابستگی کا مطلب صحیح طور پر نہیں سمجھتے اور نہ سمجھا پاتے ہیں، پھر عوام الناس جن کو اس بنیاد پر معاملہ کرنا ہوگا وہ بغیر جانے، سمجھے کیسے معاملہ کر پائیں گے، لہذا یہ کہنا صحیح ہے کہ عامۃ الناس کے درمیان ادائیگیوں کے لئے (کاغذی نوٹ کے) ایسے معیار مقرر کرنا جن کی بنیاد فنی اصولوں پر ہو، باہمی تنازعہ کا موجب ہوگا، نیز اس طرح سو روپے کے بدلہ پانچ روپے کی ادائیگی باب ربوا کو کھولنے کا ذریعہ بنے گی۔

اور قانوناً اور عرفاً بھی ایسی ادائیگی کو سود ہی پر محمول کیا جاتا ہے اور شرعاً بھی یہی حکم ہوگا۔

۲- قرض میں تو قرض لی ہوئی چیز کی مثل لوٹانی ضروری ہوتی ہے لہذ قرض لیتے وقت نوٹ کی مالیت سونے یا چاندی میں طے کر کے قرض کی ادائیگی اتنے سونے یا چاندی کی نوٹوں سے طے کرنا یہ نوٹ کو ثمن عرفی ماننے کی صورت میں سودی معاملہ ہو جائے گا، لہذا جائز نہیں ہے۔

البتہ کسی سامان کی ادھار فروختگی کے وقت جتنے نوٹ میں خریدنے کا ارادہ ہے اتنی قیمت کے سونے یا چاندی کو ثمن مؤجل کے طور پر طے کیا جائے تو یہ جائز ہے، ایسے ہی نکاح کے وقت مہر مؤجل میں سونے یا چاندی کی جائز مقدار کو متعین کرنا بلاشبہ جائز ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کرنسی نوٹ

مولانا محمد صدر الحسن قاسمی ☆

۱- دوسرے فقہی سمینار میں شرکاء سمینار نے کرنسی نوٹ کی حیثیت کو واضح کردیا ہے اور یہ فیصلہ کیا ہے کہ:

(۲) ''کرنسی نوٹ سند وحوالہ نہیں ہے بلکہ ثمن ہے اور اسلامی شریعت کی نظر میں کرنسی نوٹ کی حیثیت زر اصطلاحی وقانونی کی ہے''۔

(۲) ''عصر حاضر میں نوٹوں نے ذریعہ تبادلہ ہونے میں مکمل طور پر زر خلقی (سونا، چاندی) کی جگہ لے لی ہے اور باہمی لین دین نوٹوں کے ذریعہ انجام پاتا ہے، اس لئے کرنسی نوٹ بھی احکام میں ثمن حقیقی کے مشابہ ہے؛ لہذا ایک ملک کی کرنسی کا تبادلہ اسی ملک کی کرنسی سے کمی وبیشی کے ساتھ نہ تو نقد جائز ہے نہ ادھار۔

مذکورہ فیصلہ نے کرنسی نوٹ کو زر خلقی کے مشابہ قرار دیکر اس معاملہ کو آسان کردیا کہ مؤخر مطالبوں میں بھی زر خلقی کا ہی حکم ہوگا اور جس طرح زر خلقی کو کسی اشارہ سے وابستہ نہیں کیا جاسکتا ہے اسی طرح اس کو بھی کسی اشاریہ سے وابستہ کرنا صحیح نہیں ہوگا۔ ہاں اگر اس کی ثمنیت کو باطل کر کے شیخین کے مسلک پر مبیع کا درجہ دیا جائے تو کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ جائز ہوگا فلوس پر قیاس کرتے ہوئے۔

☆ مدرسہ اسلامیہ جامع العلوم چندوارہ مظفر پور۔

پھر اس میں اشاریہ سے وابستہ کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے،نوٹ بھی معتز ز مال ہے،عرف ورواج میں کسی کے وہم وخیال میں بھی یہ بات نہیں ہے کہ اس کی مالیت مفقود ہے؛ البتہ زکوۃ کے باب میں اس کواموال تجارت کاحکم ہے۔مگراس کی وجہ یہ ہے کہ زکوۃ کے باب میں معیار نصاب چاندی ہے اس وجہ سے کرنسی نوٹ کواموال تجارت کاحکم ہے۔باقی تمام معاملات میں کرنسی نوٹ کی ثمنیت کا اعتبار کرتے ہوئے مؤخر مطالبات میں کمی بیشی کرنا یا اس کو اشاریہ سے وابستہ کرنا صحیح نہیں ہے۔پھر یہ کہ کھلے عام ربوا کی چھوٹ ہوجائے گی،لہٰذا سدذرائع میں اس کو داخل کرکے ربوا کے دروازہ کو بند کرنا لازم ہے۔

قرض ایک تبرع اور بحکم عاریت ہے اس لئے قرض دینے والا بھی یہ سمجھ کر ہی قرض دیتا ہے کہ پانچ سال یا دس سال کے بعد مجھے اسی مقدار میں رقم واپس ملے گی اور اسی مقدار کا مطالبہ بھی ہوتا ہے اور یہی حکم دوسرے دیون کا بھی ہے،صرف فرق یہ ہے کہ قرض میں مدت متعین کرنے کے باوجود متعین نہیں ہوتا ہے،قرض دینے والا جب چاہے واپسی کا مطالبہ کرسکتا ہے البتہ دین میں مدت کی تعیین ہوتی ہے اور اس کی پابندی لازم ہوتی ہے،لیکن مدت کسی ثمن کا معاوضہ بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی ہے اس لئے قیمتوں کے اُتار چڑھاؤ کا کوئی اعتبار کئے بغیر مؤخر مطالبوں میں کمی بیشی کی گنجائش نہیں ہے۔

۲-سونے اور چاندی میں بھی طے کرنا صحیح نہیں ہے،جبکہ ادائیگی کرنسی نوٹ کی کرنسی نوٹ سے ہی ہو؛ کیونکہ اس صورت میں یہ ایک من گھڑت حیلہ ہوگا اور اس کو حیلہ شرعی نہیں کہا جاسکتا ہے؛ کیونکہ اگر ہم پندرہ ہزار روپے کسی کو یہ کہکر دیں کہ یہ پچاس تولہ چاندی کی قیمت کے برابر ہے دس سال کے بعد پچاس تولہ چاندی کی جو قیمت ہوگی اسی مقدار میں ہم یہ روپیہ واپس لیں گے۔

تو اس صورت میں ممکن ہے کہ چاندی کی قیمت میں گراوٹ آجائے اور پچاس تولہ کی

قیمت صرف پانچ ہزار رہ جائے تو کیا ایسی صورت میں دائن کو صرف پانچ ہزار روپیہ ہی ملے گا؟ اس دائن کا دس ہزار روپے کا نقصان ہے اور قیمت کے اضافہ کی صورت میں مدیون کا نقصان ہے کہ اس کو حق مطالبہ سے زیادہ ادا کرنا پڑ رہا ہے۔

احکام شرع میں عرف کو بڑا دخل ہے اور اب تک عرف میں جو معمول رہا ہے اس کو اپنے حال پر رہنے دینا ہی مناسب ہے، اس لئے میری رائے فقہ کی جزئیات کے مطالعہ کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچی ہے کہ مؤخر مطالبوں میں کرنسی نوٹ کی قیمت کو نہ تو کسی اشاریہ سے وابستہ کیا جائے اور نہ سونے اور چاندی کی قیمت میں طے کریں۔

موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت

مولانا نثار احمد گودھروی ☆

نوٹ کی ایک قیمت ہے جو اس پر لکھی ہوئی ہے جس کو قیمت اسمیہ کہا جاتا ہے اور ایک اس کی قوت خرید ہے جس کو قیمت حقیقیہ کہا جاتا ہے۔

۱- مسئلہ یہ ہے کہ دیون کی واپسی قیمت اسمیہ کے مطابق ہونی چاہئے یا قوت خرید کے مطابق؟

اصل تو دیون اور قرضوں میں مماثلت فی المقدار کا اعتبار ہے نہ کہ مماثلت فی القیمۃ کا جیسا کہ فقہاء کے کلام سے مترشح ہوتا ہے: ''**الدیون تقضی بأمثالها الأقراض تقضی بأمثالها**'' مراد اس سے مماثلت فی المقدار ہے۔ آج جو انڈیکس (اشاریہ) کا نظریہ پیش کیا جاتا ہے جس کا تعلق فنی اصولوں سے ہے، اور فقہی نقطۂ نظر سے بھی غلط ہے جس کی تفصیلی بحث حضرت مولانا محمد تقی عثمانی نے اپنی کتاب اسلام اور جدید معیشت وتجارت میں فرمائی ہے، رہا قدر کے کم نہ ہونے کا معاملہ اس میں مدیون اور مستقرض کا عمل ودخل نہیں، لہذا اس کی ذمہ داری مدیون پر ڈالنا سراسر ظلم ہے، خاص کر کے قرض دینے کے بعد زیادتی کی امید رکھنا بھی درست نہیں۔ زیادتی کو حاصل کرنے کے لئے شریعت نے شرکت، مضاربت کا طریقہ رکھا ہے، اس پر عمل کیا جائے۔

☆ دارالافتاء جامعہ رحمانیہ گودھرا، گجرات۔

موجودہ کرنسی اور شرعی نقطہ نظر

مولانا محمد ذکاء اللہ شبلی ☆

یہ ایک حقیقت ہے کہ کاغذی نوٹوں کی حیثیت روز بروز گرتی جا رہی ہے، اس لئے ایسے دیون جن کی ادائیگی کے لئے فریقین کے درمیان جو مدت یا تاریخ طے پائی ہو اس کے اندر ادائیگی سے مدیون نے غفلت برتی اور تقاضا کے باوجود کوئی معقول بات پیش نہیں کی اور عرصہ گزر گیا تو ایسے معاملہ میں اس کی ادائیگی کے مطالبہ پر فریقین کے درمیان جو مدت طے پائی تھی اور اس وقت اس قدر رقم میں جتنی چاندی خریدی جاسکتی تھی قاضی اس قدر چاندی دینے کا فیصلہ دے سکتا ہے۔

البتہ شق دوم میں جو صورت مذکور ہے لین دین کے وقت ہی رقم کے بدلے اسی قدر سونے یا چاندی یا اس کی قیمت کی ادائیگی کی شرط کرلی جائے تو یہ زیادہ بہتر اور مناسب ہے اور ہر قسم کے خسارے ونزاع سے حفاظت ہے۔

☆ دارالقضاء اندور۔

موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت

حافظ کلیم اللہ عمری مدنی ☆

۱-صورت مذکورہ میں جس وقت کرنسی کی قیمت تھی اسی کی ادائیگی ہوگی، اس لئے کہ فریقین کے مابین یہی طے ہوا تھا اور اس لئے بھی کہ وقت ادائیگی رقم بڑھ جاتی ہے اور یہ مثل ربا ہے جیسا کہ کسی نے کرنسی یا سکہ کی شکل میں قرض لیا تھا اور کرنسی یا سکہ منسوخ ہوجائے تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے پاس طے شدہ اصول کے تحت وہی سکہ یا کرنسی ادا کریگا جبکہ صاحبین کے پاس قیمت ادا کی جائے گی لیکن اس میں ربا کا شائبہ موجود ہے جیسا کہ کتاب **الصرف** میں امام صاحب اور صاحبین کا سکہ رائج **الوقت** کے سلسلہ میں اختلاف مذکور ہے جب وہ سکہ منسوخ ہوجائے۔

ولو استقرض فلوسا نافقة فكسدت عند أبي حنيفة رحمه الله يجب عليه مثلها لأنه إعارة وموجبه رد العين معنى والثمنية فضل فيه إذ القرض لا يختص به وعندهما تجب قيمتها لأنه لما بطل وصف الثمنية تعذر ردها كما قبض فيجب رد قيمتها (العنایۃ شرح الہدایۃ ۱۰/۳۲)۔

۲-بوقت ادائیگی اسی قدر سونے یا چاندی کی قیمت کے مساوی نوٹوں کی ادائیگی میں شرعا کوئی حرج نہیں ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

☆　مفتی جامعہ دارالسلام عمرآباد۔

پانچواں باب

اختتامی امور

مناقشہ

موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی:

حضرات! اس وقت نہایت اہم موضوع آپ کے سامنے ہے، معیشت کی ایک اہم ضرورت ایک ایسی چیز کا وجود ہے جو تبادلہ کا ذریعہ بنے، اسی کو ثمن یا زر یا کرنسی کہتے ہیں، اگر کرنسی کا وجود نہ ہو تو کسی کے پاس چاول تو ہو، کپڑے نہ ہو تو اول تو اسے کپڑے حاصل کرنے کے لئے منوں اور بعض اوقات ٹنوں چاول کا ڈھیر اپنے گھر سے کپڑے کی مارکیٹ تک لے جانا پڑے گا، تاکہ کپڑوں سے اس کا تبادلہ ہو جائے، پھر یہ عمل ضروری نہیں ہے کہ جب چاول کا اتنا سارا بوجھ اٹھا کر وہ کپڑے کی دکان پر پہنچے تو کپڑا بیچنے والے کو چاول کی ضرورت بھی ہو اور وہ اسے قبول بھی کرلے، اسی لئے ضرورت محسوس کی گئی کہ کوئی ایسا ذریعہ تبادلہ ہو جس کا وزن کم ہو اور اس کی قدر بڑھی ہوئی ہو، انسان کی اس ضرورت کے لئے اللہ نے سونے چاندی کو پیدا فرمایا اور تمام لوگوں نے ذریعۂ تبادلہ کی حیثیت سے اسے تسلیم کرلیا اس لئے اس کو ثمن خلقی کہتے ہیں۔

پھر ایسا ہوا کہ آہستہ آہستہ کاغذی نوٹوں اور معدنی سکوں نے سونے چاندی کی جگہ لے لی، یہ کیوں ہوا؟ اس کی ایک طویل تاریخ ہے؛ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سونے چاندی کی تو بجائے خود قیمت واہمیت تھی، لیکن ان کاغذی نوٹوں کی خود کوئی قیمت نہیں ہے، اسی لئے یہ سوال پیدا ہوا کہ کاغذی نوٹ اصل ثمن ہیں یا وثیقۂ ثمن ہیں؟ اگر اصل ثمن ہوں تو لین دین میں نوٹوں کی تعداد کا اعتبار ہوگا، اور وثیقۂ ثمن ہوں تو لینے اور ادا کرنے کے وقت کی قوت خرید معتبر ہوگی، اگر اس کو

بعینہ ثمن مان لیا جائے تو تاجر سے ادا کی جانے والی رقم قوت خرید کے اعتبار سے بعض اوقات نصف یا اس سے بھی کم ہوجاتی ہے، تو ظاہر ہے کہ یہ تقاضۂ عدل کے خلاف محسوس ہوتا ہے، جب کہ احکام شریعت کی بنیاد عدل پر ہے، اور اگر قوت خرید کا لحاظ کرتے ہوئے ادائیگی کے وقت زیادہ نوٹ واپس کئے جائیں تو سود کا شبہ پیدا ہوتا ہے اور سود کی شناعت ظاہر ہے۔

ان دو جہتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس مسئلہ کو آپ حضرات کے سامنے پیش کیا گیا ہے، امید ہے کہ شریعت کے اصولوں کو اور فقہاء کے اجتہادات کو سامنے رکھ کر آپ مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور فرمائیں گے، اور امت کو آپ کے علم سے روشنی حاصل ہوگی۔

مولانا محمد محی الدین صاحب (بڑودہ):

میں اس تجویز کے بے سود ہونے کے ایک پہلو کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں، پنشن، تنخواہ ایک الگ چیز ہے، اس میں اگر کوئی خسارہ کا اشتباہ ہے تو تنخواہوں کے اضافے، پنشن کے اضافے وغیرہ سے اس کی تلافی پوری ہوجاتی ہے۔ مہر کا مسئلہ تو خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے اور چاندی ہی سے مہر کو مقرر کیا اپنی ازواج مطہرات اور صاحبزادی کا اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے، تو مہر مثلاً ایک تولہ سونا متعین ہوگیا، ٹھیک ہے لیکن آج نکاح ہوا اور ایک شخص شوہر یہ سمجھتا ہے کہ ایک تولہ پانچ ہزار کا ہے اور اس لحاظ سے اس نے متعین کردیا، اب ظاہر بات ہے کہ اب دو مہینے کے بعد، تین مہنے کے بعد، چار مہینے کے بعد سونے کی قیمت جیسا کہ آج کل کیسا ہو رہا ہے اضافہ ہوگیا، اب جو ہے شوہر جس نے یہ سمجھا تھا کہ پانچ ہزار کا سونا میں لاکر کے دے دوں گا، اس کے ذمہ مطالبہ اب پندرہ ہزار کا ہوگیا ہے اور عورت وہ سمجھ رہی تھی کہ اب میں پندرہ ہزار کی مستحق ہوں، تو ظاہر بات ہے کہ ہم اگر سونے کے اندر بھی روپیوں کی قیمت متعین کرتے ہیں تو یہی بات تنخواہ وغیرہ میں بھی لازم آئے گی کہ اگر سونے سے ہم نے تنخواہ کی

تعیین کردی یا ادھار کا قرض کی ادائیگی کا تو اب اس صورت میں یا جس سونے سے ہم نے متعین کی تو اب اگر تنخواہ میں دیر ہوئی ہے، تاخیر ہوئی ہے یا پورے مہینہ کی تنخواہ اور چاندی کی قیمت ہر روز گھٹتی بڑھتی رہتی ہے تو اس کے پیش نظر ادائیگی کو اشاریہ سے وابستہ کرنے میں دقتوں اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔

مولانا یاسر ندیم قاسمی (دیوبند):

..........کمیت کا اعتبار ہے کیفیت کا نہیں یہی وجہ ہے کہ کتب فقہ میں اس کی تصریح ملتی ہے کہ سونے کا سونے سے تبادلہ ہو تو اس میں اس کے جید یا ردی ہونے کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا، لہذا کرنسی اگرچہ سونے کی ترجمانی نہیں کرتی، مگر ثمن عرفی ہونے کی بناء پر اس کو کسی نہ کسی چیز سے متعلق کرنا ضروری ہے اور جیسا کہ میں نے ابھی کہا کہ سونے سے متعلق کرنا قرین قیاس ہے، اس لیے کرنسی کا اگر کسی نے سو روپے قرض لیے دس سال کے بعد اگرچہ اس کی حیثیت میں اور عرفی قدر میں کوئی کمی زیادتی ہوئی ہو، لیکن اس کو سو ہی روپے واپس کرنے ہیں، اس لیے کہ جیسا کہ میں نے ابھی ذکر کیا کہ سونے میں کمیت کا اعتبار ہے کیفیت کا نہیں۔ جزاکم اللہ

مفتی اعجاز الحسن صاحب (کشمیر):

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ سب سے پہلے میری گزارش سوالنامے کے اندر یہ ہے کہ جس طرح سے سوالنامے میں قرض، مہر، پنشن، ادھار، خریداری کی رقم یا وقت پر ادا نہ ہونے والے تنخواہوں کے بارے میں شقیں داخل کی گئی ہیں، ایک شق کا اس میں اضافہ کیا جائے وہ یہ ہے کہ ہمارے کشمیر میں خصوصاً اور ممکن ہے کہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں بھی یہ شکل ہو یا عالمی سطح پر بھی یہ نوعیت ہو کہ ہمارے یہاں خوشی و غمی کے موقع پر ہدایا لینے اور دینے کا رواج ہے اور ان ہدایا کے اندر شکل ظاہری اعتبار سے ہوتی ہے ہدیہ کی، لیکن حقیقت کے اعتبار سے اس کی شکل ہوتی ہے

لین دین کی، اب اگر آج اس سال کوئی شخص کسی کو ہدیہ پیش کر رہا ہے کسی خوشی کے موقع پر، دس سال کے بعد یہ آدمی اس کو کسی خوشی کے موقع پر واپس ہدیہ دے رہا ہے، آج جو پانچ سو ہدیہ دے رہا ہے اس کے ذہن میں یہ شکل ہوتی ہے کہ واپسی کے موقع پر اس سے زیادہ رقم مجھے دے گا۔ اگر وہ کم دیتا ہے تو لینے والا ناراضگی کا اظہار کرتا ہے، اس شق کا بھی اس میں اضافہ کیا جائے۔ دوسری گزارش یہ ہے کہ مہر کے سلسلہ میں ہم لوگ تو اتنا اختیار رکھتے ہیں شریعت کی روشنی میں کہ ہم لوگ اس کے اندر سونے یا چاندی کو معیار بنائیں۔

مفتی محمد زاہد علی خان صاحب (علی گڈھ):

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ ثمنیت کے سلسلہ میں جو بات کہی گئی ہے کہ اس کو، کرنسی کو آیا اصطلاحی ثمن یا عرفی ثمن تسلیم کیا جائے یا وثیقۂ ثمن۔ تو میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اس کو اصطلاحی ثمن یا عرفی ثمن تسلیم کرنے میں زیادہ فائدہ ہے، نہ کہ وثیقۂ ثمن صرف تسلیم کرنا۔ اگر چہ پہلے وثیقۂ ثمن کے طور پر اس پر لکھا رہتا تھا، اس کے علاوہ صرف سونے کو متعین کر لینا بھی خلاف عدل معلوم ہوتا ہے، اس لیے کہ دنیا کا جو مالیاتی نظام ہے اس حد تک بدل چکا ہے کہ صرف سونے کے اندر بسا اوقات گرانی ہو جاتی ہے، باقی چیزوں کے اندر گرانی اس حد تک نہیں ہوتی ہے، لہذا کرنسی غیر ہنگامی حالات میں معیار ہونا زیادہ قرین انصاف ہے بنسبت سونے کے معیار بنانے کے۔ اس کے علاوہ یہ ایک جو رائے ہے کہ اموال ربویہ میں کمیت کا اعتبار کیا جائے گا کیفیت کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، یہ بات اگر قاعدہ بنا دیا جائے تو خلاف عدل ہونا زیادہ ممکن ہے، اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ہے کہ اگر اس پر چلا جائے گا تو کوئی کسی کو سود کے بغیر رقم دے ہی نہیں سکتا، چوں کہ اس کو کوئی فائدہ ہی نہیں ہوگا الٹا نقصان ہوگا، لہذا کبھی بھی کسی کو قرض ملنا ممکن نہیں ہے اور یہ صورت اضطرار کی پیدا کر دیتا ہے، کسی کو اپنے کسی قاعدہ فقہیہ کی بنیاد

پرہم اس کو بنیادی حقوق سے محروم کردیں، یہ بات بہت صحیح نہیں ہے، چوں کہ قیام عدل فرض ہے اور قیام عدل کے بہر حال یہ خلاف ہے تو اثمان خلقیہ اور اثمان عرفیہ دونوں کا اعتبار کرتے ہوئے اس زمانے میں چوں کہ دنیا میں جو رائج ہے اور تقریباً تمام ملکوں کا اتفاق ہے کہ اثمان عرفیہ جو ہیں وہ معتبر ہیں اس اعتبار سے اس کا خیال رکھنا از حد فائدہ مند ہوگا، پنشن کے سلسلہ میں یہ کہہ دینا کہ یہ صرف مستأجر کی طرف سے تبرع ہے، اس کو عام طور پر جو گویا ہم لوگوں سے دستخط کرائے جاتے ہیں یہ اس کے خلاف پایا جاتا ہے، یہ دنیا میں جو عام طور سے اتفاق ہے اس سلسلہ میں اس کے بھی خلاف پایا جاتا ہے، بلکہ یہ حقیقتاً حق الخدمت ہے جو متأخر اور ضرورت کے موقع پر ہم کو مل جاتا ہے نہ کہ اس کو صرف تبرع قرار دینا تبرع کو بہر حال کسی بھی وقت منع کیا جاسکتا ہے، حق الخدمت کو منع نہیں کیا جاسکتا؛ لہذا دیون متاخرہ ہوں یا مؤخر مطالبے ہوں اس میں کرنسی کو اس وقت جو معتبر قرار دیا گیا ہے ہم کو بھی اسکا خیال رکھنا پڑے گا چوں کہ یہ عدل کے زیادہ قریب ہے اور یہ میری ایک رائے ہے، واللہ اعلم بالصواب۔ جزاکم اللہ

مولانا محمد مبین سلیم ندوی صاحب (علی گڈھ):

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ یہاں پر کئی مباحث سامنے آئے، اس میں سے جو بات سامنے نہیں آئی وہ یہ تھی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جو سکے، دراہم ودنانیر موجود تھے۔ اس میں سے اصل کونسا سکہ تھا جس پر قیاس کر کے صحابۂ کرام دوسرے سکوں کو جوڑتے تھے، یہ ابھی تک کسی کے سامنے بحث نہیں آئی ہے تو اس میں علامہ ماوردیؒ نے اور علامہ بلاذریؒ نے اور ابن خلدونؒ نے اس کی تفصیلات ذکر کی ہیں، اس میں سے یہ ہے کہ جو دینار کی کرنسی تھی وہ تو متفق علیہ طور پر لوگوں کے درمیان معروف تھی، پھر ایک دینار کا کتنا وزن ہے اس کے اندر کوئی اختلاف نہیں تھا۔ لیکن دراہم کی جو کرنسی موجود تھی اس میں اختلاف پایا جاتا تھا۔ تو دراہم تین قسم کے تھے،

وزن بھی تین قسم کے تھے حضرت عمرؓ کے زمانہ میں، حضرت عمرؓ نے اس کو مشورہ کر کے متعین کردیا اس کے بعد اس زمانے تک اسلامی کرنسی وجود میں نہیں آئی تھی، بلکہ جو رومی اور کسروی کرنسیاں تھیں وہی چلتی تھیں، اس کے بعد عبدالملک بن مروان کے زمانہ میں جب اسلامی سکے کو ڈھالا گیا یعنی دینار اور دراہم کو، تو درہم کے اندر بھی یہی خیال رکھا گیا کہ جو تین قسم کے دراہم کی تعداد ہے اور وزن ہے، اس کا اوسط متعین کر کے جیسا کہ علامہ ماوردیؒ نے لکھا ہے انھوں نے اس بات میں اس دینار کے اصل وزن اور قیمت کا خیال رکھا، جیسا کہ علامہ ماوردیؒ لکھتے ہیں: عہد فارس میں تین وزن کے درہم مضروب ہوتے تھے، ایک تو مثقال کے وزن سے بیس قیراط کا، دوسرا بارہ قیراط کا، تیسرا دس قیراط کا، عہد اسلامی میں درہم ڈھالنے کے وقت ان تینوں کا مجموعہ یعنی بیالیس قیراط کا اوسط یعنی چودہ قیراط لیکر اس وقت درہم ضرب کرایا گیا، ایسے درہم کا وزن سات مثقال کے برابر ہے، اور بعض کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے جب درہم میں اختلاف پایا، کوئی درہم بغلی وزن آٹھ دانق کوئی تبری وزن چار دانق، کوئی مغربی وزن تین دانق اور کوئی یمنی وزن ایک دانق، تو حکم دیا کہ سب سے اعلیٰ اور سب سے ادنیٰ کو جو زیادہ مروج ہو جمع کردو، اس طریقہ سے انھوں نے اوسط نکالا، کہنے کا مقصد یہ ہے کہ چوں کہ سونے اور چاندی کا معیار تقریباً قریب قریب تھا تو انھوں نے چاندی کے سکہ کو ڈھالتے وقت اس بات کا خیال رکھا کہ فرق اس کا سونے کے وزن سے اور اس کی قیمت سے کیا ہے، ایک تو اس میں اصل جو قرار دیا جائے وہ سونے کے سکے کو اصل قرار دیا جائے اور اس کے وزن کے اعتبار سے قیمت کا تعین ہو۔

دوسری بات کرنسی کے سلسلہ میں کہ یہ کرنسی جو اس وقت موجود ہے اس کو وثیقۂ ثمن قرار دیا جائے، یہ تو نہ بینک اس کا التزام کرے گی، اور بینکوں نے بھی اس کا انکار کردیا ہے اس لیے یہ خود نقدین کی طرح کی حیثیت رکھتی ہے، اسی لیے اس صورت حال میں جو اس وقت مسئلہ ہے قرض و ادھار کا، اگر قرض دیتے وقت یہ تعین کیا جائے کہ اس وقت سونے کی مقدار میں اتنی قیمت

ہوتی ہے، اسی وقت تعین کیا جائے، اور جب وہ ادا کرے قرض کو، اس وقت سونے کی جو قیمت ہو اس کو واپس کرے، یہ زیادہ بہتر ہوگا اور ربوا سے بھی خالی ہوگا۔ جزاکم اللہ

مولانا ظہیر الدین صاحب (کانپور):

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: ''أحل الله البيع وحرم الربوا'' اس میں جو ربوا ہے اور اس کا جو اصل مقصد ہے، اس کی طرف ہم کو غور کرنا چاہیے کہ اس میں عدل کو پیش نظر رکھا گیا ہے جیسا کہ اسی آیت کریمہ میں آگے چل کر فرمایا: ''لا تَظلمون ولا تُظلمون'' نہ تم ظلم کرو اور نہ تمہارے اوپر ظلم کیا جائے، اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ جو لا تَظلمون ہے، اس کا مطلب ہے کہ اخذ ربوا کے سلسلہ میں کہ ربوا نہ لیا جائے، اضافہ نہ لیا جائے، لیکن جو دوسرا ہے اس کا مقصد ہے ولا تُظلمون گویا کہ اس کے اوپر ظلم نہ کیا جائے تو اس کا مقصد یہ بھی ہے کہ جتنا اس نے لیا اتنا کم از کم واپس بھی ہونا چاہئے، اس کے پیش نظر اگر ہم دیکھیں اس پر غور کریں تو سمجھ میں آتا ہے کہ آج کل کی جو کرنسی ہے اس کو سونے کے ساتھ ہی مربوط کرنے میں عافیت ہے، سارے لوگوں کا مفاد اس میں ہوگا، اور اس میں جو شبہ ربوا کی بات کہی جارہی ہے تو اس کا موازنہ کم از کم جو صراحت کے ساتھ و لا تُظلمون ہے اس پر ہمیں غور وفکر کرنا چاہئے، اس کے ذریعہ جو بینک ہمیں قرض وغیرہ دے رہے ہیں اس میں بھی آسانی ہوگی، خاص طور سے جو طویل المیعاد قرض دیئے جاتے ہیں اس میں تفاوت فاحش ہوجاتا ہے اور اس کے ذریعہ سے گویا قرض دین دینے والوں کا جو مقصد ہے وہ فوت ہوجائے گا یا وہ کبھی ہمت نہیں کرے گا، اور مفتی نظام الدین صاحب کا فتوی بھی جیسا کہ مقالات کے اندر آیا ہے تو وہ بھی گویا اس بات کے قائل ہیں، اگر اتنا تفاوت ہوجاتا ہے، تو اس میں اس وقت کا اعتبار کیا جائے گا جس وقت میں اس نے قرض لیا ہے تو اس وقت میں جتنا سونا ملتا تھا اتنے سونے کے بقدر قیمت دلائی جائے گی۔ واللہ اعلم، جزاکم اللہ

مولانا مفتی جمیل احمد نذیری صاحب (اعظم گڈھ):

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ ابھی جو بحث چل رہی ہے موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت کے بارے میں، اس کے بارے میں مجھے یاد آ رہا ہے کہ جب دوسرا فقہی سمینار ہوا تھا تو اس میں بہت سے بینکنگ کے، معاشیات کے، اقتصادیات کے ماہرین شریک ہوئے تھے اور انھوں نے بھی ایک بات بتائی تھی، مثلاً یہ کہا جاتا ہے کہ موجودہ کرنسی کی قیمت اور مالیت سونے کے ذریعہ متعین کی جاتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اب یہ ثمن عرفی، اصطلاحی نہیں رہے بلکہ ثمن خلقی کا درجہ حاصل کر چکے ہیں، چنانچہ ان لوگوں نے کہا تھا کہ اگر آپ ریزرو بینک میں جائیں سو کا نوٹ لے کر اور ان سے یہ کہیں کہ اس کا ہم کو سونا دیدیجئے تو سونا ہرگز نہیں دیں گے، بلکہ دوسرا سو کا نوٹ دیدیں گے اور پھر دوبارہ آپ جائیں تو پھر وہ کوئی اور نوٹ دیدیں گے، سونا کبھی نہیں دے سکتے وہ، ہمیشہ نوٹ ہی دیتے رہیں گے، اور اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ کسی آدمی کے پاس پندرہ سال پرانا سو کا نوٹ ہے جب کہ ریزرو بینک کا گورنر کوئی اور تھا اور آج ریزرو بینک کا گورنر کوئی اور ہو چکا ہے تو اگر پندرہ سال پرانا نوٹ آج اگر بینک میں آپ لے کر جائیں گے تو بینک مالیت کے اعتبار سے نہیں بدلے گا بلکہ وہ اس پندرہ سال پرانے والے سو کے نوٹ کے بدلے دوسرا سو کا نوٹ دیدیگا، مالیت سے اس کو بالکل نہیں جوڑ سکتا، لہذا اس کو ثمن خلقی کا درجہ ایک طرح سے حاصل ہو چکا ہے، اس لیے ثمن خلقی کے اعتبار ہی سے اس کا فیصلہ ہونا چاہئے، یعنی سو کا نوٹ اگر پہلے واجب تھا پندرہ سال پہلے تو آج بھی وہ سو کا نوٹ ہی دیا جائے گا، مالیت کا اس میں کوئی اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ جزاکم اللہ

مولانا محمد عارف باللہ قاسمی (حیدرآباد):

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ موجودہ دور میں جو کرنسیاں چل رہی ہیں، ان کو بینکوں کے

قوانین سے اور جو ملکی قوانین ہیں ان سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا اور ملکی قوانین اور بینکوں کے جو نظام ہیں اس کے جو قوانین ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کرنسیاں اس کا تعلق سونے سے باقی نہیں رہا جیسا کہ مولانا نے کہا تھا کہ ویتنام کی جنگ کے بعد امریکہ نے صاف اعلان کردیا کہ میں اس کے بدلہ میں سونا نہیں دوں گا، ابھی ابھی بات آئی کہ کوئی بینک اگر ہم ایک ہزار روپے لیکر جاتے ہیں کہ اس کے بدلہ سونے دیدو تو نہیں دیتا، اس کے علاوہ ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آج کل دنیا میں شیئر بازار میں جس طرح سے عام کمپنیوں کے شیئرز بکتے ہیں، اسی طرح سے سونے چاندی اور تمام جو بھی چیزیں ہیں ان کی بھی خرید فروخت ہوتی ہے حتی کہ کرنسیوں کی بھی خرید فروخت ہوتی ہے، بہت سی مرتبہ آپ دیکھیں گے کہ سونے اور چاندی کی قیمت میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں ہورہی ہے لیکن کسی ملک کے اندرونی حالات کی وجہ سے، جیسے کہ اس ملک میں انتخاب جاری ہے یا کوئی ایسی حکومت بن رہی ہے جو حکومت اتنی مستحکم نہیں ہے، اس ملک کے اندرونی حالات کی وجہ سے سونے چاندی میں تبدیلی کے بغیر، اس ملک کی کرنسی کی قیمت گھٹ جاتی ہے جیسے کہ جن دنوں یہاں الیکشن چل رہا تھا ان دنوں انڈین کرنسی کی قیمت کم تھی، حالانکہ عالمی سطح پر دیکھا جائے تو سونے چاندی کی قیمت میں کوئی تبدیلی نہیں تھی الا یہ کہ جزوی تبدیلی پچاس روپے کی، سو روپے کی ہو، جب کہ کرنسی میں کافی اتار چڑھاؤ ہورہا تھا سونے اور چاندی کی قیمتوں میں اتار چڑھاؤ کے بغیر۔ کرنسیوں کی قیمت میں جو اتار چڑھاؤ ہوتا ہے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ موجودہ جو دنیاوی نظام ہے اس میں کرنسیاں سونے سے جڑی ہوئی نہیں ہیں اس لیے ہمیں اس کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ جزاکم اللہ

مولانا محمد جعفر ملی رحمانی (اکل کوا):

بسم اللہ الرحمن الرحیم! مہر اور دیون مؤجلہ کے سلسلہ میں احقر کی ناقص رائے یہ ہے کہ مہر اور دیون مؤجلہ کو سونے چاندی اور روپے دونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ ہی مقرر کیا جانا

چاہئے؛ کیوں کہ اگر سونے کو روپیوں کے ساتھ مربوط کرتے ہیں یا روپے کو سونے کے ساتھ مربوط کرتے ہیں تو سونے کی قیمت یا روپے کی مالیت، کمی بیشی کی وجہ سے بوقت ادائیگی کمی بیشی ہوگی، جس کی وجہ سے ربوا کا دروازہ کھل سکتا ہے، جب کہ سد ذرائع کے طور پر ہمارے فقہائے کرام یہ فرماتے ہیں: ''إن الذريعة والوسيلة تكون محرمة إذا كان المقصد محرماً، وتكون واجبة إذا كان المقصد واجباً'' بہرحال یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ دونوں میں سے کسی ایک ہی کو مقرر کیا جانا چاہئے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب:

اگر آپ دونوں میں سے کسی ایک سے ہی متعین کریں گے تو شبہ ربوا کا امکان تو اس میں بھی ہے؛ اس لیے کہ ان دونوں دھاتوں کی قیمت میں فرق واقع ہوتا رہتا ہے، البتہ یہ ہے کہ سونے کی قیمت زیادہ مستحکم ہوتی ہے اور عالمی سطح پر اس کی قیمت متعین ہوتی ہے، لیکن ٹھیک ہے......۔

مولانا محمد جعفر ملی رحمانی:

صرف روپے کو اگر ہم مقرر کرتے ہیں مہر میں اور ادائیگی کے وقت پھر ہم روپے ہی کو لازم قرار دیتے ہیں تو پھر سود کے پیدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی:

روپے کو؟ اور آپ نے کہا سونا یا چاندی سے مربوط کرنے کو تو۔

مولانا جعفر ملی رحمانی:

دونوں میں سے کسی ایک ہی کے ساتھ مقرر کرنا چاہئے دیون مؤجلہ کو یا تو آپ مہر میں

روپے ہی کو مقرر کیجئے اور بوقت ادائیگی اسی کو لازم قرار دیجئے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی:

یعنی آپ کا منشا یہ ہے کہ سونے یا چاندی ہی سے مہر مقرر کیا جائے۔

مولانا جعفر ملی رحمانی:

جی! سونے یا چاندی ہی سے مقرر کیجئے یا روپے ہی سے مقرر کیجئے اور بوقت ادائیگی دونوں میں سے ایک سے ادائیگی ہو۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی:

وہ تو متفق علیہ بات ہے اور اکیڈمی کے تیسرے فقہی سمینار جو حضرت مولانا مفتی اشرف علی صاحب کے یہاں منعقد ہوا تھا تو اس میں باضابطہ ایک تجویز ہے اور گزارش کی گئی ہے کہ مہر کو سونے یا چاندی ہی سے طے کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ اس میں عورتوں کا نقصان نہ ہو، جو آپ فرمارہے ہیں اس کے مطابق ہی ہے وہ تجویز- اب مشکل یہ ہے کہ جن لوگوں کا مہر مقرر ہو گیا ہے ان کا مسئلہ کس طرح حل ہوگا؟

مفتی عبدالباسط قاسمی صاحب (ممبئی):

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، اس سلسلہ میں یہ بات ذہن نشین رہے کہ کرنسی جو ہے وثیقۂ ثمن نہیں، بلکہ خود ثمن ہے، جہاں تک فتاوی کے اختلاف کا تعلق ہے تو وہ فتاوی مختلف زمانے میں دیئے گئے، جب تک یہ بات واضح ہو کر نہیں آئی تھی کہ اس کے پیچھے سونا ہے یا نہیں، اس وقت فتاوے میں اختلاف رہا، جب یہ بات مکمل طور پر واضح ہوگئی کہ اس کے پیچھے سونا چاندی نہیں ہے، چوں کہ ۱۹۷۳ء میں امریکہ نے یہ اعلان کیا تھا، لیکن اعلان ہونے کے فوراً بعد

مفتیان کرام اور علماء کرام تک یہ بات نہیں پہنچی تھی، اس لیے اس زمانے میں فتاوے میں اختلاف رہا، لیکن بعد کے جتنے فتاوے ہیں جب یہ بات منقح اور واضح ہوگئی اور اس کو ثمن قرار دے دیا گیا اس لیے یہ ثمن اصطلاحی ہے۔دوسری بات یہ عرض کرنی ہے کہ دیون مؤجلہ اور مہر وغیرہ کے اندر چوں کہ ثمن اصطلاحی کے اندر بہت زیادہ تفاوت ہوتا ہے یہ مثال شہروں میں بہت آسانی سے سمجھ میں آتی ہے، مثال کے طور پر کسی نے کسی بلڈنگ میں کوئی مکان بک کرایا، آج کی تاریخ میں وہ ہزار روپے اسکوائرفٹ سے بک کراتا ہے اور بلڈر ایک سال کا وقت لیتا ہے کہ میں دے دوں گا، لیکن قانونی پیچیدگیاں اور مسائل بڑھتے بڑھتے پانچ سال ہو گئے اور وہ فلیٹ نہیں دے سکتا، اب اسی جگہ پر اسی مقام پر اس بلنگ کی قیمت جو ہے سات ہزار، آٹھ ہزار، دس ہزار روپے ہو جاتی ہے اسکوائرفٹ۔تو ایسی صورت کے اندر بڑی دشواریاں پیش آتی ہیں اور بہت سے مسائل ایسے الجھے ہوئے ہیں، اس لیے دیون مؤجلہ یا طویل مدتی جتنے معاملات ہیں اس کے اندر سونے یا چاندی کسی ایک کو معیار بنایا جائے اور معیار بنانے میں اس بات کو ملحوظ رکھے کہ اسکے پس پشت کرنسی کا ذکر نہ ہو، اس لیے کہ اگر کرنسی کا ذکر کردیا جائے گا پھر تفاوت پیدا ہوگا ادائیگی کے وقت میں، جس سے ربوا یا شبہ ربوا پیدا ہوجائے گا، اور رہی یہ بات کہ اگر سونے یا چاندی کی شکل میں دیون مؤجلہ، قرض، مہر وغیرہ کی تعیین کی جائے تو یہ بات ذہن میں رہے کہ عہد نبوی کے اندر بھی دراہم اور دینار جو سونے کے سکے تھے، ثمن خلقی تھے، ان ہی کے ذریعہ سے قرض اور دیون کے معاملات طے ہوتے تھے، یہ غور کرلیا جائے کہ اس زمانے میں اس کی کیا نوعیت تھی، کیا شکل تھی کہ کس بنیاد پر وہاں پر قرض کے معاملات طے ہوتے تھے، اسی طرح سے آج بھی یہ طے کیا جا سکتا ہے کہ طویل مدتی دیون کے اندر سونے کو مکمل طور پر تعین کرلیا جائے، اسی طرح کرنسی کے تعلق سے یہ ہے کہ اس کو کسی سے مربوط کرنا ہے، جہاں تک اشاریہ بندی سے کرنسی کو مربوط کرنے کی بات آئی ہے یہ بالکل خلاف عقل ہے؛ اس لیے کہ اشاریہ بندی کے جہاں تک معاملات ہیں اشیاء کی

قیمتیں طلب ورسد کے اوپر موقوف ہیں اور طلب ورسد حالات اور زمانے کے اعتبار سے گھٹتی بڑھتی رہتی ہے، جب اشیاء کی طلب ورسد کم زیادہ ہوگی اسی اعتبار سے قیمتوں میں کرنسی کے تفاوت ہوگا، یہ تفاوت جو ہے ہوتا ہی رہے گا، اس لیے اشاریہ بندی کے ساتھ اس کو مربوط نہیں کیا جاسکتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب:

جہاں تک وثیقہ ثمن والے فتوی کی بات ہے تو ہمارے بعض وہ بزرگ جو ماضی قریب کے تھے جیسے میرے استاذ گرامی حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب اعظمیؒ تو ان کا بھی فتوی اس سلسلہ میں موجود ہے صرف قدیم بزرگوں ہی کا نہیں ہے، اور جہاں تک یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں درہم ودینار کے ذریعہ دیون طے ہوتے تھے اور ادا کیے جاتے تھے، وہ تو کوئی مسئلہ نہیں ہے، آج بھی اگر سونے اور چاندی کے سکے ڈھلنے لگے تو یہ مسئلہ پیدا نہیں ہوگا، یہ ساری زیادتی جو یہودی اور نصرانی نظام کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے بغیر کسی بنیاد کے نوٹ چھاپنے شروع کردیئے ہیں جو بین الاقوامی قانون شروع میں بنا تھا کرنسی کے سلسلہ میں۔ علی الاعلان اس کی مخالفت کرتے ہوئے امریکہ اور یورپ نوٹ چھاپتا جارہا ہے تو آج دنیا میں جو بہت سی ناانصافیاں ہیں اس کی ایک بنیاد یہ بھی ہے، اور سود کے مروج ہونے اور اس کے تقویت پانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ہم اور آپ اس موقف میں ہیں نہیں کہ اس صورت حال کو بدلیں تو اس پس منظر میں ہم کو اس مسئلہ پر غور کرنا ہے۔ آپ کی رائے اور اظہار خیال بہت اچھا ہے، یہ ایک قابل وضاحت بات تھی اس لیے میں نے عرض کردیا۔

مولانا محمد ظفر عالم ندوی صاحب (لکھنؤ):

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ قرض کے سلسلہ میں جو یہ بات آرہی ہے کہ اس کو سونا سے

مربوط کیا جائے یا نہیں، تو ظاہر بات ہے کہ قرض ایک تبرع ہے، قرض دینے والا کسی کا تعاون کرنا چاہ رہا ہے، وہ ایک مالی تبادلہ نہیں چاہ رہا ہے، ایسی صورت میں اگر سونے سے مربوط کر دیا جائے اور کچھ مدتوں کے بعد ادا کرنے میں شبہ ربوا جو پیدا ہوگا، تو ربوا کے سلسلہ میں کتاب وسنت میں جس قدر شناعت آئی ہے اس کو دیکھتے ہوئے احتیاط کا پہلو تو یہی ہے کہ اس کو سونے یا کسی اور دھات سے مربوط نہ کیا جائے، البتہ تاخیر ہونے کی صورت میں جس نے قرض دیا ہے اس کو نقصان ہو رہا ہے تو اس نقصان کی تلافی کی شکل نکالی جائے۔ نقصان کی تلافی کی ایک شکل تو وہ ہے کہ خود قرض لینے والا اپنی دیانت پر احسان کا معاملہ کرے، زائد رقم دیدے جیسا کہ روایتوں میں اس کی مثالیں ملتی ہیں، اسی کی کوئی ایسی شرعی شکل نکالی جائے کہ جو وہ دیانۃً ادا کرے، احساناً ادا کرے، اخلاقاً ادا کرے، کوئی ایسی شکل نکل جائے کہ ان کو ادا کرنا پڑے، اس کی طرف ہم لوگ توجہ کریں تو زیادہ بہتر ہوگا، تاکہ شبہ ربوا سے بچیں اور خسارہ بھی نہ ہو سکے، ان کی تلافی کی کوئی گنجائش نکالی جائے، بس اتنی بات میں عرض کرنا چاہ رہا تھا۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی:

یہ ایک اہم بات کہی ہے مولانا ظفر عالم صاحب نے ابھی ابھی، ہمارے جو مالیاتی ادارے ہیں اور ہمارے مولانا تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم جو اس میں شامل ہیں تو انھوں نے بین بین حل نکالا ہے، آپ لوگوں میں سے اکثر کے علم میں ہوگا، ہوسکتا ہے بعض حضرات کے علم میں نہ ہو اس لیے عرض کرتا ہوں، وہ ہے التزام، یعنی فقہاء مالکیہ کے یہاں اگر کسی چیز کا آدمی اپنے اوپر التزام کرلے تو دیانۃً تو تمام فقہاء کے نزدیک اس کا ایفاء واجب ہوتا ہے، لیکن مالکیہ کے یہاں اگر التزام کی وجہ سے قضاءً بھی اس کا ایفاء واجب ہوتا ہے تو ابھی جو اسلامی بینکوں نے اس میں جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ اگر وقت مقررہ پر قرض ادا نہیں کر سکیں گے، تو مستقرض سے لکھایا جائے کہ وہ بینک کے تھرو اتنی رقم صدقہ کرنے کا گویا عہد کرتا ہے اپنے اوپر لازم کرتا

ہے، اور یہ جو صدقہ والی رقم ہے یہ بینک کے استعمال میں نہیں جاتی ہے۔ جو شریعۃ بورڈ ہے براہ راست اس کے کنٹرول میں جاتی ہے اور وہ اس رقم کو گویا خرچ کرتے ہیں تو اس سے مقرض کا تو فائدہ نہیں ہوتا ہے، اس کا مسئلہ تو حل نہیں ہوتا ہے، لیکن اتنا فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ مستقرض کو تنبیہ ہوتی ہے اور خواہ مخواہ دین کی ادائیگی میں جو مماطلت ہوتی ہے، ٹال مٹول ہوتا ہے اس کو اس طرح حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مولانا مفتی محمد زید مظاہری ندوی صاحب (لکھنؤ):

جب فقہاء کرام نے واضح طور پر ثمن کی دو قسمیں فرمادی ہیں: ثمن خلقی اور ثمن عرفی اور جملہ احکام میں ثمن عرفی کو ثمن خلقی ہی کا درجہ دیا ہے تو ثمن عرفی کا اگر قرض دیا جائے اور پانچ سال بعد کو اس کی قوت خرید کم ہو جائے اور اس میں مقرض کا بظاہر نقصان بھی ہوتا ہو لیکن تب بھی اس میں کمی بیشی کا قطعاً اعتبار نہ ہوگا، کیوں کہ اس صورت میں اس کے اجر وثواب میں بھی اضافہ ہوگا لیکن کمیت کا اعتبار نہ ہوگا؛ کیوں کہ ثمن عرفی کو ثمن خلقی ہی کا درجہ دیدیا گیا، البتہ اگر قرض لیتے دیتے وقت یا دوسرے معاملات میں اگر ثمن عرفی کو نقدین سے مربوط کردیا جائے تو پھر اس کا اعتبار کیا جائے گا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے رسائل ابن عابدین میں اس کی صراحت فرمائی ہے اس لیے اگر ثمن عرفی ہی کا قرض لیا دیا جائے، مہر مقرر کیا جائے تو کمیت میں چاہے جتنا فرق ہو جائے اس کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، اور رہ گیا مقرض کا نقصان تو اس کے بدلہ میں اس کو ثواب ملے گا، ثواب میں اضافہ ہوگا، البتہ اگر اس کو مربوط کردیا جائے تو اس کی گنجائش فقہاء کے کلام میں ملتی ہے۔ جزاکم اللہ

مولانا محمد ابوبکر قاسمی (دربھنگہ):

قرض کی ادائیگی میں ٹال مٹول کرنے اور تاخیر کی صورت میں فقہاء مالکیہ کے نظریہ

کے مطابق ابھی مسئلہ التزام کا جوحضرت مولانا خالد صاحب نے ذکر کیا ہے مولانا محمد تقی صاحب نے فقہی مقالات میں اس کو تفصیل سے لکھا ہے، یہ سوالنامہ چوں کہ میرے پاس پہنچا نہیں تھا اس لیے میں نے کوئی مقالہ تو نہیں لکھا ہے لیکن میں اس سے متفق ہوں، مولانا تقی صاحب کی تحریر اور مولانا خالد صاحب نے جو ابھی کہا ہے اس کی روشنی میں اس کا حل دین کے مسئلہ میں تلاش کیا جائے تو انشاء اللہ یہ جو ٹال مٹول کرتے ہیں اور بعض لوگ قرض لے کر کے یہ سمجھتے ہی نہیں کہ وقت پر ادا کرنا چاہیے اور کچھ گڑبڑی کرتے ہیں اس سے باز آئیں گے۔ غیر مسلموں کے یہاں تو مسئلہ آسان ہے کہ اگر کسی نے قرض کی ادائیگی یا کوئی کاروبار، یہ ایک مدت متعین کر کے کوئی قرض لیا، کوئی سامان لیا، اب جیسے کوئی کاروبار کیا اور کہا کہ ایک مہینے میں ہم قیمت دیدیں گے، لیکن ایک مہینہ میں قیمت نہیں دیتا ہے تو ان کے یہاں ہے کہ شرح سود ایک متعین کر دیتے ہیں کہ اگر تم نے ایک مہینہ میں ادائیگی نہیں کیا دین کی، تو تم کو اتنی رقم دینی ہوگی تو وہ لوگ تو ذاتی نفع میں استعمال کرتے ہیں، لیکن ہمارے یہاں، عام طور سے کاروباریوں کے یہاں اس طرح کی کوئی بات نہیں ہے، ہوتا کیا ہے کہ لیا دو مہینے یا ایک مہینہ کی مدت کے لیے، سال سال ہو جاتا ہے ادا نہیں کرتے۔ یا ابھی شہر کا جو مسئلہ ذکر کیا کہ بلڈر سب ایک مکان کی قیمت ہے ایک ہزار روپے اور کہتے ہیں کہ ایک سال میں بنا کر کے دیدوں گا، لیکن تین تین سال چار چار سال ہو جاتا ہے اور وہ دیتے نہیں اور جب ان سے کہا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ میں بنا نہیں سکا، ایسا کیجئے کہ پیسہ لے لیجئے، تو اس میں ہونا یہ چاہیے کہ بیع سلم کے اندر جو مبیع متعین ہے وہ متعین مبیع دے اور اگر اس نے نہیں دیا تو اس وقت کی جو قیمت ہوگی، اس کی قیمت دے، اس لیے کہ ہم نے صرف خالص دین نہیں دیا ہے بلکہ معاملہ طے ہو گیا ہے کہ اس دین کے بدلہ میں ہم کو مبیع دینا ہے اور بلڈر نے مبیع نہیں دیا تو وہ اتنی قیمت دے تاکہ اس قیمت کے ذریعہ سے دوسرا سامان خرید سکے، اگر یہ کیا جائے کہ جو قیمت طے ہے مبیع کی اور جس وقت ادائیگی کرے گا، ادائیگی کے دن کی جو قیمت ہوگی، اس دن

کی قیمت کے اعتبار سے اگر طے کیا جائے تو یہ بیع سلم میں مناسب ہے، اور بیع سلم کے علاوہ جو عام دیون ہیں ان میں مسئلہ التزام پر عمل کیا جائے، میری یہ رائے ہے اللہ تعالیٰ عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی:

بیع سلم کے مسئلہ پر بھی بحث کی ہے ماہرین شریعت نے، مسئلہ یہ ہے کہ جب اس وقت قیمت ادا کر دی جائے کہ جب وقت آئے گا تو بیع الدین ہو جائے گا تو ثمن تو آپ کو نقد ادا کرنا ہے اس میں۔

مولانا مفتی جنید عالم ندوی قاسمی صاحب (پٹنہ):

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ تین مسئلے زیر بحث ہیں، پہلا مسئلہ ہے مہر کی ادائیگی، اس سلسلہ میں جیسا کہ بات سامنے آئی کہ تیسرے فقہی سمینار میں یہ طے پایا تھا کہ کوشش یہ کی جائے کہ مہر سونے یا چاندی میں متعین ہو، میرے خیال سے اس پر محنت ہو، کوشش ہو، کوشش جاری رہے انشاء اللہ کامیابی ملے گی۔ اگر رائج سکے میں مہر متعین ہے تو ربوا، شبہ ربوا اس سب کی بحث آچکی ہے سامنے، تفصیلات آ گئی ہیں، ان کے علاوہ ایک بات اور ہے کہ بہت ساری جگہوں میں یہ فارم نہیں بھرا جاتا ہے نکاح کا۔ جیسے دیہات میں، تو جہاں پر فارم نہیں بھرا جاتا ہے ان لوگوں کو معلوم بھی نہیں ہوتا ہے کہ کب میرا نکاح ہوا تھا، اس وقت کرنسی کی کیا مالیت تھی اور اب کیا مالیت ہے، اس کے حساب لگانے میں بھی پریشانی ہوگی، اس لیے میری رائے یہ ہے کہ جیسا پہلے سے چلا آرہا ہے کہ جو سکے متعین تھے جتنے مہر متعین تھے پانچ ہزار دس ہزار وہی ادا کیے جائیں گے، اس میں مالیت کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ دوسرا مسئلہ تنخواہ اور پنشن کا ہے، اس میں تنخواہ پانے والے جو ملازم ہوتے ہیں وہ دو طرح کے ہوتے ہیں: ایک سرکاری ملازم، ایک غیر سرکاری ملازم۔ اگر

سرکاری ملازم ہیں تو ان کو تنخواہ سرکار دیتی ہے، ہم کچھ بھی طے کریں گے، سرکار اپنے مطابق جو اس کا طے شدہ اصول ہے اس کے مطابق تنخواہ ملے گی۔ اب رہا غیر سرکاری جو ملازم ہیں تو ایسی صورت میں ربوا اور شبہ ربوا وغیرہ کا مسئلہ تو ہے ہی، اس کے علاوہ ایک نقصان یہ ہے کہ بہت سارے مدرسوں میں تین ماہ چار ماہ دس ماہ بلکہ بورڈ کے مدرسوں میں تو اور زیادہ ہے، چھ ماہ کے بعد تنخواہ دے رہے ہیں، تو مہتمم صاحب یا ناظم صاحب میں اور ان کے ماتحت جو عملہ ہے ان میں جھگڑا ہو جائے گا، دونوں کیلکولیٹر لیکر بیٹھیں گے کہ یہ اس کی مالیت تھی اور اب مالیت یہ ہے، یہ بہت بڑا نقصان ہوگا، مہتمم صاحب میں اور جو ملازمین ہیں ان میں جھگڑے کی شکل پیدا ہوگی۔ تیسرا مسئلہ قرض کی ادائیگی کا ہے۔ قرض کی ادائیگی کے سلسلہ میں میری رائے یہ ہے کہ اگر قرض دیتے وقت یہ طے کرلیا کہ سولہ ہزار یا پندرہ ہزار روپئے میں آپ کو دے رہا ہوں، جب آپ اس کو ادا کریں گے تو اس کی قیمت آج ایک تولہ سونا ہے۔ یعنی پندرہ ہزار میں ایک تولہ سونا ملتا ہے جس وقت آپ ادا کریں گے اس وقت ایک تولہ سونا ادا کریں گے یا اس وقت ایک تولہ سونا کی جو قیمت ہوگی، چاہے پندرہ ہزار ہو، سولہ ہزار ہو، بیس ہزار ہو یا دس ہزار ہو وہ قیمت آپ کو ادا کرنا پڑے گی۔ تو اگر اس طریقے سے باقاعدہ طے کرلیتا ہے تو اس کی گنجائش ہے، اور اگر اس طرح طے نہیں کیا بلکہ قرض میں جو پیسہ دینا تھا دس ہزار بیس ہزار وہ دیدیا اور مزید کوئی بات طے نہیں پائی۔ میرے خیال میں پھر جتنا دیا ہے اتنا ہی لیں گے اس سے زیادہ لینا جائز نہیں ہوگا، ربوا اور شبہ ربوا کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ذہن میں رہے، سداً للذرائع کی بھی بات آگئی ہے آپ کے سامنے۔

تیسری بات یہ ہے کہ قرض جو دیتا ہے اس کے سامنے انسانی ہمدردی اور ثواب بھی ہے، قرض دینے والا جس وقت قرض دیتا ہے اس وقت سمجھتا ہے کہ چھ ماہ کے بعد قرض کی ادائیگی ہوگی، اس کی مالیت گھٹ جائے گی، قوت خرید گھٹ جائے گی پھر بھی وہ قرض دیتا ہے اس بنیاد پر

اس کو ثواب ملے گا، اس لیے رائج سکے میں اگر طے نہیں کیا ہے تو جتنا دیا ہے اتنی ہی کی واپسی ہوگی۔جزاکم اللہ۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی:

صرف میں آپ حضرات کی اطلاع کے لیے عرض کرتا ہوں کہ یہ جو شکل ہے کہ مثلاً اس نے آج پندرہ ہزار روپے دیئے اور اس کو ایک تولہ سونا سے مربوط کردیا کہ جب ہم آپ سے پیسہ وصول کریں گے تو ایک تولہ سونا وصول کریں گے یا اس کی قیمت۔تو اصل میں شبہ ربوا تو اس صورت میں بھی پیدا ہوجاتا ہے، معاییر شرعیہ جو ہیں جو المجلس الأعلیٰ للمؤسسات والبنوک المالیۃ کی جو تجاویز ہیں تو اس میں اس صورت کو بھی جائز نہیں کیا ہے اس بنیاد پر، شبہ سود کی بنیاد پر، صرف آپ حضرات کی اطلاع کے لیے میں نے عرض کردیا۔

میرے پاس ایک سوال آیا ہے، اس کے بعد ہم جناب صدر سے انشاء اللہ مستفید ہوں گے۔سوال یہ کیا گیا ہے کہ آج کل کرنسی کے پیچھے نہ سونا نہ چاندی تو کرنسی کا معیار کیا ہے؟ اور کس بنیاد پر ہر ملک کی کرنسی کی تعیین ہوتی ہے، تو یہ تو سوال کسی ماہر معاشیات سے کیا جانا چاہیے لیکن جو لوگ بتاتے ہیں وہ یہ ہے کہ اس میں دو تین چیزیں ملحوظ رہتی ہیں، خاص کر آج کل ملکوں کی برآمدات کی اہمیت بہت ہوتی ہے، آپ کی برآمدات کیا ہیں، آپ کو زرمبادلہ کیا حاصل ہوا ہے اور کچھ سونے سے بھی اس کا ربط ہوتا ہے، آپ کے پاس سونے کا محفوظ ذخیرہ کیا ہے؟ تو یہ مختلف چیزیں ہیں جن سے یہ مربوط ہوتی ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ آج اگر کوئی شخص کسی کو سولہ ہزار قرض دیتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ میں تم کو ایک تولہ سونا دیتا ہوں (یہ وہی بات ہے جو ابھی مولانا جنید صاحب نے بیان کی) اس کے بارے میں جس کتاب کا میں نے حوالہ دیا ہے، معاییر شرعیہ، جس کو اسلامک بینکنگ اور اسلامی اقتصادیات کی بنیادی کتاب سمجھا جاتا ہے تو انھوں نے اس کو جائز قرار نہیں دیا ہے شبہ سود کی بنیاد پر۔

مولانا احمد نادر قاسمی صاحب:

یہ کرنسی کے انسولیشن کا جو مسئلہ ہے یعنی کرنسی کی جو حیثیت آج ہے وہ کل نہیں رہے گی، یہ ماہرین معاشیات کی تفصیلات کے مطابق بھی اور ریزرو بینک آف انڈیا کے ضابطہ کے مطابق بھی یہ ہے کہ ایسے ہی ہوتا ہے یعنی آج جتنی مالیت روپے کی ہے وہ کل اتنی نہیں رہتی ہے اس کو انسولیشن سے وہ لوگ تعبیر کرتے ہیں۔ انسولیشن کو سامنے رکھتے ہوئے آئندہ وصول کیے جانے والے قرض، یا بقایاجات، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے علماء بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں۔ جس طرح سے مہر کے باب میں علماء یہ کہتے ہیں کہ مہر اگر مؤجل ہوتو اسے سونا یا چاندی میں باندھا جانا چاہیے ہمیں اس پر غور کرنا چاہئے کہ آخر علماء نے اس کی اجازت کیوں دی ہے؟ ورنہ عام طور سے ماضی میں یہ ہوتا رہا ہے کہ سکۂ رائج الوقت، مہر، فلاں فلاں وغیرہ۔ لیکن اب یہ کہتے ہیں کہ مہر اگر مقرر ہو اور مؤجل ہوتو اس کو چاندی یا سونے سے مربوط کیا جائے اس کی کیا وجہ ہے۔ یہ ہم بہت سے دوستوں سے جن کا تعلق اسٹاک ایکسچینج سے، شیئر سے ہے اسی طرح سے وہ سونے کا ایکسپورٹ وغیرہ کا کام کرتے ہیں، انھوں نے یہ بتایا کہ جہاں سونے اور چاندی کی خرید فروخت ہوتی ہے تو ملک میں جو سونار ہیں اگر آپ ان کے پاس ادھار معاملہ کرتے ہیں وہ جتنا پیسہ لیتے ہیں اتنا پیسہ دینے پر وہ بات نہیں کرتے بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر آج آپ ایک لاکھ روپے مجھے دے رہے ہیں اور کل ہم آپ کو ادا کریں گے تو اس سے یہی معاملہ کرتے ہیں کہ اس وقت سونے کی جتنی قیمت ہے یعنی ایک لاکھ روپیہ کا جتنا سونا بن رہا ہے گویا ہم آپ سے ایک لاکھ کا سونا لے رہے ہیں اور ایک لاکھ کا سونا ہی اس وقت ہم آپ کو دیں گے۔ چاہے اس کی قیمت ایک لاکھ دس ہزار پہنچ جائے یا اس کی قیمت ایک لاکھ پندرہ ہزار پہنچ جائے اور کبھی کبھی اس کی کمی کو بھی گوارا کرتے ہیں۔ جیسا کہ حضرت مولانا محی الدین صاحب نے عرض کیا کہ کم ہو جائے تو کیا کیا جائے گا، وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم نے سونے اور چاندی میں تبادلہ نہیں کیا تو ہمارا

دیوالیہ ہی ہو جائے گا، اس لیے دیوالیہ ہو جائے گا کہ ریزرو بینک آف انڈیا کا قانون ہے کہ کرنسی میں انفلیشن ہوتا ہے یعنی جتنی قیمت آج کرنسی کی ہے، نوٹ کی، اتنی کل نہیں رہے گی اس لیے مجھے یہ سمجھ میں آتا ہے جیسا کہ مفتی جنید صاحب نے فرمایا اور علی گڑھ سے ہمارے دوست نے کہی، کہ قرض دیتے وقت یہ طے کرلیا جائے کہ میں آپ کو قرض دے رہا ہوں ایک لاکھ روپے، اس ایک لاکھ روپے کی جو قیمت ہے سونے میں گویا ہم نے اتنا سونا دیا آپ کو قرض۔ جب مجھے ادا کریں گے تو اتنا سونا ہی ادا کریں گے۔ چاہے یہ رسید جسے آپ کرنسی کہہ رہے ہیں اس کی گنتی میں چاہے ایک لاکھ دس ہزار ہو جائے یا پندرہ ہزار ہو جائے، ایسا مجھے سمجھ میں آتا ہے، یہی بہتر شکل معلوم ہوتی ہے انفلیشن کے پیش نظر۔

☆ ☆ ☆